قرآن و حدیث کی روشنی میں
فقہی احکام و مسائل
www/KitaboSunnat.com
جلد اول
فضیلۃ الشیخ صالح بن فوزان
مترجم / مولانا فاروق اصغر صارم
تخریج / مولانا حافظ اقبال صدیق مدنی
دار السلام

www.KitaboSunnat.com
قرآن و حدیث کی روشنی میں
فقہی احکام و مسائل
جلد اوّل

اشاعت اوّل: 2007

منتظمِ اعلیٰ: عبدالمالک مجاہد

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4043432-4033962 1 00966 فیکس: 4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.darussalam.com

* الریاض۔ العلیا۔ فون: 4614483 01 فیکس: 4644945 * الملز فون: 4735220 01 فیکس: 4735221 * سویلم فون: 2860422 01
* مندوب الریاض: موبائل: 0505196736-0503459695 * قصیم (بریدہ): فون/فیکس: 3696124 06 موبائل: 0503417156
* مکہ مکرمہ: موبائل: 0506640175-0502839948 * مدینہ منورہ فون: 8234446 04 فیکس: 8151121 موبائل: 0503417155
* جدّہ فون: 6879254 02 فیکس: 6336270 * الخبر فون: 8692900 03 فیکس: 8691551
* ینبع البحر فون/فیکس: 3908027 04 موبائل: 0500887341 * خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 07 موبائل: 0500710328

شارجہ فون: 5632623 6 00971 امریکہ * ہوسٹن فون: 7220419 713 001 * نیویارک فون: 6255925 718 001
لندن فون: 4885 539 208 0044 آسٹریلیا فون: 4040 9758 2 0061

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)

* 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور
فون: 7110081-7111023-7232400-7240024 42 0092 فیکس: 7354072
موبائل: 4212174 0321-8484569 0322 * غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703
Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com

کراچی طارق روڈ بالمقابل فری پورٹ شاپنگ مال فون: 4393936 21 0092 فیکس: 4393937
اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 2281513 51 0092 موبائل: 5370378 0321

ⓒ مكتبة دار السلام، ١٤٢٨ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
الفوزان، صالح بن فوزان
المخلص الفقهي (النص باللغة الاردية) - الرياض، ١٤٢٨ هـ
ص: ٤٠٠ مقاس: ١٤×٢١ سم
ردمك: ٦-٦-٩٩٨٤-٩٩٦٠-٩٧٨ (مجموعة)
٣-٧-٩٩٨٤-٩٩٦٠-٩٧٨ (ج ١)
١. الفقه الحنبلي أ. العنوان
ديوي ٢٨٥,٤ ١٤٢٨/٦٦٨١
رقم الإيداع: ١٤٢٨/٦٦٨١
ردمك: ٦-٦-٩٩٨٤-٩٩٦٠-٩٧٨ (ج ١)

جلد اوّل

تالیف

فضیلۃ الشیخ صالح بن فوزان حفظہ اللہ

مترجم

مولانا فاروق اصغر صارم رحمہ اللہ

تخریج

مولانا حافظ اقبال صدیق مدنی حفظہ اللہ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

مضامین

باب 1

طہارت کے احکام ومسائل

باب 2

نماز کے احکام و مسائل

باب 3

زکاۃ کے مسائل

باب 4

روزے کے مسائل

باب 5

حج کے مسائل

باب 6

جہاد کے احکام ومسائل

عرضِ ناشر

ہمارے خالق و مالک اللہ رب العزت نے یہ کائنات انسان کے لیے بنائی ہے۔ اور انسان کو اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ ہمارا عظمت مآب خالق خوب جانتا ہے کہ یہ دنیا انسان کو کن طریقوں سے فائدہ پہنچائے گی اور کن کرتوتوں کی وجہ سے شدید نقصانات سے دوچار کر دے گی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں قرآن کریم میں اوامر و نواہی کی صورت میں بتلا دی ہیں اور اپنے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ کے ذریعے سے سارے عالم پر ہمیشہ کے لیے روشن کر دی ہیں۔

اللہ رب العزت کے ارشادات اور رسالت مآب ﷺ کے اقوال و اعمال سب سے بڑی عالمگیر ابدی سچائی (Eternal truth) ہیں۔ یہ صداقتیں صبح قیامت تک اٹل مانی جائیں گی۔ عقل مند وہی ہے جو ان سچائیوں پر ایمان لے آئے، اللہ تعالیٰ کا پرستار اور رسول اللہ ﷺ کا پیروکار بن جائے۔ اس کے برعکس جو لوگ ان شگرف سچائیوں پر عمل نہیں کریں گے، وہ اس دنیا میں بھی خوار ہوں گے اور آخرت میں بھی جہنم کی غذا بن جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان تمام علمائے حق کو اپنی رحمتوں سے شاداب رکھے جنھوں نے قرآن و سنت کے احکام و ہدایات آسان زبان میں سمجھائے اور امت مسلمہ کے لیے راہِ ہدایت روشن کر دی۔ حجازِ مقدس کے عظیم سکالر اور معروف دینی رہنما فضیلۃ الشیخ صالح بن فوزان بن عبداللہ حفظہ اللہ ایسے ہی علمائے کرام میں سے ہیں۔ وہ دن کے اُجالے اور راتوں کے سناٹے میں قرآن کریم کے لمعات اور اسوۂ حسنہ کی تابانیوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ جوں جوں ان کے قدم علم و نظر کی راہوں پر آگے بڑھے، انھیں عام مسلمانوں کی غفلت، جہالت، بے ہمتی، بے طلبی، گمراہی اور نقالی بے قرار کرتی رہی۔ ایک جید عالم اور ایک دردمند مبلغ کی حیثیت سے انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ صحیح اسلامی زندگی کی تعلیمات عام کریں گے اور ملتِ اسلامیہ کو صراطِ مستقیم دکھائیں گے۔ یہی تڑپ تھی جو انھیں ریڈیو سٹیشن لے گئی۔ موصوف نے علم و آگہی سے بھرپور تقریریں کیں اور اسلامی زندگی کے اصول و مبادیات اتنے جامع پیرائے میں آشکارا کیے کہ سب کے کان انھی کے نشری لیکچروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ لیکچر علم و عرفان، صداقت، حقانیت، سلاست اور افادیت کے شہ پارے تھے۔ سامعین اور بعض مخلص احباب نے اصرار کیا کہ ان تقریروں کو تحریری شکل دے کر افادۂ عام کے لیے شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ لیکچر ''اَلْمُلَخَّصُ الْفِقْهِي'' کے عنوان سے کتابی صورت میں مرتب کر دیے گئے۔

اس کتاب میں زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں نہ صرف دین قیم کے تمام احکام و ہدایات کی روشنی آ گئی ہے

بلکہ ہمارے علوم عالیہ کا نہایت قیمتی اثاثہ بھی یکجا ہو گیا ہے۔ مجھے جلیل القدر مصنف کی معارف پروری کے علاوہ ان کے اخلاص، حُسن بیان، باریک بینی، جُزرسی اور جامعیت نے بڑا متاثر کیا۔ خیال آیا کہ بے شمار اُردو دانوں کے لیے اس عظیم کتاب کی حیثیت "ناقابل انتفاع خزانے" کی سی ہے، لہٰذا اردو میں ترجمانی کے ذریعے دینی سیرت سازی کے اس خزانے کو عام کیا جائے۔ زیر نظر کتاب اسی آرزومندی کا نتیجہ ہے۔ اسے فاضل دوست محترم مولانا فاروق اصغر صارم رحمہ اللہ نے آسان اور شگفتہ اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ کتاب مترجم کی حیات مستعار کی آخری بہترین علمی کاوشوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مرحوم کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین یارب العلمین!

یہ کتاب زندگی کے ہر مرحلے اور ہر موڑ کے لیے کتنی بوقلموں اور کیسی کیسی عظیم الشان تعلیمات کی تشریح کرتی ہے؟ آیئے اس چمن زارِ حقانیت کی سیر کیجیے:

- محترم مصنف نے خوش بختی کا پہلا سبق یہ سکھایا ہے کہ انسان کے لیے علم حاصل کرنا کتنا ضروری ہے۔ اور اسلام تحصیلِ علم کی اہمیت پر کتنا زور دیتا ہے۔ اس باب میں انھوں نے رہبر انسانیت سیدِ ولدِ آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کی تشریح کی ہے کہ اللہ رب العزت جس شخص سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اُسے دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے علمِ نافع کی ضرورت اظہر من الشّمس کر دی ہے۔
- دوسرے باب میں طہارت کے احکام و مسائل بیان کیے ہیں اور یہ حقیقت نمایاں کر دی ہے کہ ہر مسلمان کو ظاہری اور باطنی تطہیر کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ اسلام اور طہارت لازم وملزوم ہیں۔ جب تک ایک فرد طہارت و نظافت کے تقاضے پورے نہیں کرے گا، وہ مسلمان تو کجا ایک اچھا انسان بھی نہیں بن سکے گا۔ اس باب میں غسل، وضو اور تیمّم کے احکام جزئیات سمیت بتائے گئے ہیں۔ خواتین کے لیے حصول طہارت کے طریقے اور ایام خاص کی احتیاطی ہدایات وضاحت سے بیان کی گئی ہیں۔
- اگلے اوراق میں نماز کی زبردست اہمیت سمجھائی گئی ہے، نماز کے ارکان، واجبات، مستحبات اور تمام سنتیں بتائی گئی ہیں، باجماعت نماز کے عظیم الشان فضائل عیاں کیے گئے ہیں، ان اوقات کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ مساجد میں خواتین کی حاضری کے آداب سمجھائے گئے ہیں اور جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کے فضائل و برکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
- زکاۃ اسلام کا وہ عدیم النظیر رکن ہے جسے ٹھیک ٹھیک قرآن وسنت کے مطابق رُوبہ عمل لایا جائے تو مسلمانوں کے معاشرے میں کوئی فرد بنیادی ضرورتوں سے محروم یا محتاج نہیں رہ سکتا۔ زکاۃ کی فرضیت اور اہمیت، شرائطِ زکاۃ، مویشیوں کی زکاۃ، غلہ، پھل، شہد، معدنیات اور مدفون مال کی زکاۃ، نقد مال کی زکاۃ، سامانِ تجارت میں زکاۃ کا

طریق کار، صدقۂ فطر، ادائے زکاۃ کا طریقہ، اور زکاۃ کے مستحق اور غیر مستحق افراد جیسے عنوانات کے تحت اس موضوع کی بخوبی تصریح کی گئی ہے۔

- روزہ تقویٰ اور قربِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ مؤلف ﷾ نے روزے کے احکام و مسائل مطلوبہ تقاضوں کے مُطابق بیان کیے ہیں۔
- حج ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ یہ اتنی بڑی برگزیدگی والی یگانہ عبادت ہے جس کی کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہمارا جلالت مآب غفور رحیم پروردگار حج کرنے والے کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے اور حج کے صلے میں جنت مرحمت فرماتا ہے۔ یہ کس قدر زبردست، ولولہ انگیز، ایمان افروز اور رُوح پرور نظارہ ہوتا ہے کہ ہر نسل، ہر قبیلے اور ہر خطے کی طرح طرح کی بولیاں بولنے والے امیر وغریب، عربی وعجمی اور اسود واحمر، ننگے سر، ایک جیسے لباس میں لبیك اللّٰھم لبیك کہتے ہوئے اپنے ودود وکریم خالق و مالک کے گھر کا طواف کرتے ہیں۔ یہاں دنیاوی آلودگیوں کے سارے نقاب اُٹھ جاتے ہیں، تمام پردے چھلنی ہو جاتے ہیں، کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ یہاں حاضر ہونے والے صرف اُسی ذات واحد کا نظارۂ بخشش وکرم دیکھتے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں، جس کے قبضے میں سب کچھ ہے۔ اور جو تنِ تنہا سب کا حاجت روا ہے...... کیا دنیا کا کوئی مذہب ہر تعصب سے ماورا انسانی وحدت کے اتنے بڑے اور اس قدر دلکش مظاہرے کی کوئی مثال پیش کر سکتا ہے؟ فاضل مصنف نے حج کے سلسلے میں قرآن وسنت سے ماخوذ تمام مسائل اور اوامر ونواہی حُسن ترتیب سے یکجا کر دیے ہیں۔
- جہاد اسلام کے قالب میں رُوح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مسائل وفضائل کے بعد اس کتاب کی پہلی جلد ختم ہو جاتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں راست بازی مفقود ہو گئی ہے۔ کسی شعبے کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ خاص طور پر وراثت کے معاملات میں جو کھیلے ہوتے ہیں ان کی وجہ سے خاندانوں میں دشمنیاں پرورش پاتی ہیں اور تہلکے برپا ہوتے ہیں۔ اسی طرح خرید وفروخت اور لین دین کے سلسلے میں جو چالاکیاں اور سفاکیاں روا رکھی جاتی ہیں، ان کے نتیجے میں جھگڑے ہوتے ہیں اور نوبت خونریزی تک پہنچ جاتی ہے۔ فاضل مصنف نے ان دونوں موضوعات کی اہمیت و نزاکت ملحوظ رکھی ہے اور ان دونوں نوعیتوں کے مسائل پر اتنی تفصیل واطناب سے کام لیا ہے کہ یہ مباحث کم وبیش ڈھائی سو صفحات تک پھیل گئے ہیں۔ انھوں نے اِس سلسلے میں قرآن وسنت کی رُو سے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ پورے طور پر مسلّم اور مستند ہے جس سے ہر پیچیدگی کا حل اور ہر سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ دوسری جلد کا آغاز انھی موضوعات

سے ہوتا ہے۔ اس باب میں خرید وفروخت کے احکام ومسائل، شراکت کی نوعیتیں، مضاربت، مزارعت، آب پاشی، اجارہ، غیر آباد زمین آباد کرنے اور جائز ملکیتوں کے مسائل ومعاملات جیسے موضوعات کی تشریح کی گئی ہے۔ فی الجملہ اسلام جن قوانین، جن ضابطوں جس تہذیب، جس ثقافت، جس اسلوب زندگی اور جن اصول وآداب کی تعلیم دیتا ہے وہ سب بہ تمام وکمال اس کتاب میں جلوہ نما ہیں۔

اس کتاب کا سب سے بڑا فیضان یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے اللہ رب العزت کی ذاتِ عالی اور اس کے حکموں کی فضیلت پر ایمان محکم اور ناقابلِ تسخیر ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب ہر مسلمان مرد اور عورت کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسے التزام کے ساتھ زیرِ مطالعہ رکھیے اور اس کی تعلیمات کو رہبرِ زندگی بنایئے۔ جو شخص اس کتاب کی تعلیمات پر عمل کرے گا، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اعتقادات، عبادات، معاملات اور تزکیۂ نفس کے اعتبار سے اسلامی تہذیب کا کتنا شاندار نمونہ ہوگا۔

دار السلام کے شعبۂ فقہ ومتفرقات کے زیرِ اہتمام جلوہ گر ہونے والی اس کتاب میں مندرجہ احادیث نبوی ﷺ، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ ائمہ رحمہم اللہ کی مفصل اور مکمل تخریج اور ترجمے کی تصحیح وتنقیح کا حق ادارے کے فاضل رکن جناب حافظ اقبال صدیق مدنی اور قاری عبدالرشید حفظہما اللہ نے خوب ادا کیا ہے جس کی بدولت یہ کتاب ایک تحقیقی شہ پارہ بن گئی ہے۔ میں اس گرانمایہ کتاب کی معیاری پیش کش کے لیے عزیزِ مکرم حافظ عبدالعظیم اسد اور ان کے رفقائے کرام حافظ محمد ندیم، مولانا محمد عثمان منیب، مولانا تنویر احمد، زاہد سلیم چودھری اور محمد رمضان شاؔد کا شکر گزار ہوں۔ جزاھم اللہ خیرًا.

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

مدیر: دار السلام۔ الریاض، لاہور

ستمبر 2007ء

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّينَ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّينِ. وَبَعْدُ:

یہ کتاب علم فقہ کی ایک ایسی تلخیص ہے جو کتاب وسنت کے دلائل سے آراستہ ہے۔ اس میں مذکور مضامین میں نے ریڈیو کے ایک سلسلہ وار پروگرام میں پیش کیے تھے۔ جن حضرات نے انھیں سنا ان میں سے بعض مخلص دوستوں نے مجھے ان کی طباعت کا مشورہ دیا بلکہ اس پر اصرار کیا تاکہ تشنگان علم اس چشمۂ صافی سے اپنی علمی پیاس بجھا سکیں۔

ان مضامین کو تیار کرتے وقت میرا یہ ارادہ نہ تھا کہ میں ان کی طباعت واشاعت کا بھی اہتمام کروں گا لیکن دوستوں کی فرمائش اور ترغیب کی وجہ سے بالآخر اس کام کے لیے تیار ہو گیا، چنانچہ میں نے ان مضامین کی نظر ثانی کے بعد انھیں ایک نئی ترتیب دے کر طباعت کے لیے پیش کر دیا۔

اب یہ کتاب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں جو بات درست اور مفید ہو، وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عنایت ہے اور جو سہو وخطا نظر آئے، وہ میری طرف سے ہے جس پر میں اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار ہوں۔

میری یہ کتاب "حاشية الروض المُربع شرح زاد المستَقنِع" کا خلاصہ ہے، البتہ اس کے بعض مقامات پر میں نے مناسب توضیحات کا اضافہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں نافع علم اور عمل صالح کی توفیق دے۔ آمین!

وَصَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ

دین اسلام کا علم وفہم حاصل کرنے کی فضیلت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهِ وَصَحَابَتِهِ وَالتَّابِعِينَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّينِ. وَبَعْدُ:

دین اسلام کا علم وفہم حاصل کرنا افضل ترین اعمال میں سے ہے جو خیر و بھلائی کی علامت ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يُّرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا، يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ»

''اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ دین میں تفقہ سے ایسا نافع علم حاصل ہوتا ہے جو عمل صالح کے لیے ایک اچھی بنیاد بنتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔''[2]

اس آیت میں ''الھدٰی'' سے مراد نافع علم ہے۔ اور ''دین الحق'' سے مراد عمل صالح ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے علم میں اضافے کے لیے دعا کرتے رہیں جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۝﴾ ''(اے نبی) دعا کیجیے کہ اے میرے پروردگار! مجھے مزید علم عطا فرما۔''[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت علم کی فضیلت پر وضاحت سے دلالت کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو علم کے علاوہ کوئی اور چیز زیادہ سے زیادہ مانگنے کا حکم نہیں دیا۔ جن مجلسوں میں دین کا مفید علم سیکھا جاتا ہے، نبی ﷺ نے انھیں [رِيَاضُ الْجَنَّةِ] ''جنت کے باغیچے'' قرار دیا ہے۔[4]

---

① صحيح البخاري، العلم، باب من يرد الله به خيرًا يفقهه في الدين، حديث :71، و صحيح مسلم، الزكاة، باب النهي عن المسألة، حديث :1037. ② الصف 9:61. ③ طٰه 114:20. ④ جامع الترمذي، الدعوات، باب حديث في أسماء الله الحسنٰى مع ذكرها تمامًا، حديث :3510.

ایک اور مقام پر فرمایا:

«إِنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ» ”بے شک علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔“[1]

ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے ایسا طریقہ معلوم کرے جس سے وہ اپنا عمل درست طور پر ادا کر سکے تا کہ اس کا عمل صحیح اور نتیجہ خیز ثابت ہو...... بتائیے! ایسی اہم عبادت جس پر جہنم سے نجات اور جنت میں داخلے کا دارومدار ہو، اسے بغیر علم کے کس طرح صحیح طور پر ادا کیا جا سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علم وعمل کے اعتبار سے لوگوں کے تین گروہ ہیں:

- پہلا گروہ: ان افراد پر مشتمل ہے جو نافع علم (علم دین) اور عمل صالح دونوں سے سرفراز ہوئے۔ یہ وہ گروہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ ہستیوں، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ پر چلنے کی توفیق بخشی۔ ایسے خوش قسمت لوگ جنت میں بھی انھی ہستیوں کے ساتھ ہوں گے اور یہ رفاقت بہت خوب ہے۔
- دوسرا گروہ: ان افراد کا ہے جنھوں نے نفع مند علم سیکھا لیکن اس پر عمل نہ کیا۔ یہ لوگ یہود تھے جن پر اللہ تعالیٰ کا غیظ وغضب نازل ہوا۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے یہود کی روش اختیار کی۔
- تیسرا گروہ: اس میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے اعمال علم کے بغیر تھے۔ یہ لوگ نصاریٰ تھے جو راہ حق سے بھٹک کر گمراہ ہوئے۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی۔

سورۂ فاتحہ جو ہم نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں، میں اللہ تعالیٰ نے ان تینوں گروہوں کا یوں ذکر فرمایا ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

”ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دکھا۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا، جن پر تیرا غضب نہیں ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔“[2]

امام شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ میں ﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد وہ علماء ہیں جنھوں نے اپنے علم کے مطابق اعمال نہ کیے اور ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ سے مراد وہ علماء ہیں جنھوں نے بغیر علم کے اعمال کیے۔ پہلی صفت یہود کی ہے اور دوسری نصاریٰ کی ہے۔

اب افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ اکثر لوگ جب سورۂ فاتحہ کی یہ تفسیر پڑھتے اور سنتے ہیں کہ ﴿الْمَغْضُوْبِ

[1] مسند أحمد: 196/5، وسنن أبي داود، العلم، باب في فضل العلم، حديث: 3641، وجامع الترمذي، العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، حديث: 2682. [2] الفاتحة 1:6،7.

عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد یہود ہیں اور ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ سے مراد نصاریٰ ہیں تو جاہل لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ صرف یہود ہی تھے اور ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ صرف نصاریٰ ہی تھے، کوئی اور نہیں ہوسکتا، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا ہے کہ وہ راہ حق پر چلنے کی دعا کرتے رہیں اور بری صفات رکھنے والے کی راہ سے پناہ مانگتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان رحمت دیکھیے وہ کس طرح انسان کو تعلیم دے رہا اور اس پر فرض کر رہا ہے کہ وہ یہ دعا ہمیشہ اور بار بار کرتا رہے، حالانکہ اسے اللہ تعالیٰ سے کوئی خطرہ نہیں کہ وہ اسے ہدایت پر قائم نہیں رکھے گا اور یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کسی بدگمانی کی بنا پر یہ درخواست کر رہا ہے۔''

فرض اور نفل نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی فرضیت میں بہت سی حکمتیں پنہاں ہیں۔ ان اسرار ورموز میں ایک اہم چیز یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم علم نافع اور عمل صالح سے آراستہ و پیراستہ لوگوں کے نقش قدم پر چلیں جو دنیا و آخرت میں نجات کا راستہ ہے اور وہ ہمیں ہلاک و برباد ہونے والوں کے طور طریقوں سے محفوظ رکھے جنھوں نے علم نافع اور عمل صالح کے حصول میں کوتاہی کی۔

جان لیجیے! علم دین اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کتاب وسنت کو صحیح طریقے سے سمجھا جائے اور اس پر غور وفکر کیا جائے اور مخلص اساتذہ کی رہنمائی میں کتب تفسیر، شروحات حدیث، کتب فقہ اور کتب نحو وصرف کا مطالعہ ہو۔ عربی زبان، جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، سے واقفیت ہو۔ کتاب وسنت کو سمجھنے کے لیے یہی مفید ذرائع ہیں۔

میرے مسلمان بھائیو! آپ کا فرض ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے وہ علم حاصل کریں جس سے آپ کے دینی امور، یعنی نماز، روزہ اور حج وغیرہ کی ادائیگی درست ہو۔ زکاۃ کے مسائل سیکھیں۔ ان معاملات کے مسائل کا علم حاصل کریں جو زندگی میں پیش آتے ہیں تاکہ آپ مباح کو اختیار کرسکیں اور حرام سے بچ سکیں۔ آپ کی کمائی حلال ہو، آپ کی خوراک حلال و پاک ہوتا کہ آپ کی دعائیں قبول ہوں۔ یاد رکھیے! یہ وہ امور ہیں جن کا علم حاصل کرنے کی آپ کو اشد ضرورت ہے۔ اللہ کی توفیق سے یہ نہایت آسان ہے بشرطیکہ آپ کا عزم وارادہ پختہ اور نیت خالص ہو۔

میرے بھائیو! مفید کتب کے مطالعے کا شوق پیدا کیجیے۔ اہل علم سے رابطہ رکھیے تاکہ آپ مشکل مسائل کا حل معلوم کرسکیں اور دینی مسائل میں ان سے رہنمائی لے سکیں۔ ان دینی پروگراموں اور لیکچروں میں شرکت کیجیے جو مساجد وغیرہ میں منعقد ہوتے ہیں۔ مزید برآں ریڈیو وغیرہ سے اسلامی نشریات سننے کا اہتمام کیجیے، اسلامی رسائل پڑھیے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ مذکورہ علمی ذرائع میں دلچسپی لیں گے تو آپ کی دینی، اسلامی معلومات میں اضافہ ہوگا اور عقل وبصیرت میں مزید نکھار آئے گا۔

میرے بھائیو! یہ مت بھولو کہ عمل سے علم میں اضافہ ہوتا ہے، عقل وبصیرت میں روشنی آتی ہے۔ جب آپ علم کے ساتھ عمل بھی کریں گے تو اللہ آپ کے علم کو ترقی دے گا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ”جس نے علم کے ساتھ عمل بھی کیا، اللہ تعالیٰ اسے وہ علم دے گا جو اسے پہلے میسر نہ تھا۔“

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس بات کی صداقت کی گواہی دیتا ہے:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝﴾

”اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“[1]

علم کا حصول، اوقات کا بہترین مصرف ہے، خردمند اس میں رغبت رکھتے ہیں، علم سے مردہ دلوں کو زندگی ملتی ہے اور اعمال میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ رب ذوالجلال نے اپنی کتاب میں علمائے عاملین کی تعریف کی ہے۔ ان کی عظمت ورفعت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝﴾

”کہہ دیجیے: کیا علم والے اور بے علم برابر ہیں؟ یقیناً نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل مند ہوں۔“[2]

اور فرمایا ہے:

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝﴾

”تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنھیں علم دیا گیا ہے، اللہ ان کے درجے بلند کرے گا اور اللہ (ہر اس کام سے) جو تم کر رہے ہو (خوب) خبردار ہے۔“[3]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اولاً ان لوگوں کی امتیازی حیثیت بیان کی ہے جنھیں ایمان وعلم کی دولت نصیب ہوئی۔ ثانیاً فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال سے باخبر ہے۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ علم وعمل دونوں بیک وقت مطلوب ہیں اور ان کا صدور ایمان اور اللہ تعالیٰ کی نگہبانی کے احساس کے ساتھ ہونا چاہیے۔

ہم اللہ کی توفیق سے نیکی وتقویٰ میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ اس کتاب کے ذریعے سے آپ کی خدمت میں ان فقہی مسائل کے بارے میں (حسب توفیق) معلومات مہیا کر رہے ہیں جن کا علماء نے استنباط کیا اور انھیں اپنی گراں قدر کتب میں مدون فرمایا ہے۔ امید ہے کہ اس کاوش سے آپ کے دل میں دینی علم کے حصول کا مزید شوق پیدا ہوگا۔

[1] البقرة 282:2. [2] الزمر 9:39. [3] المجادلة 11:58.

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اور آپ کی نفع مند علوم کے حصول میں مدد فرمائے اور عمل صالح کی توفیق دے۔ اور حق کو حق کی شکل میں دکھائے اور اس کی اتباع کی ہمت دے۔ اور باطل کو باطل کی صورت میں دکھائے اور اس سے اجتناب کی قوت دے۔ بے شک وہی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

باب 1

طہارت کے احکام و مسائل

طہارت اور پانی کے احکام

کلمۂ شہادت کے بعد اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے جو مسلمان اور کافر میں فرق کرنے والی ہے۔ نماز اسلام کا ستون ہے۔ روز قیامت سب سے پہلے اسی رکن کے بارے میں محاسبہ ہوگا۔ اگر نماز درست اور مقبول قرار پائی تو اس بندے کے دیگر اعمال بھی درست اور مقبول قرار پائیں گے اور اگر یہ مردود ہوئی تو دوسرے اعمال بھی مردود ہوں گے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں نماز کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی جگہ پر نماز کی اقامت کا حکم دیا ہے اور کسی مقام پر اس کی اہمیت وحیثیت کو اجاگر کیا ہے۔ کبھی اس کا اجر وثواب بیان فرمایا ہے اور کہیں نماز کو صبر کے ساتھ ملا کر دونوں کے ذریعے سے مشکلات ومصائب میں استعانت کا حکم دیا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر نماز رسول اللہ ﷺ کی آنکھ کی ٹھنڈک، انبیاء کا زیور اور نیک بندوں کا شعار ہے۔ علاوہ ازیں نماز بندے اور اس کے رب کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔ نماز انسان کو بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ نماز کی صحت کا دارومدار اس امر پر ہے کہ نمازی حکمی اور حقیقی نجاست سے حسب طاقت پاک وصاف ہو اور طہارت کا اہتمام کرے جس کا ذریعہ پانی ہے۔ اگر پانی نہ ہو تو اس کی قائم مقام مٹی ہے۔

فقہائے کرام رحمہم اللہ کا ہمیشہ سے یہ انداز رہا ہے کہ دینی مسائل میں سب سے پہلے طہارت کے مسائل بیان کرتے ہیں کیونکہ جب کلمۂ شہادت کے بعد نماز دیگر ارکان اسلام میں مقدم قرار پائی تو مناسب سمجھا گیا کہ نماز کے مقدمات کا پہلے ذکر ہو۔ ان مقدمات میں طہارت بھی شامل ہے جو نماز کی چابی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

«مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُورُ» ''نماز کی چابی طہارت ہے۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ حدث ونجاست نماز سے مانع ہے۔ حدث ونجاست ایک تالا ہے جو ناپاک شخص کو لگ جاتا ہے۔ جب وہ وضو کرتا ہے تو کھل جاتا ہے۔ طہارت نماز کی اہم ترین شرط ہے اور شرط مشروط سے لازماً مقدم ہوتی ہے۔

طہارت کا لغوی معنی ہر قسم کی گندگی سے پاک وصاف ہونا ہے جب کہ شریعت میں اس کا معنی ومفہوم یہ ہے کہ انسان حکمی اور حقیقی نجاست کو زائل کرے۔

---

[1] سنن أبي داود، الطهارة، باب فرض الوضوء، حديث: 61، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء أن مفتاح الصلاة الطهور، حديث: 3.

واضح رہے کہ حکمی نجاست تب ختم ہوتی ہے جب کوئی انسان پانی کے استعمال کے ساتھ نیت کو بھی شامل کرلے۔ اگر حدث اکبر، یعنی غسل واجب ہے تو پورے بدن پر پانی استعمال کرے اور اگر حدث اصغر ہے تو چار اعضاء (چہرہ، ہاتھ، سر اور پاؤں) پر پانی استعمال کرے۔ اگر پانی نہ ہو یا پانی ہو لیکن اس کے استعمال سے عاجز ہو تو پاک مٹی سے تیمّم کرے۔ جس کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ إن شاء اللّٰہ تعالٰی.

اس مقام پر ہمارا مقصد پانی اور اس کی صفات بیان کرنا ہے اور بتانا ہے کہ کس قسم کے پانی سے طہارت حاصل ہوسکتی ہے اور کس سے طہارت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُورًا ۝﴾ ''اور ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی اتارا۔''[1]

مزید فرمایا:

﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهِ﴾

''اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا تاکہ تمھیں اس کے ذریعے سے پاک کردے۔''[2]

طہور وہ پانی ہے جو خود پاک ہو اور دوسری چیز کو بھی پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ اپنی قدرتی صفات کا حامل ہو۔ خواہ وہ آسمان کا پانی ہو، جیسے بارش، برف اور اولے، یا زمین پر جاری ہو، جیسے دریا، چشمے، کنویں اور سمندر کا پانی، یا قطروں کی صورت میں ہو، جیسے شبنم وغیرہ۔ یہ پانی کی ایسی انواع ہیں جن سے حدث ونجاست زائل ہو جاتی ہیں اور طہارت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایسے پانی میں نجاست شامل ہو جانے کی وجہ سے تبدیلی رونما ہو جائے تو اس سے بالاجماع طہارت حاصل نہ ہوگی، البتہ اگر اس قسم کے صاف پانی میں کوئی پاک چیز شامل ہو جائے اور اس کی تین صفات (بو، ذائقہ اور رنگت) میں سے کوئی صفت تبدیل ہو جائے لیکن پانی پر اس کا غلبہ نہ ہو تو اس کے بارے میں اہل علم کی دو رائے ہیں۔ صحیح رائے یہی ہے کہ ایسے پانی سے طہارت حاصل ہو جائے گی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اگر قلیل یا کثیر مقدار میں کسی پاک چیز کی ملاوٹ سے پانی میں تغیر واقع ہو جائے، مثلاً: اشنان، صابن، بیری کے پتے، خطمی، مٹی یا آٹے وغیرہ کی ملاوٹ ہو جائے یا کسی ایسے برتن میں پانی رکھ دیا گیا ہو جس میں بیری کے پتوں یا خطمی وغیرہ کے اثرات ہوں اور وقت گزرنے کے ساتھ پانی میں رنگت کی تبدیلی رونما ہو جائے اور اس پر پانی کا اطلاق بھی ہوتا ہو تو ایسے پانی سے متعلق علماء کے دو قول ہیں۔[3]

[1] الفرقان 48:25. [2] الأنفال 11:8.

[3] اشنان اور خطمی دونوں پودے ہیں جن کے پتے پانی میں ابال لیے جاتے ہیں، پھر اس پانی کو اچھی طرح صفائی حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

پھر شیخ موصوف رحمہ اللہ ہر ایک فریق کے دلائل نقل کرتے ہیں اور آخر میں اس قول کو راجح اور معتبر قرار دیتے ہیں کہ اس قسم کا پانی پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے اور وجہ ترجیح یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِّنْهُ﴾

''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی ضروری حاجت سے (فارغ ہو کر) آیا ہو یا تم نے عورتوں سے ہم بستری کی ہو، پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو، پھر اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔''[1]

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً﴾ میں، ماء کا کلمہ نکرہ ہے جو نفی کے سیاق میں واقع ہے، لہٰذا جس پر پانی کا اطلاق ہوتا ہو، اس سے طہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ پانی کی متعدد اقسام ہو جانے سے اس کے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔[2]

جب پانی موجود نہ ہو یا موجود ہو لیکن اس کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے مٹی کو اس کا قائم مقام قرار دیا ہے جس کا طریقۂ استعمال سنت رسول ﷺ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ جس کا ذکر تیمّم کے باب میں تفصیل سے ہوگا۔ إن شاء اللہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر یوں لطف و کرم فرمایا کہ تیمّم کا حکم دے کر ان کی مشکل کو آسان کر دیا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا﴾

''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو یا تم نے عورتوں سے ہم بستری کی ہو، پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا، بے حد بخشنے والا ہے۔''[3]

ابن ہبیرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ پانی میسر ہو جانے کی صورت میں اس سے طہارت حاصل کرنا ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر نماز کی ادائیگی فرض ہے، البتہ اگر پانی دستیاب نہ ہو تو مٹی سے تیمّم کر لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ ''پھر تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کرلو۔''[4]

---

① المآئدة 6:5. ② مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية رحمہ اللہ: 21/25,24. ③ النسآء 43:4. ④ المآئدة 6:5.

مزید فرمایا:

﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ﴾

''اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا تاکہ تمھیں اس کے ذریعے سے پاک کر دے۔''[2]

یہ امر اسلام کی عظمت کی دلیل ہے جو انسان کو حسی اور معنوی نجاست سے پاک وصاف رکھنے والا دین ہے۔ اسی طرح یہ امر نماز کی عظمت کا بھی شاہد ہے کیونکہ نماز کی ادائیگی دونوں قسم کی طہارت حاصل کیے بغیر ممکن نہیں۔

واضح رہے کہ معنوی طہارت سے مراد شرک سے پاک ہونا ہے جو عقیدہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اخلاص کی بدولت میسر ہوتی ہے۔ اور طہارت حسی سے مراد حدث ونجاست سے پاک وصاف ہونا ہے جو پانی یا اس کے قائم مقام مٹی سے حاصل ہوتی ہے۔

جان لیجیے! جب پانی اپنی قدرتی حالت میں ہو اور اس میں کوئی چیز گر نہ جائے تو ایسا پانی بالاجماع پاک ہے اور اگر پانی میں نجاست گر جائے جس کی وجہ سے اس کی تین صفات (بو، ذائقہ اور رنگت) میں سے کوئی ایک صفت بدل گئی ہو تو یہ پانی بالاجماع ناپاک ہے جس کا استعمال ناجائز ہے۔

اگر پانی میں کوئی پاک چیز گر جائے، مثلاً: درختوں کے پتے، صابن اور اشنان وغیرہ، نیز اس چیز کا پانی پر غلبہ نہ ہو تو ایسے پانی سے متعلق اہل علم میں اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے کہ ایسا پانی پاک ہے اور اس سے حدث و نجاست زائل کر کے طہارت و پاکیزگی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ پانی کی دو قسمیں ہیں: ① پاک پانی جس سے طہارت حاصل کرنا درست ہے۔ یہ وہ قسم ہے جو اپنی فطری اور قدرتی حالت میں ہو یا اس میں کسی پاک چیز کی ملاوٹ ہو گئی ہو، بشرطیکہ اس چیز کا ایسا غلبہ نہ ہو کہ اس مرکب کو پانی کا نام نہ دیا جا سکے۔

② ناپاک پانی جس کا استعمال جائز نہیں۔ وہ نہ حدث کو ختم کرتا ہے اور نہ نجاست دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایسا پانی ہے جو نجاست گر جانے کی وجہ سے متغیر ہو گیا۔ واللہ أعلم.

برتنوں اور کافروں کے کپڑوں کے احکام

یہاں برتنوں سے مراد ایسے برتن ہیں جو کھانے اور پانی وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، وہ

[2] الأنفال 11:8.

لوہے کے ہوں یا لکڑی کے، چمڑے کے ہوں یا کسی اور دھات سے بنے ہوں۔ برتنوں کے استعمال میں اصل حکم ان کے جواز کا ہے، لہٰذا ہر وہ برتن جو پاک صاف ہو، اس کا استعمال جائز ہے، البتہ درج ذیل برتنوں کا استعمال حرام ہے:

▲ وہ برتن جو خالص سونے یا چاندی کے بنے ہوں یا ان میں سونے چاندی کی ملاوٹ ہو یا ان پر ان میں سے کسی ایک دھات کی پالش وغیرہ ہو۔ ہاں، اگر کسی ٹوٹے ہوئے برتن کو سونے یا چاندی کے تار کے ذریعے سے جوڑ دیا گیا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔ سونے اور چاندی کے برتنوں کے استعمال کی حرمت کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

«لَا تَشْرَبُوا فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَا تَأْكُلُوا فِي صِحَافِهَا فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَنَا فِي الْآخِرَةِ»

''سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور نہ ان کی پلیٹوں میں کھاؤ کیونکہ یہ چیزیں ان (کافروں) کے لیے دنیا میں ہیں اور ہمارے لیے آخرت میں ہیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«اَلَّذِي يَشْرَبُ فِي آنِيَةِ الْفِضَّةِ، إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ»

''جو شخص چاندی کے برتنوں میں پیتا ہے تو وہ یقیناً اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔''[2]

برتن مکمل طور پر خالص سونے یا چاندی سے بنا ہو یا اس میں ان دھاتوں کی ملاوٹ ہو یا ان کی پالش ہو تو (جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے) بہر صورت اس کا استعمال ممنوع ہے، البتہ ٹوٹے ہوئے برتن کو قابل استعمال بنانے کے لیے اسے سونے، چاندی کے تار سے جوڑ دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس بارے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ قَدَحَ النَّبِيِّ ﷺ انْكَسَرَ فَاتَّخَذَ مَكَانَ الشَّعْبِ سِلْسِلَةً مِّنْ فِضَّةٍ»

''نبی ﷺ کا ایک پیالہ ٹوٹ گیا تو آپ ﷺ نے چاندی کے تار سے اسے جوڑ لیا۔''[3]

[1] صحيح البخاري، الأطعمة، باب الأكل في إناء مفضض، حديث :5426 ، وصحيح مسلم، اللباس والزينة، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة ...... ، حديث :2067. [2] صحيح البخاري، الأشربة، باب آنية الفضة، حديث: 5634، وصحيح مسلم، اللباس والزينة، باب تحريم استعمال أواني الذهب والفضة......،حديث :2065 واللفظ له.
[3] صحيح البخاري، فرض الخمس، باب ما ذكر من درع النبي ﷺ وعصاه ...... ، حديث :3109.

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا یا کسی بھی صورت میں ان کا استعمال بالاتفاق حرام ہے۔''[1]

حرمت استعمال کا یہ حکم مردوں اور عورتوں دونوں کو ہے کیونکہ نہی میں عموم ہے۔ عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کوئی دلیل نہیں، البتہ وہ اپنے خاوند کو خوش کرنے کے لیے زیور کی شکل میں سونا، چاندی استعمال کر سکتی ہیں۔

مسلمانوں کے لیے کافروں کے برتنوں کا استعمال جائز اور مباح ہے، بشرطیکہ ان پر نجاست وغیرہ نہ لگی ہوئی ہو۔ اگر کسی قسم کی نجاست محسوس ہو تو انھیں اچھی طرح دھو کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

◢ مردار جانور کا چمڑہ بغیر رنگے استعمال کرنا حرام ہے، البتہ مردار جانور کے چمڑے کو رنگ لینے کے بعد استعمال کرنے کے جواز یا عدم جواز میں علماء کے مابین اختلاف ہے لیکن درست بات یہی ہے کہ ایسے چمڑے کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں بلکہ جائز ہے۔ یہی جمہور کا مسلک ہے۔ اس کی تائید میں متعدد احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ علاوہ ازیں چمڑے کی نجاست ایک عارضی چیز ہے جو رنگنے سے زائل ہو جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يُطَهِّرُهَا الْمَاءُ وَالْقَرَظُ»

''پانی اور قرظ (کیکر کے مشابہ درخت سلم جس کے پتوں سے کھال رنگی جاتی ہے) اسے پاک وصاف کر دیتے ہیں۔''[2]

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«دِبَاغُ الْأَدِيمِ طَهُورُهُ» ''چمڑے کی رنگائی اسے پاک کر دیتی ہے۔''[3]

◢ کافروں کے کپڑوں پر نجاست کے آثار نہ ہوں تو ان کا استعمال بھی جائز ہے کیونکہ کسی چیز کا اصل حکم اس کا پاک ہونا ہے جو محض شک وشبہ سے ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح کفار کے ہاتھوں سے بنے ہوئے یا رنگے ہوئے کپڑوں کو استعمال میں لانا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کافروں کے تیار کردہ یا رنگے ہوئے کپڑے پہنتے اور استعمال کرتے تھے۔ والله تعالىٰ أعلم.

---

① شرح صحيح مسلم للنووي: 41/14. ② مسند أحمد: 334/6، وسنن أبي داود، اللباس، باب في أهب الميتة، حديث: 4126، وسنن النسائي، الفرع والعتيرة، باب ما يدبغ به جلود الميتة، حديث: 4253. ③ مسند أحمد: 476/3، وسنن أبي داود، اللباس، باب في أهب الميتة، حديث: 4125، والمعجم الكبير للطبراني، حديث: 6341 واللفظ له.

جنبی پر کون سی چیزیں حرام ہیں

اب ہم ان اعمال کا تذکرہ کریں گے جو کسی مسلمان پر اس وقت تک حرام ہوتے ہیں جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائے کیونکہ وہ اعمال تقدس اور شرف کے حامل ہیں۔ ہم ان اعمال کی وضاحت دلائل کے ساتھ کریں گے تاکہ آپ انھیں ملحوظ رکھیں اور طہارت مطلوبہ حاصل ہونے پر ہی انھیں ادا کریں۔ سب سے پہلے ان اعمال کا تذکرہ کرنا مناسب ہے جنھیں حدث اکبر یا حدث اصغر دونوں حالتوں میں کرنا حرام ہے۔[1]

▲ قرآن مجید کو چھونا: کوئی ناپاک شخص قرآن مجید کو غلاف وغیرہ کے بغیر ہاتھ نہ لگائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝﴾ ''قرآن کو صرف پاک لوگ (فرشتے) ہی چھوتے ہیں۔''[2]

اس آیت میں طہارت سے مراد ہر قسم کی نجاست کو دور کرنا ہے۔ یہ نقطۂ نظر ان حضرات کا ہے جو ﴿الْمُطَهَّرُونَ﴾ سے مراد انسان لیتے ہیں۔ جبکہ بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد صرف معزز فرشتے ہیں۔

اگر یہاں آیت میں ﴿الْمُطَهَّرُونَ﴾ سے مراد فرشتے ہوں تو اشارۃ النص کے ساتھ انسان بھی اس میں شامل ہیں۔ اس موقف کی تائید و تصدیق اس خط سے بھی ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا تھا، اس میں یہ کلمات درج تھے:

«لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ» ''قرآن کو صرف پاک شخص ہی چھوئے۔''[3]

واضح رہے کہ اس خط میں آپ کے مخاطب انسان ہی تھے۔

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث متواتر کے مشابہ ہے کیونکہ علماء نے اسے قبول کیا ہے۔''[4]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے کہ طہارت حاصل کیے بغیر قرآن مجید کو چھونا نہیں چاہیے اور

---

① حدث اکبر سے مراد ایسی نجاست ہے جسے زائل کرنے کے لیے غسل کرنا پڑے، مثلاً: جنابت۔ اور حدث اصغر سے مراد ایسی نجاست ہے جو صرف وضو کرنے سے ختم ہو جائے، مثلاً: ہوا کا نکلنا یا مذی کا آنا وغیرہ۔ حدث اصغر کی حالت میں قرآن مجید کو چھونا یا پڑھنا جائز ہے، تحریم کی کوئی دلیل نہیں، البتہ وضو کر کے قرآن پڑھنا افضل ہے۔ (صارم)

② الواقعة 56:79. ③ سنن الدارقطني : 120/1، حديث : 429 ، والسنن الكبرى للبيهقي : 88/1، وسنن الدارمي : 112/2، حديث: 2263. ④ تحفة الأحوذي: 403/1، وعون المعبود: 264/1، وفتح المالك بتبويب التمهيد لابن عبدالبر على الموطأ للإمام مالك : 90/4.

انھوں نے اسے ائمہ اربعہ کا مسلک قرار دیا ہے۔[2]

ابن ہبیرہ رحمہ اللہ نے اپنی گراں مایہ تصنیف ''الإفصاح'' میں لکھا ہے: ''اس امر پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ طہارت کے بغیر قرآن مجید چھونا جائز نہیں۔''

اگر قرآن مجید غلاف میں لپٹا ہوا ہو یا کسی ڈبیہ میں بند ہو تو اس حالت میں اسے اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اسے براہ راست ہاتھ نہ لگایا جائے۔ اسی طرح قرآن مجید کو دیکھنا یا ہاتھ لگائے بغیر کسی قلم یا لکڑی سے اس کی ورق گردانی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ایسا ناپاک شخص جو طہارت حاصل کر سکتا ہو، اس کے لیے فرض یا نفل نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ اس پر علمائے امت کا اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى ٱلْمَرَافِقِ وَٱمْسَحُواْ بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى ٱلْكَعْبَيْنِ ۚ وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَٱطَّهَّرُواْ﴾

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو، اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھو لو اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کر لو۔''[3]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَقْبَلُ اللهُ صَلَاةً بِغَيْرِ طُهُورٍ» ''اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا۔''[4]

ایک دوسری روایت میں ہے:

«لَا يَقْبَلُ اللهُ صَلَاةَ أَحَدِكُمْ إِذَا أَحْدَثَ حَتَّى يَتَوَضَّأَ»

''اللہ تعالیٰ تم میں سے ناپاک شخص کی نماز قبول نہیں کرتا جب تک وہ وضو نہ کر لے۔''[5]

کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ پانی کے استعمال کی قدرت کے باوجود طہارت حاصل کیے بغیر نماز ادا کرے اگر اس نے ایسا کیا تو اس کی نماز صحیح نہ ہوگی، وہ جاہل ہو یا عالم، بھول کر کرے یا قصداً۔ اگر کسی نے مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود جان بوجھ کر بغیر طہارت نماز ادا کی تو وہ گناہ گار ہوگا اور سزا کا بھی مستحق ہوگا۔ اور اگر کسی کو یہ مسئلہ معلوم نہ

[2] مجموع الفتاوىٰ لشيخ الإسلام ابن تيمية رحمه الله: 266/21. [3] المآئدة 6:5. [4] صحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب الطهارة للصلاة، حديث: 224، وسنن النسائي، الطهارة، باب فرض الوضوء، حديث: 139 واللفظ له. [5] صحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب الطهارة للصلاة، حديث: 225، وسنن أبي داود، الطهارة، باب فرض الوضوء، حديث: 60 واللفظ له.

ہو یا اس نے بھول کر نماز پڑھ لی تو وہ گناہ گار نہ ہوگا۔لیکن اس کی نماز درست نہ ہوگی۔ (اس کے لیے طہارت حاصل کر کے دوبارہ نماز ادا کرنی ضروری ہوگی۔)

▲ بیت اللہ کا طواف کرنا ناپاک شخص پر حرام ہے کیونکہ رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلطَّوَافُ بِالْبَيْتِ صَلَاةٌ إِلَّا أَنَّ اللهَ أَحَلَّ لَكُمْ فِيهِ الْكَلَامَ»

''بیت اللہ کا طواف نماز کی طرح ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اس میں کلام کی اجازت دی ہے۔''[1]

علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ نے طوافِ کعبہ کے لیے وضو کا اہتمام فرمایا، نیز رسول اللہ ﷺ نے حائضہ عورت کو بیت اللہ کے طواف سے منع فرما دیا ہے۔ یہ تمام نصوص اس مسئلہ کی وضاحت کرتی ہیں کہ ناپاک شخص کے لیے بیت اللہ کا طواف کرنا حرام ہے۔

حدث اکبر کی حالت میں بیت اللہ کے طواف کی حرمت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَوٰةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا﴾

''اے ایمان والو! جب تم نشے میں مست ہو تو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ یہاں تک کہ تم اپنی بات کو سمجھنے لگو اور جنابت کی حالت میں یہاں تک کہ غسل کرلو، ہاں اگر راہ چلتے گزر جانے والے ہو تو اور بات ہے۔''[2]

اس آیت کی رو سے مسجد میں ٹھہرنے کے لیے داخل ہونا منع ہے تو طواف کرنا بالاولیٰ منع ہوا۔

یہ وہ کام ہیں جو حدث اکبر یا حدث اصغر دونوں حالتوں میں حرام ہیں۔ ذیل میں ان امور کا ذکر کیا جاتا ہے جنھیں حدث اکبر کی حالت میں کرنا حرام ہے:

▲ حدث اکبر کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا منع ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«لَمْ يَكُنْ يَحْجُبُهُ عَنِ الْقُرْآنِ شَيْءٌ لَّيْسَ الْجَنَابَةَ»

''رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی تلاوت سے سوائے جنابت کے کوئی چیز نہ روکتی تھی۔''[3]

[1] المستدرك للحاكم: 459/1، حديث: 1686، وجامع الترمذي، الحج، باب ما جاء في الكلام في الطواف، حديث: 960، وصحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان: 144,143/9، حديث: 3836، وصحيح ابن خزيمة: 222/4، حديث: 2739. [2] النسآء 4:43. [3] سنن النسائي، الطهارة، باب حجب الجنب من قراءة القرآن، حديث: 266، وسنن أبي داود، الطهارة، باب في الجنب يقرأ القرآن، حديث: 229، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب ما جاء في قراءة القرآن على غير طهارة، حديث: 594، ومسند أحمد: 84/1.

جامع ترمذی کی روایت میں ہے:

«يُقْرِئُنَا الْقُرْآنَ عَلٰى كُلِّ حَالٍ مَّا لَمْ يَكُنْ جُنُبًا»

''جنابت کی حالت کے سوا آپ ہمیں ہر حال میں قرآن مجید پڑھاتے تھے۔'' ①

یہ روایات اس بات کی دلیل ہیں کہ جنبی شخص کے لیے قرآن مجید کی تلاوت کرنا حرام ہے۔ حائضہ اور نفاس والی عورت کا بھی یہی حکم ہے، ② البتہ بعض علماء، مثلاً: ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ نے حائضہ کو قرآن مجید کی تلاوت کی اس وقت اجازت دی ہے جب اسے قرآن کے کسی حصے کے بھول جانے کا اندیشہ ہو۔

اگر کوئی جنبی شخص قرآن مجید کے معنی و مفہوم اور توضیح و تشریح سے متعلق گفتگو کر لے یا قرآن مجید کی تلاوت کا ارادہ نہ ہو بلکہ محض ذکر کے طور پر قرآنی کلمات پڑھ لے، مثلاً: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ یا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ وغیرہ تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهِ» ''نبی ﷺ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔'' ③

▲ حیض و نفاس والی کے لیے وضو کے بعد بھی مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں۔

▲ اگر کوئی شخص جنبی ہو یا کوئی عورت حیض و نفاس کے ایام میں ہو تو اس کے لیے بغیر وضو مسجد میں ٹھہرنا حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا﴾

''اے ایمان والو! جب تم نشے میں مست ہو تو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ، یہاں تک کہ اپنی بات کو سمجھنے لگو اور جنابت کی حالت میں یہاں تک کہ غسل کر لو۔ ہاں اگر راہ چلتے گزر جانے والے ہو تو اور بات ہے۔'' ④

نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَّلَا جُنُبٍ» ''میں حائضہ اور جنبی کو مسجد میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔'' ⑤

① جامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء في الرجل يقرأ القرآن على كل حال ما لم يكن جنبا، حديث: 146.

② حائضہ اور نفاس والی کو جنب پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، جنابت کا ازالہ اختیاری ہے جبکہ حیض و نفاس کا ازالہ اختیاری نہیں، لہٰذا حائضہ و نفاس والی قرآن مجید کی تلاوت کر سکتی ہے۔ (ع۔و)

③ صحيح البخاري، الأذان، باب هل يتتبع المؤذن فاه هاهنا وهاهنا؟......، قبل الحديث: 634 معلقًا، وصحيح مسلم، الحيض، باب ذكر الله تعالى في حال الجنابة وغيرها، حديث: 373. ④ النسآء 4:43. ⑤ [ضعيف] سنن ◀◀

جب جنبی شخص وضو کرلے تب وہ مسجد میں ٹھہر سکتا ہے۔ حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو دیکھا، وہ جنابت کی حالت میں ہوتے تو وضو کر کے مسجد میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔''[1]

وضو کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس سے جنابت میں تخفیف ہو جاتی ہے۔

جنبی شخص مسجد میں سے گزر سکتا ہے، بیٹھ نہیں سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ﴾ میں نہی سے یہ استثناء اباحت کی دلیل ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان: «لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَّلَا جُنُبٍ» میں موجود عموم کے لیے مخصص بھی ہے۔ عید گاہ کا بھی یہی حکم ہے۔ یعنی جنبی شخص بغیر وضو کے وہاں نہ ٹھہرے، البتہ وہاں سے گزر سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَلْيَعْتَزِلِ الْحُيَّضُ الْمُصَلّٰى» ''حیض والی عورتیں جائے نماز سے الگ رہیں۔''[2]

قضائے حاجت کے آداب

دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ان تمام امور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو دین و دنیا میں انسانوں کو پیش آتے ہیں۔ ان میں ایک پہلو قضائے حاجت کے آداب کی تعلیم کا بھی ہے۔ دین اسلام نے یہ آداب بھی سکھلائے ہیں تاکہ انسان اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے حیوان سے ممتاز رہے۔ علاوہ ازیں ہمارا دین طہارت و نظافت والا دین ہے جو ہر مسلمان سے طہارت و صفائی کا متقاضی ہے، لہٰذا ہم یہاں بالاختصار ان آداب شرعیہ کا ذکر کرتے ہیں جو ایک مسلمان کو بیت الخلا میں جاتے وقت اور قضائے حاجت کے دوران ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں۔

- جب کوئی مسلمان قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا میں داخل ہو تو پہلے بایاں قدم اندر رکھے اور (داخل ہونے سے پہلے) یہ دعا پڑھے:

«بِسْمِ اللهِ، أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ»

◄◄ أبي داود، الطهارة، باب في الجنب يدخل المسجد، حديث: 232، وصحيح ابن خزيمة: 284/2، حديث: 1327، وإرواء الغليل: 210/1، حديث: 193 وصححه الشيخ زبير علي زئي.

[1] عون المعبود: 269/1. [2] صحيح البخاري، العيدين، باب إذا لم يكن لها جلباب في العيد، حديث: 980، وصحيح مسلم، صلاة العيدين، باب ذكر إباحة خروج النساء في العيدين إلى المصلى ......، حديث: 890، وسنن النسائي، صلاة العيدين، باب خروج العواتق وذوات الخدور في العيدين، حديث: 1559 واللفظ له.

''اللہ کے نام سے، میں خبیث نر اور خبیث مادہ شیطانوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔''[1]

- قضائے حاجت سے فراغت کے بعد باہر نکلتے وقت پہلے دایاں قدم باہر رکھے اور (باہر آ کر) یہ کہے:

«غُفْرَانَكَ» ''تیری بخشش کا سوال کرتا ہوں۔''[2]

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذٰى وَعَافَانِي»

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے جس نے مجھ سے نجاست دور کر دی اور تندرستی دی۔''[3]

واضح رہے کہ دائیں ہاتھ پاؤں کا استعمال پاکیزہ اور اچھے کاموں کے لیے ہے جبکہ بائیں ہاتھ پاؤں کا استعمال اکثر نجاست وغیرہ دور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

- جب کوئی شخص (چار دیواری کے بجائے) کسی کھلی جگہ میں قضائے حاجت کا ارادہ کرے تو اسے دور اور ایسی الگ جگہ تلاش کرنی چاہیے جو انسانی نگاہوں سے محفوظ ہو یا دیوار، درخت وغیرہ کی اوٹ میں چلا جائے۔

- قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرے، نہ پیٹھ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔[4]

ہر مسلمان کو چاہیے کہ حتی الوسع اپنے بدن اور کپڑوں کو پیشاب کی چھینٹوں سے بچائے۔ اس بارے میں احتیاطی صورت یہ ہے کہ وہ کسی نرم جگہ کو تلاش کرے تا کہ اس پر چھینٹے اڑ کر نہ پڑیں۔

- کوئی شخص اپنی شرمگاہ کو دایاں ہاتھ نہ لگائے۔ لوگوں کے راستوں، سائے کی جگہوں اور پانی کے چشموں اور گھاٹوں وغیرہ پر پیشاب یا قضائے حاجت کے لیے نہ بیٹھے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے روکا ہے[5] کیونکہ یہ چیز لوگوں کے لیے اذیت و تکلیف کا باعث بنتی ہے۔

- بیت الخلا میں کوئی ایسی چیز ساتھ لے کر نہ جائے جس پر اللہ تعالیٰ کا ذکر لکھا ہو یا قرآنی آیات درج ہوں۔ اگر کوئی مجبوری ہو تو جیب میں بند کر لے یا کسی کپڑے میں اچھی طرح ڈھانپ لے۔

---

① فتح الباري:244/1، وسنن أبي داود، الطهارة، باب مايقول الرجل إذا دخل الخلاء؟ حديث: 6. ② سنن أبي داود، الطهارة، باب ما يقول الرجل إذا خرج من الخلاء؟ حديث: 30، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما يقول إذا خرج من الخلاء؟ حديث: 7. ③ [ضعيف]سنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب ما يقول إذا خرج من الخلاء؟ حديث: 301. یہ دعا سنداً ضعیف ہے، لہذا پہلی دعا کا پڑھنا ہی کافی ہے۔ ④صحيح البخاري، الوضوء، باب لا تستقبل القبلة ببول ولا غائط ......، حديث: 144، وصحيح مسلم، الطهارة، باب الاستطابة، حديث: 264. ⑤ سنن أبي داود، الطهارة، باب المواضع التي نهي عن البول فيها، حديث: 26,25، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب النهي عن الخلاء على قارعة الطريق، حديث: 328، ومسند أحمد: 36/3.

▲ قضائے حاجت کے وقت گفتگو نہ کرے ۔حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کی حرکت سے ناراض ہوتا ہے۔[1] اس دوران میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی حرام اور منع ہے۔

▲ جب قضائے حاجت سے فارغ ہو تو پانی یا مٹی کے ڈھیلوں کے استعمال سے خوب طہارت و نظافت حاصل کرے۔اگر کوئی شخص پانی اور مٹی دونوں استعمال کر لے تو یہ افضل ہے وگرنہ کسی ایک پر اکتفا بھی جائز اور کافی ہے......استنجا کے لیے ٹشو پیپر یا کپڑا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ان سے جسم اچھی طرح صاف اور خشک ہو جائے ......ان اشیاء کو کم از کم تین مرتبہ استعمال کیا جائے، البتہ ضرورت محسوس ہو تو تین سے زائد مرتبہ استعمال کرنا بھی درست ہے۔

▲ استنجا کے لیے ہڈی، جانور کی لید اور گوبر کو ہرگز استعمال میں نہ لایا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے منع کیا ہے۔[2]

▲ اعضائے بدن پر نجاست کے ظاہری اثرات کو اچھی طرح ختم کیا جائے یہاں تک کہ مقام نجاست خوب صاف اور خشک ہو جائے۔نجاست کے باقی رہنے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ وہ پھیل کر جسم یا کپڑے کے پاک حصے کو پلید کر دے گی۔

بعض فقہائے کرام کا کہنا ہے کہ وضو سے پہلے (بہر صورت) استنجا کرنا صحتِ وضو کے لیے شرط ہے اگر پہلے وضو کرے گا، پھر استنجا کرے گا تو اس کا وضو باقی نہیں رہے گا کیونکہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ روایت میں ہے:

«يَغْسِلُ ذَكَرَهُ، وَيَتَوَضَّأُ» ''وہ اپنی شرم گاہ دھوئے، پھر وضو کرے۔''[3]

امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''ایک مسلمان کے لیے بہتر صورت یہ ہے کہ وہ وضو سے پہلے استنجا کر لے تا کہ وہ دائرہ اختلاف سے نکل جائے اور نقضِ طہارت کا اندیشہ نہ رہے۔''

میرے مسلمان بھائی! پیشاب کی چھینٹوں سے خود کو اور اپنے کپڑوں کو بچائیے کیونکہ اس بارے میں بے احتیاطی عذابِ قبر کا باعث بن سکتی ہے۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«اِسْتَنْزِهُوا مِنَ الْبَوْلِ، فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ»

[1] سنن أبي‌داود، الطهارة، باب كراهية الكلام عندالخلاء، حديث : 15، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب النهي عن الاجتماع على الخلاء والحديث عنده، حديث : 342، و مسند أحمد: 36/3. [2] صحيح البخاري، الوضوء، باب الاستنجاء بالحجارة، حديث : 155، وسنن النسائي، الطهارة، باب النهي عن الاستطابة بالعظم، حديث : 39. [3] صحيح مسلم، الحيض، باب المذي، حديث : 303 .

''پیشاب سے بچو، زیادہ تر یہی چیز عذاب قبر کا سبب بنتی ہے۔''①

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس حدیث کے شواہد ہیں اور اس کی اصل صحیحین میں ہے۔②

میرے بھائی! طہارت کامل ہو تو عبادت کی ادائیگی آسان ہو جاتی ہے بلکہ تکمیل طہارت، مسنون طریقے سے عبادت کو سرانجام دینے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ حضرت شبیب ابو روح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ایک مرتبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ اس میں آپ نے سورۂ روم کی تلاوت شروع کی تو اختلاط ونسیان واقع ہونے لگا، نماز سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا:

«إِنَّهُ يَلْبِسُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ أَنَّ أَقْوَامًا مِّنْكُمْ يُصَلُّونَ مَعَنَا لَا يُحْسِنُونَ الْوُضُوءَ، فَمَنْ شَهِدَ الصَّلَاةَ مَعَنَا فَلْيُحْسِنِ الْوُضُوءَ»

''مجھے قرآن مجید کی تلاوت میں اختلاط ونسیان ہو رہا تھا جس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمارے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں لیکن وہ اچھی طرح وضو نہیں کرتے۔ خبردار! جو شخص ہمارے ساتھ نماز ادا کرے، وہ اچھی طرح وضو کرے۔''③

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مسجد قبا میں نماز پڑھنے والے صحابۂ کرام کی بہت تعریف کی ہے، فرمایا:

﴿ فِيهِ رِجَالٌ يُّحِبُّونَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝﴾

''اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں۔ اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔''④

جب ان سے طریقۂ طہارت پوچھا گیا تو انھوں نے جوابًا کہا کہ ہم مٹی کے ڈھیلے استعمال کرنے کے بعد پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔⑤

تنبیہ | جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ بعض اہل علم کے نزدیک استنجا کرنا وضو کا حصہ ہے، لہٰذا جب بھی وضو کیا جائے تو اس سے پہلے استنجا ضرور کیا جائے اگرچہ وہ اس سے پہلے (قضائے حاجت سے فراغت کے بعد) استنجا کر چکا ہو۔

① سنن الدار قطني: 127/1، حديث: 457. ② صحيح البخاري، الوضوء، باب من الكبائر أن لايستتر من بوله، حديث: 216، وصحيح مسلم، الطهارة، باب الدليل على نجاسة البول ووجوب الاستبراء منه، حديث: 292.
③ مسند أحمد: 472/3، 471. ④ التوبة 108:9. ⑤ [ضعيف] مختصر زوائد مسند البزار: 155/1. یہ روایت ضعیف ہے، تاہم استنجا کرتے وقت صرف مٹی کے ڈھیلے یا ڈھیلے اور پانی یا صرف پانی استعمال کرنا جائز ہے۔

لیکن یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ استنجا کا تعلق وضو سے ہرگز نہیں بلکہ استنجا کا تعلق قضائے حاجت سے ہے، لہٰذا اسے وضو کے لیے نئے سرے سے استنجا کرنے کی قطعًا ضرورت نہیں۔

میرے بھائی! ہمارا دین، طہارت و نظافت کا دین ہے، آپ حسن آداب اور اعلیٰ اخلاق سے آراستہ رہیے۔ ایک مسلمان کی جو احتیاج ہے اور جس میں اس کی اصلاح ہے، اس کے متلاشی رہیے۔ جس چیز میں مصلحت ہے اس میں غفلت نہ برتیے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ دین میں استقامت دے، اعمال میں بصیرت بخشے، احکام شرعیہ میں اخلاص و عمل کی توفیق دے تا کہ ہمارا ہر عمل رب تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول و منظور ہو۔ (آمین)

مسواک اور صفات فطرت کا بیان

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ، مَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ»

''مسواک منہ کی صفائی اور رب کی رضا کا ذریعہ ہے۔''[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«خَمْسٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ: اَلْخِتَانُ وَالْاِسْتِحْدَادُ وَتَقْلِيمُ الْأَظْفَارِ وَنَتْفُ الْإِبِطِ وَقَصُّ الشَّارِبِ»

''پانچ صفات 'فطرت کی صفات' ہیں: ختنہ کرنا، زیر ناف بال اتارنا، ناخن تراشنا، بغلوں کے بال اکھیڑنا اور مونچھیں کاٹنا۔''[2]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا:

«أَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَأَعْفُوا اللِّحٰى» ''مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں بڑھاؤ۔''[3]

مندرجہ بالا روایات اور اس مضمون کی دیگر روایات سے فقہائے کرام نے درج ذیل مسائل اخذ کیے ہیں:

---

[1] مسند أحمد: 47/6 و 62، وسنن النسائي، الطهارة، باب الترغيب في السواك، حديث: 5. [2] صحيح البخاري، اللباس، باب قص الشارب، حديث: 5889، وصحيح مسلم، الطهارة، باب خصال الفطرة، حديث: 257. [3] صحيح البخاري، اللباس، باب تقليم الأظفار، حديث: 5892، وصحيح مسلم، الطهارة، باب خصال الفطرة، حديث: 259 واللفظ له.

مسواک کرنا کسی درخت کی شاخ کے ساتھ دانتوں اور مسوڑھوں پر جما ہوا میل کچیل اتارنا اور بدبو کو ختم کرنا خصائل فطرت میں شامل ہے۔

حدیث میں ہے کہ مسواک کرنا انبیائے کرام کی سنت رہی ہے۔[1] سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے مسواک استعمال کی۔ ہمارے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مسواک منہ کو صاف کرنے اور رب تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔'' مسواک کی فضیلت و اہمیت کے بارے میں سو کے قریب احادیث ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسواک کرنا سنت مؤکدہ ہے اور بہت سے فوائد کا حامل عمل ہے، ان میں سب سے بڑا اور اہم فائدہ منہ کی صفائی ہے اور رب تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔

مسواک (مناسب یہ ہے کہ) قدرے نرم شاخ سے حاصل کی جائے جو پیلو یا زیتون کی ہو یا کھجور کے گچھے کی شاخ ہو یا کوئی ایسی شاخ ہو جو نہ بہت زیادہ نرم ہو اور نہ اس قدر سخت ہو کہ منہ کو زخمی کر دے۔

مسواک کسی بھی وقت کی جا سکتی ہے۔ روزے دار شخص دن میں کسی بھی وقت مسواک کر سکتا ہے۔ وضو کے وقت مسواک کرنے کی زیادہ تاکید ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ وُضُوءٍ»

''میری امت پر مشکل نہ ہوتا تو میں انھیں حکم دیتا ہے کہ وہ ہر وضو کے ساتھ مسواک کیا کریں۔''[2]

اس حدیث میں ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔ مسواک کلی کرنے کے وقت استعمال کی جائے کیونکہ اس سے منہ کی خوب صفائی ہو جاتی ہے۔

فرض یا نفل نماز کے وقت بھی مسواک کرنے کی بہت تاکید آئی ہے کیونکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کے وقت کامل طور پر طہارت و نظافت حاصل کریں تاکہ عبادت کے شرف و عظمت کا خوب اظہار ہو۔

رات یا دن کے کسی حصے میں نیند سے بیدار ہوتے وقت بھی مسواک کرنے کی بہت تاکید آئی ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ»

[1] [ضعيف] جامع الترمذي، النكاح، باب ماجاء في فضل التزويج والحث عليه، حديث: 1080. [2] المصنف لابن أبي شيبة، باب ما ذكر في السواك : 155/1، حديث : 1787، ورواه البخاري تعليقا، الصوم، باب سواك الرطب واليابس للصائم ، قبل حديث : 1934، وأصله متفق عليه، صحيح البخاري، الجمعة، باب السواك يوم الجمعة، حديث : 887، وصحيح مسلم، الطهارة، باب السواك، حديث : 252.

''نبی کریم ﷺ جب رات کو اٹھتے تو مسواک کیا کرتے تھے۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ نیند کے دوران معدہ کے بخارات اٹھنے کی وجہ سے منہ کی بو تبدیل ہو کر (ناپسندیدہ) ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں مسواک کے استعمال سے مکروہ اثرات زائل ہو جاتے ہیں اور منہ صاف ستھرا ہو جاتا ہے۔

اگر کسی چیز کے کھانے پینے سے منہ کی بو صحیح نہ رہے تو اس وقت بھی مسواک استعمال کی جائے۔ قرآن مجید کی تلاوت کا ارادہ ہو تو پہلے مسواک کر لینی چاہیے تاکہ کلام اللہ کی تلاوت کے وقت منہ پاک صاف ہو۔

▲ مسواک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسواک بائیں ہاتھ میں پکڑی جائے[2] اور اسے دانتوں اور مسوڑھوں پر اس طرح پھیرا جائے کہ منہ کی دائیں جانب سے شروع کرے اور مسواک کرتا ہوا بائیں جانب لے جائے۔

▲ ہمارے دین حنیف کی امتیازی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ فطرتی خصائل کا حامل دین ہے جیسا کہ مذکورہ روایات سے واضح ہو چکا ہے۔ انھیں فطری صفات اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں، پھر اس نے اپنے بندوں کو ان پر عمل کرنے کی رغبت دلائی ہے بلکہ ان کے لیے پسند کیا ہے تاکہ اس کے بندے صفات کاملہ کے حامل ہوں، ان کی وضع قطع اچھی ہو...... درحقیقت یہ سابقہ انبیائے کرام کی ایسی سنتیں رہی ہیں جن پر پہلی شریعتوں کا اتفاق تھا۔ مسواک کے علاوہ دیگر خصائل فطرت قدرے اختصار سے یہاں بیان کیے جاتے ہیں۔

① زیر ناف بال اتارنا: ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرمگاہ کے اردگرد بالوں کو استرے سے یا کسی اور چیز پاؤڈر وغیرہ سے اتار لے تاکہ خوبصورتی و نظافت حاصل ہو۔

② ختنہ کرنا: حشفہ پر موجود جھلی کا کاٹنا ختنہ ہے۔ یہ عمل خصائل فطرت میں شامل ہے۔ اس کے لیے مناسب وقت بچپن کا زمانہ ہے کیونکہ اس وقت زخم جلد مندمل ہو جاتا ہے اور بچہ کامل احوال کے ساتھ بڑھتا اور جوان ہوتا ہے۔ ختنہ کروانے میں بہت سی حکمتیں اور فوائد مضمر ہیں، ان میں سے اہم فائدہ یہ ہے کہ ختنے کی وجہ سے جھلی کا اندرونی حصہ ظاہر ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کے میل کچیل سے صاف رہتا ہے۔

③ مونچھیں کاٹنا اور خوب پست کرنا: مونچھیں کاٹنے اور خوب پست کرنے سے خوبصورتی اور نظافت پیدا ہوتی ہے۔ کفار کی مخالفت بھی ہو جاتی ہے جس کا ہمیں حکم اور تاکید ہے۔ مونچھیں کاٹنے اور خوب پست کرنے اور ڈاڑھی

① صحيح البخاري، الوضوء، باب السواك، حديث: 245، وصحيح مسلم، الطهارة، باب السواك، حديث: 255.

② مصنف نے اس بارے میں کوئی نص پیش نہیں کی اور مسواک اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے حصول کا سبب ہے، نیز اس کا شمار مستحسن کاموں میں ہوتا ہے، اس لیے مسواک کا استعمال دائیں ہاتھ سے کرنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

بڑھانے اور اسے سنوارنے کی رغبت میں متعدد احادیث آئی ہیں کیونکہ ڈاڑھی کے رکھنے میں مرد کا حسن و جمال اور اس کی مردانگی ظاہر ہوتی ہے۔ مقام افسوس ہے کہ اکثر لوگ حدیث کی مخالفت کے درپے ہیں، بڑی بڑی مونچھیں رکھ رہے ہیں، ڈاڑھیاں مونڈ رہے ہیں اور کاٹ رہے ہیں یا ٹھوڑیوں پر چند بال رکھ رہے ہیں، یہ سب کچھ سیرت نبوی کی کھلی مخالفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں کی تقلید ہے۔ ایسا شخص مردانہ خوبیوں اور بلندیوں سے اتر کر نسوانی علامات اور پستیوں کو اختیار کرتا ہے۔ ان لوگوں ہی پر شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے:

يُقْضٰى عَلَى الْمَرْءِ فِي أَيَّامِ مِحْنَتِهِ   حَتّٰى يَرٰى حَسَنًا مَّا لَيْسَ بِالْحَسَنِ

علامہ اقبال کی زبان میں اس شعر کا ترجمہ یوں ہے:

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ایک اور شاعر نے یوں کہا ہے:

وَلَا عَجَبٌ أَنَّ النِّسَاءَ تَرَجَّلَتْ   وَلٰكِنَّ تَأْنِيثَ الرِّجَالِ عَجِيبُ

''یہ بات عجیب نہیں کہ عورتیں مرد بن گئی ہیں لیکن مردوں کا عورتیں بن جانا تعجب خیز ہے۔''

④ ناخن تراشنا: خصائل فطرت میں سے ایک خصلت ناخن تراشنا ہے، بڑھانا نہیں۔ یہ عمل جسمانی صفائی میں شامل ہے۔ ناخنوں کو تراشنے سے ان کے نیچے جما ہوا میل کچیل دور ہو جاتا ہے، درندوں اور حیوانوں کے ساتھ مشابہت سے اجتناب ہوتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ ہپی ازم کے دلدادہ منچلے نوجوان اور شوخ لڑکیاں لمبے لمبے ناخن رکھتے ہیں جو کہ فطری خصلتوں کی مخالفت ہے، سیرت نبوی سے اعراض ہے اور جاہلوں کی تقلید ہے۔

⑤ بغلوں کے بال اکھیڑنا: بغلوں کے بال اکھیڑنا مسنون ہے، تاہم مونڈنا یا کسی پاؤڈر سے صاف کرنا بھی جائز ہے کیونکہ ان بالوں کے اتارنے سے مقصود نظافت وصفائی ہے، اس طرح وہ بدبو بھی ختم ہو جاتی ہے جو ان بالوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اے مسلمان! ہمارا دین اسلام ان تمام مذکورہ خصائل و اوصاف کو مشروع قرار دیتا ہے کیونکہ ان میں ایک مسلمان کے لیے حسن و جمال، خود کو پاک صاف کرنا ہے اور مشرکین کی مخالفت بھی ہے بلکہ ان اوصاف فطرت میں بعض امور ایسے ہیں جن سے مرد اور عورت میں امتیاز پیدا ہوتا ہے تاکہ ہر ایک صنف اپنے اپنے دائرۂ زندگی میں رہ کر اپنی مناسب شخصیت کو قائم رکھے۔ لیکن کئی فریب خوردہ اور ظالم انسان ان اوصاف فطرت کو عملاً قبول کرنے

سے انکار کر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی (ان احکام میں) مخالفت کر رہے ہیں اور ایسی درآمدی تہذیب کی تقلید کر رہے ہیں جو ہمارے دین اور اسلامی تشخص سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ان لوگوں نے بعض مغربی یا مشرقی رذیل شخصیتوں کو اپنا آئیڈیل بنالیا ہے، اعلیٰ چھوڑ کر ادنیٰ کو پسند کر لیا ہے بلکہ طیب و کامل سے صرف نظر کر کے خبیث اور ناقص صورت پر اکتفا کر بیٹھے ہیں۔ یوں انھوں نے اپنے آپ پر اور مسلم معاشرے پر ظلم کر کے ایک قبیح چیز کو رواج دیا۔ یہ لوگ اپنے گناہوں اور ان لوگوں کے گناہوں کے ذمہ دار بن گئے جو ان کی روش پر چلیں گے اور ان کے قدم پر قدم رکھیں گے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ.

اے اللہ! مسلمانوں کو اپنے اعمال و اقوال کی اصلاح کی توفیق دے، انھیں اخلاص اور اتباع سنت کی دولت سے مالا مال فرما دے۔ (آمین)

وضو کے احکام

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾

”اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو، اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔“[1]

اس آیت کریمہ میں نماز کے لیے وضو کو فرض قرار دیا گیا ہے اور ان اعضاء کا تذکرہ ہے جن کا وضو میں دھونا یا مسح کرنا فرض ہے، نیز آیت میں اعضائے وضو کے مقامات کی حد بندی کر دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے وضو کا مکمل طریقہ وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔

وضو کی شرائط، فرائض اور سنن ہیں۔ شرائط و فرائض کی حتی الامکان ادائیگی صحت وضو کے لیے لازمی ہے۔ سنن سے وضو کی تکمیل ہوتی ہے، اجر زیادہ ملتا ہے، البتہ کسی سنت کے ترک کر دینے سے صحت وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔[2]

---

[1] المآئدۃ 6:5.

[2] رسول اللہ ﷺ نے وضو میں جو عمل کیا ہے وہ وضو کا حصہ ہے جس کے ترک کر دینے سے سنت نبوی کے مطابق وضو نہ ہوگا۔ (صارم)

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

شرائط وضو صحت وضو کے لیے درج ذیل شرائط ہیں: اسلام، عقل، تمیز اور نیت۔ بنا بریں کافر، مجنون اور کم سن بچے (جنھیں شعور نہ ہو) کا وضو صحیح نہ ہوگا، اسی طرح جس وضو میں ''نیت'' شامل نہ ہو وہ وضو بھی صحیح نہیں ہوتا، مثلاً: کسی شخص نے وضو کے اعضاء کو پانی سے ٹھنڈک حاصل کرنے کی نیت سے دھویا یا اس کا مقصد ان اعضاء پر لگی ہوئی نجاست یا میل کچیل دور کرنا تھا تو ایسے شخص کا یہ عمل ''وضو'' قرار نہ پائے گا۔

- وضو کے پانی کا پاک ہونا شرط ہے، ناپاک پانی سے وضو نہیں ہوتا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ صحت وضو کے لیے پانی کا مباح ہونا بھی شرط ہے، اگر کسی نے ایسے پانی سے وضو کیا جو کسی سے چھین کر حاصل کیا گیا یا کسی اور غیر شرعی طور سے حاصل کیا گیا تو ایسے شخص کا وضو درست اور صحیح نہ ہوگا۔
- وضو سے پہلے (اگر قضائے حاجت سے فارغ ہوا ہو تو) استنجا کرنا یا مٹی کا استعمال بھی صحت وضو کے لیے ایک شرط ہے جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔
- وضو کی صحت اور درست ہونے کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہر اس چیز کو اتار دیا جائے جس کی وجہ سے عضو کی جلد تک پانی نہ پہنچ سکتا ہو۔ وضو کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اعضاء پر لگی ہوئی مٹی، آٹا، موم اور جما ہوا میل کچیل یا تہہ دار رنگ (ناخن پالش وغیرہ) اتار دے تاکہ وضو کا پانی بغیر کسی رکاوٹ کے عضو کی جلد تک پہنچ جائے۔

وضو کے فرائض وضو کے فرائض (ارکان) چھ ہیں جو درج ذیل ہیں:

- مکمل چہرہ دھونا: اس میں کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا بھی شامل ہے۔ جس شخص نے چہرہ دھو لیا لیکن کلی نہ کی، ناک میں پانی نہ ڈالا یا ان دونوں میں سے ایک کام چھوڑ دیا تو اس کا وضو درست اور صحیح نہ ہوگا کیونکہ منہ اور ناک دونوں چہرے کا حصہ ہیں جنھیں دھونے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ﴾ ''سو اپنے چہرے دھوو۔''[1]

جس شخص نے چہرے کا کوئی حصہ بھی (دھوتے وقت) چھوڑ دیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ وضو کرتے وقت کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے تھے۔

- ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] المآئدة 6:5.

﴿وَ اَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ﴾ ”اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو۔“①

ایک روایت میں اس کی صراحت یوں ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ أَدَارَ الْمَاءَ عَلٰى مِرْفَقَيْهِ»

”رسول اللہ ﷺ وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر پانی بہاتے۔“②

ایک دوسری روایت میں ہے:

«ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى حَتّٰى أَشْرَعَ فِي الْعَضُدِ، ثُمَّ يَدَهُ الْيُسْرٰى حَتّٰى أَشْرَعَ فِي الْعَضُدِ»

”پھر انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ دھویا حتیٰ کہ کہنی سے اوپر والا کچھ حصہ دھویا اور بایاں ہاتھ دھویا حتیٰ کہ کہنی سے اوپر والا کچھ حصہ دھویا۔“③

یہ روایتیں اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ کہنیاں، دھوئے جانے والے حصے میں شامل ہیں۔

◄ سارے سر کا مسح کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿وَ امۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ﴾ ”اور اپنے سروں کا مسح کرو۔“④

مکمل سر میں کان بھی شامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْأُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ» ”دونوں کان سر کا حصہ ہیں۔“⑤

بنابریں سر کے بعض حصے کا مسح کرنا کافی نہیں۔

◄ پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھونا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اَرۡجُلَکُمۡ اِلَی الۡکَعۡبَیۡنِ﴾ ”اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔“⑥

آیت میں ”إلی“ کا معنی ”مع“ ہے۔ اس کی شہادت ان احادیث سے ملتی ہے جن میں وضو کی تفصیل بیان ہوئی ہے، یعنی یہ روایات اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ ”ٹخنے“ اس حصے میں شامل ہیں جس کے دھونے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

① المآئدة 6:5. ② السنن الكبرى للبيهقي: 1/56، وسلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، حديث: 2067.

③ صحيح مسلم، الطهارة، باب استحباب إطالة الغرة والتحجيل في الوضوء، حديث: 246. ④ المآئدة 6:5.

⑤ سنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب الأذنان من الرأس، حديث: 443-445، وسنن الدارقطني: 1/96-98.

⑥ المآئدة 6:5.

◄ ترتیب۔ وضو کرنے والا شخص پہلے چہرہ دھوئے، پھر دونوں ہاتھ، پھر سر کا مسح کرے اور آخر میں پاؤں دھوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیتِ وضو "اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو، اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔" میں وضو کو ترتیب سے بیان کیا ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے اسی قرآنی ترتیب کے مطابق وضو کیا۔ اور فرمایا:

«هٰذَا وُضُوءُ مَنْ لَّا يَقْبَلُ اللهُ مِنْهُ صَلَاةً إِلَّا بِهِ»

"یہ اس شخص کا وضو ہے جس کے بغیر اللہ اس کی نماز قبول نہیں کرتا۔"[1]

◄ اعضاء کا پے در پے دھونا۔ وضو کرنے والا "اعضائے وضو" کو پے در پے، لگاتار دھوئے۔ ایک عضو کو دھو کر کچھ وقفے کے بعد دوسرا عضو دھونا درست اور صحیح نہیں، لہٰذا پوری کوشش کی جائے کہ وضو کے اعضاء یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ دھوئے جائیں۔

یہ وضو کے وہ فرائض ہیں جن کی ادائیگی اس طریقہ کے مطابق کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے (اور جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے واضح کیا ہے)۔

◄ ابتدائے وضو میں تسمیہ (بسم اللہ پڑھنے) کے وجوب یا عدم وجوب میں علمائے کرام میں اختلاف ہے، البتہ سب کے نزدیک تسمیہ مشروع ہے، جس کا ترک درست نہیں۔ تسمیہ کے کلمات "بسم اللہ" ہیں اور اگر کسی نے الرحمٰن الرحیم کے الفاظ بھی بڑھائے تو کوئی حرج نہیں۔ [و اللہ أعلم.][2]

◄ آیت وضو میں چار اعضاء کے دھونے کا جو حکم ہے، اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بدن کے یہ اعضاء گناہ کے ارتکاب میں اکثر استعمال ہوتے ہیں، وضو سے ظاہری صفائی و طہارت کے ساتھ ساتھ ان اعضاء کی باطنی صفائی بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک مسلمان جب (وضو کرتے وقت) کسی عضو کو دھوتا ہے تو اس عضو کی ہر خطا (جس کا اس نے ارتکاب کیا ہو) وضو کے پانی سے یا اس کے آخری قطروں سے معاف ہو جاتی ہے۔[3]

◄ ان اعضاء کو دھونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے "کلمات شہادت" کے ذریعے سے تجدید ایمان کی راہنمائی فرمائی ہے تاکہ ظاہری اور باطنی طہارت دونوں یکجا ہو جائیں۔ ظاہری طہارت کا حصول اس وقت ہو گا جب

① [ضعيف] سنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب ما جاء في الوضوء مرة و مرتين وثلا ثًا، حديث: 419، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 80/1. ② بسم اللہ پر اکتفا کرنا ہی راجح ہے۔ (ع۔و) ③ هذا معنى الحديث والأصل عند مسلم وغيره، صحيح مسلم، الطهارة، باب خروج الخطايا مع ماء الوضوء، حديث: 244، والموطأ للإمام مالك: 32/1، حديث: 31.

اعضاء کو آیت وضو کے مطابق دھو لیا جائے گا اور باطنی طہارت تب حاصل ہو گی جب وہ کلمہ شہادت پڑھے گا جو انسان کو شرک و کفر سے پاک کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت وضو کے آخر میں اسی مضمون کو یوں بیان فرمایا ہے:

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝﴾

''اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی ڈالنا نہیں چاہتا، بلکہ اس کا ارادہ تمھیں پاک کرنے کا اور تمھیں اپنی بھرپور نعمت دینے کا ہے تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے تمھیں وضو کا حکم دیا تاکہ وہ تمھاری خطاؤں کو معاف کرے اور اپنے فضل و انعام کا اتمام کر دے۔ ''آیت وضو'' کے ابتدائی حصے پر غور فرمایئے! اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو کس طرح خوبصورت انداز میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان والے ہی اللہ تعالیٰ کے احکام سنتے اور بجا لاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَلَا يُحَافِظُ عَلَى الْوُضُوءِ إِلَّا مُؤْمِنٌ» ''وضو کی حفاظت صرف مومن ہی کرتا ہے۔''[2]

وضو کے مستحبات: وضو کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا جا چکا ہے اس کے علاوہ باقی کام ''مستحب'' ہیں جن کی حیثیت و درجہ یہ ہے کہ وہ کام کرے گا تو اجر پائے گا اور اگر چھوڑ دے گا تو گناہ گار نہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے ان اعمال کو ''سنن الوضوء'' کا نام دیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:

- مسواک کرنا: مسواک کی اہمیت، فضیلت اور کیفیت پر بحث گزر چکی ہے۔ یاد رکھیے مسواک کا مقام و محل کلی کرنے کے وقت ہے تاکہ مسواک اور کلی دونوں سے منہ اچھی طرح صاف ہو جائے اور نمازی عبادت، تلاوت اور اللہ تعالیٰ سے مناجات کے لیے تیار ہو جائے۔
- چہرہ دھونے سے پہلے ابتدائے وضو میں ہاتھوں کو تین مرتبہ دھونا بھی مستحب ہے۔ اس بارے میں کئی ایک احادیث وارد ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ اعضائے وضو تک پانی پہنچانے کا آلہ دونوں ہاتھ ہی ہیں تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مکمل وضو سے پہلے ان کو اچھی طرح دھو کر صاف کر لیا جائے۔
- کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کا عمل چہرہ دھونے سے پہلے انجام دینا وضو کے مستحبات میں سے ہے کیونکہ احادیث میں ان کا ذکر موجود ہے۔ اگر انسان روزے کی حالت میں نہ ہو تو ان دونوں میں مبالغے سے کام لے، یعنی

---

[1] المآئدة 5:6. [2] سنن ابن ماجه، الطهارة و سننها، باب المحافظة على الوضوء، حديث :277-279.

کلی کرتے وقت سارے منہ میں پانی کو خوب پھرائے اور گھمائے اور ناک میں پانی ڈالتے وقت سانس کے ذریعے ناک کے بلند حصے تک پانی کو کھینچے۔[1]

- ڈاڑھی گھنی ہونے کی صورت میں اس کا خلال کرنا مسنون ہے۔[2]

اسی طرح ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال بھی مستحب ہے۔

- دائیں جانب سے ابتدا کرنا: ہاتھوں اور پاؤں کو دھوتے وقت بائیں اعضاء کی بجائے دائیں اعضاء پہلے دھوئے جائیں۔

- چہرہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کو ایک بار سے زیادہ، یعنی دو دو یا تین تین بار دھونا بھی مستحب ہے۔

میرے بھائی! یہ وضو کی شرائط، فرائض اور سنن ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ انھیں سیکھ لیں اور وضو کرتے وقت انھیں ملحوظ رکھیں تا کہ آپ کا وضو احکام شرعیہ کے مطابق ہو اور اجر کے حصول کا ذریعہ ہو۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم نافع اور عمل صالح نصیب فرمائے۔ (آمین)

وضو کا مفصل طریقہ

آپ گزشتہ صفحات میں وضو کی شرائط، فرائض اور سنن کا بیان پڑھ چکے ہیں۔ اب ہم انھی نصوص شرعیہ کی روشنی میں مکمل وضو تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے تا کہ آپ کا عمل اس کے مطابق ہو۔

وضو کرنے والا اولاً وضو کی نیت کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نماز وغیرہ کے لیے وضو کر رہا ہے۔ پھر بسم اللہ پڑھے۔ پھر اپنے ہاتھوں کو تین بار دھوئے۔ پھر تین بار کلی کرے اور ناک میں تین بار پانی کھینچے، بائیں ہاتھ سے ناک جھاڑے۔ پھر تین بار چہرہ دھوئے، لمبائی میں چہرے کی حد پیشانی کے اوپر والے حصے (جہاں سر کے بال شروع ہوتے ہیں) سے لے کر ٹھوڑی تک ہے۔ ڈاڑھی کے بال چہرے کا حصہ ہیں، جن کا دھونا فرض ہے۔ ڈاڑھی مختصر ہے تو اس کو اوپر اور اندر سے دھونا ضروری ہے۔ اگر ڈاڑھی لمبی اور ایسی گھنی ہے کہ اس کے نیچے والی جسمانی جلد نظر نہیں آتی تو صرف ڈاڑھی کے باہر والے حصے کو دھو لیا جائے اور اندرونی حصے کا خلال کر لیا جائے، جس کا

---

[1] صحت وضو کے لیے ناک جھاڑنا بھی ضروری ہے کیونکہ یہ عمل بھی رسول اللہ ﷺ کے وضو کا ایک حصہ تھا۔ (صارم)

[2] داڑھی کے خلال کا طریقہ یہ ہے کہ چلو میں پانی لے کر داڑھی کے نیچے اندر داخل کرے۔ اور ہاتھ کی انگلیوں سے داڑھی کا خلال کر لے۔ (صارم)

طریقہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ چہرے کی چوڑائی کی حد ایک کان سے دوسرے کان تک ہے۔ کان سر کا حصہ ہیں ان پر سر کی طرح مسح کرے۔

پھر اپنے ہاتھوں کو ناخنوں سے لے کر کہنیوں سمیت تین بار دھوئے۔ اگر اس کے ہاتھوں پر آٹا، مٹی یا ناخن پالش وغیرہ لگی ہو تو اسے اتارے تاکہ پانی اعضاء کی جلد تک پہنچ جائے۔

پھر نیا پانی لے کر پورے سر کا اور دونوں کانوں کا ایک بار مسح کرے۔ مسح کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو پانی سے تر کر کے انھیں سر کے ابتدائی حصے پر رکھے، پھر انھیں سر پر گزار کر گدی تک لے جائے، پھر ان ہاتھوں کو اسی طرح اس جگہ پر واپس لے آئے جہاں سے مسح شروع کیا تھا۔ پھر دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں کو کانوں کے سوراخوں میں داخل کرے اور کانوں کے اندر والے حصے میں پھیرے جب کہ انگوٹھوں کے ساتھ کانوں کے پچھلے حصے پر مسح کرے۔ پھر دونوں پاؤں کو (پہلے دایاں پھر بایاں) ٹخنوں تک تین بار دھوئے۔

اگر کسی شخص کا ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا ہو تو وہ ہاتھ یا پاؤں کا باقی حصہ دھو لے۔ اور اگر اس کا ہاتھ کہنی تک کٹا ہوا ہے تو بازو کا اگلا حصہ دھو لے۔ اسی طرح اگر کسی کا پاؤں ٹخنے تک کٹ چکا ہے تو وہ پنڈلی کا ابتدائی حصہ دھو لے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''سو اللہ تعالیٰ سے حسب طاقت ڈرو۔''[1]

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

''جب میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو حسبِ طاقت اس پر عمل کرو۔''[2]

بنا بریں ایسا معذور شخص جب فرض کردہ عضو کے بقیہ حصے کو دھو لے گا تو اس نے حسب طاقت حکم پر عمل کر لیا۔

▲ وضو کرنے کے بعد آسمان کی طرف نگاہ اٹھائے[3] اور اس حال میں وہ تمام دعائیں پڑھے جو رسول اللہ ﷺ سے منقول اور ثابت ہیں، وہ یہ ہیں:

① التغابن 16:64. ② صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، حديث: 7288، وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، حديث: 1337، ومسند أحمد :258/2.

③ [ضعیف] اس روایت کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ سنن أبي داود، الطهارة، باب ما يقول الرجل إذا توضأ؟، حديث: 170.

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ»

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔''①

«اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ»

''اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں میں سے بنادے اور پاکیزگی حاصل کرنے والوں میں سے بنادے۔''②

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ»

''اے اللہ! تو پاک ہے اپنی تعریفوں کے ساتھ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں اور تیری طرف ہی توبہ کرتا ہوں۔''③

وضو کے بعد مذکورہ بالا ذکر اور دعا پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ وضو سے ظاہری طہارت حاصل ہوئی جب کہ توحید اور توبہ سے باطنی طہارت میسر آئی۔ اس طرح ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی عظیم طہارتیں جمع ہو گئیں اور بندہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونے کے قابل ہو گیا۔ یہ صورت حال کس قدر مناسب اور خوب تر ہے۔

▲ اگر کوئی شخص وضو کر کے اپنے اعضاء کو کسی صاف ستھرے تولیے وغیرہ سے پونچھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

تنبیہ: اچھی طرح اور مکمل وضو کرنا (جس میں کوئی عضو خشک نہ رہ جائے) فرض ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے قدم کا ناخن برابر حصہ خشک رہ گیا ہے تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا:

«اِرْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوءَكَ» ''تم واپس جا کر اچھی طرح دوبارہ وضو کرو۔''④

ایک اور روایت میں ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى رَجُلاً يُصَلِّي وَفِي ظَهْرِ قَدَمِهِ لُمْعَةٌ قَدْرَ الدِّرْهَمِ لَمْ يُصِبْهَا

---

① صحيح مسلم، الطهارة، باب الذكر المستحب عقب الوضوء، حديث: 234، وجامع الترمذي، الطهارة، باب في مايقال بعد الوضوء، حديث: 55. ② جامع الترمذي، الطهارة، باب في ما يقال بعد الوضوء، حديث: 55. ③ السنن الكبرى للنسائي، عمل اليوم والليلة، باب ما يقول إذا فرغ من وضوئه؟: 25/6، حديث: 9909، والمستدرك للحاكم: 564/1، حديث: 2072، وسلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني، حديث: 2651. ④ صحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب استيعاب جميع أجزاء محل الطهارة، حديث: 243، وسنن أبي داود، الطهارة، باب تفريق الوضوء، حديث: 173.

الْمَاءُ فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يُعِيدَ الْوُضُوءَ وَالصَّلَاةَ»

''رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ اس کے قدم کا درہم بھر حصہ (وضو کا پانی نہ لگنے کی وجہ سے) خشک رہ گیا ہے تو آپ ﷺ نے اسے وضو اور نماز دونوں کو دہرانے کا حکم دیا۔''①

اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ» ''(خشک رہ جانے والی) ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔''②

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ذمہ داری کی ادائیگی میں سستی واقع ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایڑیوں کا ایک حصہ خشک رہ گیا تو اسی بنا پر ایڑیوں کو عذاب ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهَا لَا تَتِمُّ صَلَاةُ أَحَدِكُمْ حَتَّى يُسْبِغَ الْوُضُوءَ كَمَا أَمَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فَيَغْسِلُ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ وَيَمْسَحُ بِرَأْسِهِ وَرِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ»

''کسی شخص کی نماز تب تک کامل نہ ہوگی جب تک وہ اللہ کے حکم کے مطابق مکمل وضو نہ کرے گا۔ وہ اپنا چہرہ دھوئے، کہنیوں تک بازو دھوئے اور سر کا مسح کرے پھر ٹخنوں تک پاؤں دھوئے۔''③

▲ میرے مسلمان بھائی! کامل اور اچھی طرح وضو کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ پانی ضرورت سے زیادہ استعمال کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر عضو پر مناسب حد تک بہایا جائے حتیٰ کہ وہ خوب صاف ہو جائے۔ بلا ضرورت کثرت سے پانی کا استعمال اسراف ہے جس سے منع کیا گیا ہے بلکہ کبھی پانی کے کثرت استعمال کے باوجود مطلوبہ طہارت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر قلیل پانی سے مکمل وضو ہو جائے تو یہ کافی ہے۔ ایک روایت میں ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلٰى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ»

''نبیٔ کریم ﷺ ایک مد پانی سے وضو اور ایک صاع سے لے کر پانچ مد تک پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے۔''④

پانی کے استعمال میں اسراف (فضول خرچی) سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

---

① سنن أبي داود، الطهارة، باب تفريق الوضوء، حديث: 175. ② صحيح البخاري، الوضوء، باب غسل الأعقاب، حديث: 165، وصحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب غسل الرجلين بكمالهما، حديث: 242. ③ سنن أبي داود، الصلاة، باب صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع و السجود، حديث: 858. ④ صحيح البخاري، الوضوء، باب الوضوء بالمد، حديث: 201، وصحيح مسلم، الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة......، حديث: 325 واللفظ له. ایک صاع چار مد کا ہوتا ہے اور ایک مد کا وزن 625 گرام ہے اور بعض علماء کے نزدیک 525 گرام ہے (صارم)۔

ایک روایت میں ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَرَّ بِسَعْدٍ وَّهُوَ يَتَوَضَّأُ، فَقَالَ: مَا هٰذَا السَّرَفُ؟ فَقَالَ: أَفِي الْوُضُوءِ إِسْرَافٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، وَإِنْ كُنْتَ عَلٰى نَهْرٍ جَارٍ»

''سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے پاس سے نبی ﷺ کا گزر ہوا اور وہ وضو کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے دیکھا اور فرمایا: پانی میں اس قدر اسراف کیوں؟ تو انھوں نے کہا: کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، اگرچہ تم بہتے ہوئے دریا پر ہو۔''[1]

ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے یوں خبر دی ہے: ''میری امت میں سے کچھ لوگ طہارت کی بابت حد سے تجاوز کریں گے۔''[2]

نیز نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ لِلْوُضُوءِ شَيْطَانًا يُقَالُ لَهُ الْوَلَهَانُ، فَاتَّقُوا وَسْوَاسَ الْمَاءِ»

''وضو کے لیے ایک شیطان ہے جسے ولہان کہا جاتا ہے، لہٰذا تم پانی کے بارے میں وسوسوں سے بچو۔''[3]

پانی کے استعمال میں اسراف سے فائدہ ہونے کی بجائے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

- کبھی پانی کی کثرت پر اعتماد ہوتا ہے اور اس طرف توجہ اس قدر ہوتی ہے کہ یہ خیال نہیں رہتا کہ پانی اعضاء کے تمام حصوں تک پہنچ پایا ہے یا نہیں بلکہ بسا اوقات پانی عضو کے مکمل حصے تک پہنچ نہیں پاتا، اس بنا پر اس کا وضو ناقص ہوتا ہے اور وہ طہارت کے بغیر ہی نماز ادا کرتا ہے۔
- وضو میں پانی کے کثرت استعمال (اسراف) سے عبادت میں غلو کا اندیشہ ہے کیونکہ وضو عبادت ہے اور جب عبادت میں غلو آ جائے تو خرابی اور فساد لازم آتا ہے۔
- پانی کے بے جا استعمال کے سبب طہارت سے متعلق وسوسے (شکوک وشبہات) پیدا ہوتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں مکمل بھلائی اور خیر ہے۔ اس کے علاوہ امور بدعات ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام

① [ضعيف] سنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب ما جاء في القصد في الوضوء ......، حديث: 425 ومسند أحمد: 221/2. اس معنی میں اگلی حدیث صحیح ہے۔ ② سنن أبي داود، الطهارة، باب الإسراف في الوضوء، حديث: 96. ③ [ضعيف] جامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء في كراهية الإسراف في الوضوء بالماء، حديث: 57، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب ما جاء في القصد في الوضوء......، حديث: 421.

مسلمانوں کو ہر اس عمل کی توفیق دے جو اسے محبوب اور پسند ہو۔

اے مسلمان بھائی! آپ کی کوشش ہونی چاہیے کہ وضو اور عبادات کی ادائیگی مسنون طریقے سے افراط وتفریط سے دور رہتے ہوئے ہو کیونکہ یہ دونوں چیزیں قابل مذمت ہیں۔ بہتر کام میانہ روی ہے۔ عبادت میں سستی سے نقص پیدا ہوتا ہے جب کہ انتہا پسند (اسراف کرنے والا) ایسی زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے جو دین میں شامل نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی کرنے والا ہی صحیح طریقے سے عبادات کا حق ادا کرتا ہے۔

اے اللہ! ہمیں حق کو حق کی شکل میں دکھا اور اس کی اتباع کی توفیق دے اور باطل کو باطل کی صورت میں سامنے لا اور اس سے اجتناب کی ہمت دے، ایسا نہ ہو کہ باطل ہم پر واضح نہ ہو سکے اور ہم اس میں پڑ کر گمراہ ہو جائیں۔ (آمین)

موزوں اور جرابوں وغیرہ پر مسح کرنے کا حکم

ہمارا دین، آسان دین ہے، مشکل ومشقت والا دین نہیں، اس کے احکام ایسے ہیں جو حالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مصلحت کے قریب تر اور مشقت سے دور تر ہیں۔ ان میں کچھ احکام وضو سے متعلق بھی ہیں۔

جب کسی مسلمان نے اعضائے وضو پر ایسی چیز پہنی یا باندھی ہو جس کی اسے شدید ضرورت ہو اور اس کے اتارنے میں مشکل ہو، مثلاً: پاؤں کی حفاظت کے لیے موزے یا جرابیں، سر کی حفاظت کے لیے پگڑی یا کسی زخم کو خرابی سے بچانے کے لیے پٹی باندھی ہو تو ایسی حالت میں شارع علیہ السلام نے اسے وہ چیز اتار کر عضو وضو کو دھونے کی زحمت نہیں دی بلکہ اسے اس پر مسح کرنے کی رخصت دی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں پر تخفیف اور آسانی ہے اور مشقت سے بچاؤ ہے۔

اگر کسی مقیم یا مسافر شخص نے موزے یا جرابیں پہنی ہوں تو انھیں اتار کر پاؤں کو دھونے کی بجائے ان پر مسح کرنا صحیح اور مرفوع روایات سے ثابت ہے جو درجۂ تواتر تک پہنچتی ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''مجھے ستر (70) کے قریب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ موزوں پر مسح کرتے تھے۔''[1]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''موزوں پر مسح کی احادیث بہت سارے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں۔''[2]

① الأوسط لا بن المنذر :1/430، و1/433، و شرح مسلم للنووي: 3/210. ② شرح مسلم للنووي : 3/210.

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ موزوں پر مسح کے بارے میں میرے دل میں ذرہ بھر بھی شک وشبہ نہیں، اس سے متعلق میرے علم کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے چالیس احادیث ہیں۔''[1]

امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:

''موزوں پر مسح کے جواز میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔''[2]

امام ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ نے موزوں پر مسح کے جواز میں علمائے امت کا اجماع نقل کیا ہے۔[3]

علاوہ ازیں اہلِ سنت کا اس مسئلے پر اتفاق ہے۔ ماسوائے اہلِ بدعت کی ایک قلیل جماعت کے، وہ اس کے جواز کے قائل نہیں۔

موزوں پر مسح کا حکم ''رخصت'' کا ہے۔ موزوں کو اتار کر پاؤں دھونے سے بہتر یہ ہے کہ ان پر مسح کیا جائے اس میں اللہ تعالیٰ کی رخصت کو قبول کرنا ہے اور نبی ﷺ کی اقتدا اور پیروی ہے، نیز بدعتی گروہ (منکرین مسح) کی مخالفت بھی ہے (جو ہونی چاہیے۔)

جن اعضاء پر موزے، جرابیں، پگڑی اور پٹی وغیرہ بندھی ہو مسح کرنے سے وہ دھونے کے حکم میں ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تکلف سے کام نہیں لیتے تھے، قدموں کی جیسی حالت ہوتی ویسا ہی کام کر لیتے تھے، یعنی اگر موزے یا جرابیں پہنی ہوتیں تو مسح کر لیتے ورنہ پاؤں دھو لیتے تھے، صرف مسح کی خاطر موزے یا جرابیں پہننا درست نہیں۔[4]

اگر کوئی شخص مقیم ہو یا وہ مسافر ہو جس کا سفر اس قدر ہو جس میں نماز قصر کرنی جائز نہیں تو اس کی مدت مسح ایک دن رات ہے۔ اور اگر اس کا سفر اتنا ہو کہ اس میں نماز قصر کرنا جائز ہے تو اس کی مدت مسح تین دن اور تین راتیں ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لِلْمُسَافِرِ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ وَّلَيَالِيهِنَّ وَلِلْمُقِيمِ يَوْمٌ وَّلَيْلَةٌ»

''مسافر کے لیے مدت مسح تین دن اور ان کی راتیں ہے، جب کہ مقیم کے لیے ایک دن رات ہے۔''[5]

▪ کوئی شخص مقیم ہو یا مسافر دونوں حالتوں میں مدت مسح اس وقت شروع ہوگی جب موزے یا جرابیں پہننے کے بعد حدث (وضو کا ٹوٹنا) واقع ہوگا کیونکہ حدث ہی موجب وضو ہے، نیز مسح کا جواز حالت حدث سے شروع ہو جاتا

① المغني والشرح الكبير: 316/1. ② الأوسط لابن المنذر: 434/1، وفتح الباري: 305/1. ③ الأوسط لابن المنذر: 434/1. ④ اس کی کوئی دلیل نہیں، لہٰذا ایسا کرنے میں حرج نہیں۔ ⑤ صحيح مسلم، الطهارة، باب التوقيت في المسح على الخفين، حديث: 276، ومسند أحمد: 96/1 واللفظ له.

ہے، لہٰذا مدت مسح کی ابتدا جوازِ مسح کے ابتدائی وقت سے ہو جاتی ہے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ مدت مسح اس وقت شروع ہوتی ہے جب حدث کے بعد مسح کیا جائے گا۔

موزوں اور جرابوں پر مسح کی شرائط

▲ موزوں یا جرابوں وغیرہ پر مسح کرنا تب جائز ہے جب انھیں باوضو ہو کر پہنا ہو۔ صحیحین میں روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا، جب انھوں نے آپ ﷺ کے موزے اتارنے کا ارادہ کیا: ''رہنے دیں کیونکہ میں نے انھیں وضو کی حالت میں پہنا تھا۔''[1]

ایک دوسری روایت میں ہے:

«أَمَرَنَا أَنْ نَّمْسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ إِذَا نَحْنُ أَدْخَلْنَاهُمَا عَلٰى طُهْرٍ»

''آپ ﷺ نے ہمیں (صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو) حکم دیا کہ موزوں پر مسح تب کرنا جب انھیں وضو کر کے پہنا ہو۔''[2]

ان دلائل سے واضح ہوا کہ موزے یا جرابیں پہنتے وقت وضو کا ہونا شرط ہے۔ اگر کسی نے وضو کیے بغیر موزے یا جرابیں پہن لیے تو ان پر مسح کرنا جائز نہ ہوگا۔

▲ پہنے ہوئے موزے یا جرابیں مباح ہوں، اگر کسی سے چھین کر یا چوری کر کے حاصل کیے ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح اگر کسی مرد نے ریشم کے موزے یا جرابیں پہنے ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز نہیں کیونکہ حرام میں ''رخصت'' کا استعمال ناجائز ہے۔

▲ مسح کی ایک شرط یہ ہے کہ موزے یا جرابیں پاؤں کے اس حصے کو مکمل طور پر ڈھانپتے ہوں جن کا دھونا بحکم الٰہی فرض ہے ورنہ مسح کرنا درست نہیں۔

▲ جرابیں، موزوں کے قائم مقام ہیں، ان پر مسح کرنا تب جائز ہے جب وہ اون وغیرہ کی بنی ہوں اور اس قدر موٹی ہوں کہ ان کے نیچے سے پاؤں کی جلد نظر نہ آتی ہو۔ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے جرابوں پر اور جوتوں پر مسح کیا تھا۔[3]

---

① صحيح البخاري، الوضوء، باب إذا أدخل رجليه وهما طاهرتان، حديث : 206، وصحيح مسلم، الطهارة، باب المسح على الخفين، حديث : 274. ② مسند أحمد : 240/4 وأصل الحديث عندالترمذي والنسائي وابن ماجه بالاختصار. ③ سنن أبي داود، الطهارة، باب المسح على الجوربين، حديث:159، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ◄◄

جرابوں پر مسح کرنے کی مدت بھی وہی ہے جو موزوں کی ہے۔ جرابوں پر مسح کرنے کے لیے ان پر جوتوں کا پہننا ضروری نہیں۔ اگر جرابوں پر مسح کر کے مدت مسح کی ابتدا ہوگئی، پھر ان کے اوپر کوئی شے موزے وغیرہ پہن لیے تو ان کے بار بار اتارنے یا پہننے سے جرابوں کے مسح کی مدت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔

◣ پگڑی پر مسح کرنا: پگڑی پر مسح کرنے کی دو شرطیں ہیں: ① پگڑی سر کے اس حصے کو مکمل طور پر ڈھانپتی ہو جسے عام طور پر ننگا نہیں رکھا جاتا۔ ② پگڑی ٹھوڑی کے نیچے سے گزاری گئی ہو۔ (یہ اس شکل میں ہوگا جب پگڑی کے ایک یا دو بل ٹھوڑی کے نیچے سے بھی گزارے گئے ہوں) یا اس کا ایک کنارہ پیچھے کمر پر لٹکایا گیا ہو۔[1]

پگڑی پر مسح کے بارے میں ائمہ حدیث نے نبی ﷺ سے متعدد احادیث نقل کی ہیں۔[2]

علاوہ ازیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو شخص پگڑی پر مسح کرنے کی صورت میں وضو کو مکمل نہیں سمجھتا اللہ اسے پاک نہ کرے۔''

حدث اصغر (وضو ٹوٹ جانے) کی حالت میں وضو کرتے وقت موزوں اور پگڑی پر مسح جائز ہے، البتہ حدث اکبر (جنابت) کی حالت میں ان پر مسح کرنا صحیح اور درست نہیں بلکہ انھیں اتار کر ان حصوں کو اور سارے بدن کو (غسل جنابت کر کے) دھونا ہوگا۔

◣ پٹی پر مسح کرنا: جسم کی کسی ٹوٹی ہوئی ہڈی یا جوڑ پر علاج کی خاطر باندھی ہوئی لکڑیوں (پھٹیوں) پر مسح کرنا جائز ہے۔ اسی طرح زخموں پر لگے ہوئے مرہم یا ان پر باندھی ہوئی پٹیوں یا پلاسٹر پر مسح کرنا درست ہے۔ اس میں مسح کے لیے شرط یہ ہے کہ لگی ہوئی شے متاثر جگہ پر ہو یا اس کے قریب قریب ہو اگر متاثر حصے سے زیادہ متجاوز ہے تو اسے اتارنا ہوگا اور وہ حصہ دھونا پڑے گا۔ نیز اس پر حدث اصغر یا اکبر دونوں حالتوں میں مسح کرنا جائز ہے اور اس کے لیے وقت کی کوئی حد بھی متعین نہیں۔ جب تک زخم درست نہ ہو تب تک مسح کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ مسح ایک

◂◂ ما جاء في المسح على الجوربين والنعلين، حديث: 99، وسنن ابن ماجه، الطهارة و سننها، باب ما جاء في المسح على الجوربين والنعلين، حديث: 559، ومسند أحمد: 252/4. صحیح روایت سے رسول اللہ ﷺ کا جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہوگیا۔ باقی رہا مسئلہ جرابوں کا باریک یا موٹا ہونا تو روایت میں اس کی کوئی وضاحت نہیں۔ والله أعلم. (صارم)

① مؤلف حفظہ اللہ نے ان دو شرطوں کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

② صحيح البخاري، الوضوء، باب المسح على الخفين، حديث: 205، وصحيح مسلم، الطهارة، باب المسح على الناصية والعمامة، حديث: (81-83)-274، وسنن أبي داود، الطهارة، باب المسح على العمامة، حديث: 150، وباب المسح على الخفين: 146، وسنن النسائي، الطهارة، باب المسح على العمامة مع الناصية، حديث: 108,107، وباب كيف المسح على العمامة، حديث: 109و 150.

مجبوری کی بنا پر ہے، جب تک مجبوری قائم ہے تب تک مدت مسح برقرار ہے۔ پھٹی اور پٹی پر مسح کی دلیل سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ سفر کے لیے نکلے، راستے میں ایک ساتھی کے سر پر پتھر لگا اور وہ زخمی ہوگیا، اسے نہانے کی حاجت ہوئی تو اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا، کیا میرے لیے تیمّم کرنے کی گنجائش ہے؟ انھوں نے کہا: تمھارے لیے تیمّم کی رخصت نہیں کیونکہ تمھارے پاس پانی موجود ہے اور تم اسے استعمال کرسکتے ہو، چنانچہ اس نے غسل کیا تو فوت ہوگیا۔ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا:

«قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللهُ، أَلَّا سَأَلُوا إِذْ لَمْ يَعْلَمُوا فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ، إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ أَنْ يَّتَيَمَّمَ وَيَعْصِبَ عَلٰى جُرْحِهِ خِرْقَةً ثُمَّ يَمْسَحُ عَلَيْهَا وَيَغْسِلُ سَائِرَ جَسَدِهِ»

''جنھوں نے اسے قتل کیا، اللہ تعالیٰ انھیں قتل کرے، اگر انھیں علم نہ تھا تو پوچھ کیوں نہ لیا؟ جہالت کا علاج یہ ہے کہ کوئی مسئلہ معلوم نہ ہو تو کسی عالم سے پوچھ لیا جائے، (پھر فرمایا:) اگر وہ مریض تیمّم کرتا اور زخم پر پٹی باندھتا اور اس پر مسح کر لیتا اور باقی جسم دھو لیتا تو یہ اسے کافی تھا۔''[1]

مقام مسح اور اس کا طریقہ: موزوں یا جرابوں کے اوپر والے حصے پر مسح کرنا چاہیے۔ اگر پگڑی باندھی ہوئی ہو تو اس کے اوپر والے مکمل حصے پر مسح کیا جائے۔ کسی عضو یا زخم پر تختیاں یا پٹیاں بندھی ہوں تو اس عضو کے اوپر نیچے مکمل طور پر مسح کرنا چاہیے۔

موزوں پر مسح کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر کے انھیں پاؤں کی انگلیوں پر رکھا جائے، پھر انھیں پاؤں کے اوپر والے حصے پر پنڈلی تک پھیرا جائے۔ دائیں پاؤں پر دائیں ہاتھ سے اور بائیں پاؤں پر بائیں ہاتھ سے مسح کیا جائے، مسح کرتے وقت ہاتھوں کی انگلیاں کھلی ہوں۔ مسح ایک ہی بار کیا جائے، دو تین بار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں علم نافع اور عمل صالح کی توفیق دے۔ آمین

نواقض وضو

گزشتہ صفحات پر آپ احادیث صحیحہ کی روشنی میں وضو کی شرائط، فرائض، سنن اور اس کا مفصل طریقہ پڑھ چکے

[1] سنن أبي داود، الطهارة، باب المجدور يتيمم، حديث: 336، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب في ◄◄

ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ کو وہ اشیاء اور حالتیں بھی معلوم ہوں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وضو ٹوٹ جانے کے باوجود آپ لاعلمی میں وضو قائم سمجھ کر عبادت کی ادائیگی میں مصروف رہیں جو صحیح اور مقبول نہ ہو۔

میرے مسلمان بھائی! کچھ چیزیں اور صورتیں ایسی ہیں جو وضو کے ٹوٹ جانے کا سبب بن جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک چیز یا صورت بھی پیش آ جانے سے وضو قائم نہیں رہتا بلکہ جس کام کے لیے وضو کیا گیا تھا، اس کی ادائیگی کے لیے نئے سرے سے وضو کرنا پڑتا ہے، ان مفاسد کو ''نواقض وضو'' یا ''وضو توڑنے والی چیزیں'' کہا جاتا ہے۔

شارع علیہ السلام نے ان چیزوں اور صورتوں کو متعین فرما دیا ہے۔ ان میں بعض ایسی ہیں جو وضو کو خود توڑ دیتی ہیں اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا، مثلاً: پیشاب، پاخانہ کا آنا یا کسی مرد یا عورت کی دبر یا قبل سے کسی چیز کا خارج ہونا۔ اور بعض صورتیں ایسی ہیں جن کے پیش آ جانے سے ''نقض وضو'' کا غالب گمان ہوتا ہے، مثلاً: زوال عقل، نیند کا غلبہ، بے ہوشی اور دیوانگی وغیرہ۔ عقل کے زائل ہو جانے سے انسان کو اپنے آپ کی ہوش نہیں رہتی، لہٰذا اس صورت حال کو نقض وضو کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اب تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

▲ دبر یا قُبل سے کسی چیز کا نکلنا: مرد یا عورت کی دبر یا قبل سے جو اشیاء خارج ہوتی ہیں ان سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، مثلاً: پیشاب، پاخانہ، منی، مذی، حیض، استحاضہ یا ہوا کا نکلنا وغیرہ۔ پیشاب اور پاخانہ نکلنے کی صورت میں دلائل شرعیہ اور اجماع امت کے فیصلے کے مطابق وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ''موجبات وضو'' کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ﴾ ''یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو (تو وضو کرے)۔''[1]

اگر منی یا مذی نکلے تو احادیث صحیحہ کی روشنی میں وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اسی طرح استحاضہ کا خون آنے سے بھی وضو قائم نہیں رہتا۔ واضح رہے کہ استحاضہ کا خون عورت کو بیماری لاحق ہونے کی وجہ سے آتا ہے اور وہ حیض کے خون کے علاوہ ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ سیدہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا کو استحاضہ کا خون آتا تھا۔ ان کے مسئلہ دریافت کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي فَإِنَّمَا هُوَ عِرْقٌ»

◄◄ المجروح تصيبه الجنابة فيخاف على نفسه إن اغتسل، حديث: 572. قال الألباني رحمه الله: حسن دون قوله: إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ...... . [1] المآئدة 5:6.

’’تم وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ بیماری کا خون ہے۔‘‘[1]

ہوا کے خارج ہونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے جس پر احادیثِ صحیحہ اور اجماع دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَقْبَلُ اللهُ صَلَاةَ أَحَدِكُمْ إِذَا أَحْدَثَ حَتَّى يَتَوَضَّأَ»

’’اللہ تعالیٰ بے وضو شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا حتیٰ کہ وہ وضو کرلے۔‘‘[2]

جس شخص کو شک پڑ جائے کہ اس کی ہوا نکلی ہے یا نہیں، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا»

’’وہ جب تک آواز نہ سن لے یا بو محسوس نہ کرے تب تک (نیا وضو کرنے کے لیے) واپس نہ جائے۔‘‘[3]

پیشاب اور پاخانہ کے راستوں کے علاوہ اگر کسی اور راستے سے کوئی چیز خارج ہوئی ہو، مثلاً: خون، قے اور نکسیر وغیرہ تو اس میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے کہ ان سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان صورتوں کے پیش آجانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

▲ **زوال عقل:** زوال عقل ہو یا عقل پر پردہ پڑ جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ زوال عقل سے مراد پاگل پن وغیرہ ہے اور عقل پر پردہ پڑ جانے کا مطلب، نیند کا غلبہ یا بے ہوشی ہے۔ یہ تمام حالتیں ’’نواقض وضو‘‘ کی ہیں کیونکہ ان میں غیر محسوس طور پر وضو کے ٹوٹ جانے کا امکان ہے، البتہ اگر بیٹھے بیٹھے معمولی سی نیند آگئی تو وہ ناقض وضو نہیں۔ اس لیے کہ روایات میں ہے کہ صحابۂ کرام ؓ نماز باجماعت ادا کرنے کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو جایا کرتے تھے۔[4]

ہاں دلائل کے درمیان جمع کے لیے ہم یہی کہیں گے کہ قصداً اور بھرپور سونے سے وضو قائم نہیں رہتا۔

▲ **اونٹ کا گوشت کھانا:** اونٹ کا گوشت (تھوڑا یا زیادہ) کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ بقول امام احمد ؒ

[1] سنن أبي داود، الطهارة، باب إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة، حديث: 286، وسنن الدارقطني: 206/1، حديث: 778. [2] صحيح البخاري، الحيل، باب في الصلاة، حديث: 6954، وصحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب الطهارة للصلاة، حديث: 225. [3] صحيح البخاري، الوضوء، باب لا يتوضأ من الشك حتى يستيقن، حديث: 137، وصحيح مسلم، الحيض، باب الدليل على أن من تيقن الطهارة ثم شك في الحدث فله أن يصلي بطهارته تلك، حديث: 361. [4] سنن أبي داود، الطهارة، باب في الوضوء من النوم، حديث: 200، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء في الوضوء من النوم، حديث: 78، وأصله في صحيح مسلم، الحيض، باب الدليل على أن نوم الجالس لا ينقض الوضوء، حديث: 376.

اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی صحیح اور صریح دو روایتیں آتی ہیں۔[1] اونٹ کے علاوہ کسی اور حلال جانور کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

▲ اس باب میں کچھ ایسی اشیاء بھی ہیں جن میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں۔ اور وہ یہ ہیں: ① شرم گاہ کو چھونا ② شہوت سے عورت کو پکڑنا ③ میت کو غسل دینا اور ④ مرتد ہو جانا۔

اہلِ علم کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ درج بالا صورتوں میں سے کوئی ایک پیش آ جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے جب کہ بعض اہلِ علم ان میں سے کسی صورت میں نقض وضو کے قائل نہیں۔ دراصل یہ مسئلہ غور و فکر کا محتاج اور اجتہادی ہے۔ اگر اختلاف کی دلدل سے نکلنے کی خاطر وضو کر لیا جائے تو مستحسن ہے۔

▲ اب زیر بحث موضوع سے متعلق ایک اہم مسئلہ باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ یقینی طور پر طہارت حاصل کر لینے کے بعد کسی کو شک و وہم پڑ گیا کہ کسی وجہ سے اس کا وضو قائم نہیں رہا تو وہ کیا کرے؟ اس بارے میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئًا فَأَشْكَلَ عَلَيْهِ أَخَرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ أَمْ لَا؟ فَلَا يَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا»

''جب کوئی شخص اپنے پیٹ میں بوجھ وغیرہ محسوس کرے، پھر اسے شک پڑ جائے کہ پیٹ سے کوئی شے نکلی ہے یا نہیں تو وہ شخص آواز یا بو محسوس کیے بغیر (وضو کرنے کے لیے) مسجد سے باہر نہ نکلے۔''[2]

روایت مذکورہ اور اس موضوع کی دیگر روایات سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ اگر کسی مسلمان کو اپنی طہارت پر پہلے یقین ہو، پھر اسے زوال طہارت کا شک پڑ جائے تو اس کی طہارت باقی رہے گی کیونکہ یہ اصلی اور یقینی حالت ہے جب کہ نقض طہارت مشکوک ہے اور شک سے یقین زائل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں یہ ایک عام اور عظیم قاعدہ ہے کہ ہر چیز اپنی اصلی حالت پر رہتی ہے جب تک کسی معقول وجہ سے اس کی مخالف حالت کا یقین نہ ہو۔ اسی طرح اس کے برعکس صورت ہے، یعنی جب کسی شخص کو اپنی حالت حدث (وضو نہ رہنے) کا یقین ہو اور طہارت میں شک ہو تو وہ وضو کر لے کیونکہ یہاں حدث اصل اور یقینی ہے جو شک وشبہ سے ختم نہ ہوگا۔

میرے مسلمان بھائی! نماز کے لیے طہارت کا اہتمام و انتظام کیجیے کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ شیطانی

① صحيح مسلم، الحيض، باب الوضوء من لحوم الإبل، حديث: 360 عن جابر بن سمرة، وسنن أبي داود، الطهارة، باب الوضوء من لحوم الإبل، حديث: 184 عن البراء ﷺ. ② صحيح مسلم، الحيض، باب الدليل على أن من تيقن الطهارة ......، حديث: 362.

وسوسوں اور شیطان کے غلبہ سے خود کو بچانے کی فکر وکوشش کیجیے۔ وہ آپ کی طہارت کے ٹوٹنے کا وسوسہ بار بار آپ کے سینے میں ڈالتا ہے اور پریشان کرتا ہے، اس کی شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کیجیے، اس کے وسوسوں کی طرف توجہ مت دیجیے۔ اہل علم سے طہارت کے مسائل پوچھیے تاکہ آپ کو بصیرت رہے۔ اپنے کپڑوں کو پاک وصاف رکھیے تاکہ آپ کی نماز صحیح اور عبادت درست ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ ہمیں علم نافع اور عمل صالح کی توفیق بخشے۔ (آمین)

غسل کے احکام

پچھلے صفحات پر آپ نے احکامِ طہارت میں سے حدث اصغر، یعنی وضو کے مسائل اور وضو کو توڑنے والی اشیاء اور صورتوں کا مطالعہ کیا۔ اب ہم حدث اکبر، یعنی جنابت، حیض اور نفاس سے متعلق احکام طہارت بیان کرتے ہیں، اس طہارت کا نام ''غسل'' ہے، جس میں تمام بدن پر مخصوص طریقے کے ساتھ پانی استعمال کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل آپ یہاں ملاحظہ فرمائیں گے۔ واضح رہے، غسل جنابت فرض ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ﴾ ''اور اگر تم جنبی ہو تو اچھی طرح طہارت حاصل کرلو۔''[2]

اہل علم نے بیان کیا ہے کہ عہد جاہلیت میں غسل جنابت کیا جاتا تھا اور یہ دین ابراہیمی کا ایک ایسا مسئلہ تھا جو عربوں میں چلا آرہا تھا۔

موجبات غسل: کسی مسلمان کو درج ذیل چھ چیزوں میں سے کوئی ایک بھی پیش آجائے تو اس پر غسل فرض ہو جاتا ہے:

▲ منی کا نکلنا: مرد ہو یا عورت، اس کی شرمگاہ سے منی کا نکلنا موجب غسل ہے جس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ حالت بیداری میں منی کا خروج ہو اور دوسری یہ ہے کہ حالت نیند میں ایسا ہو جائے۔ اگر بیداری کی حالت میں منی نکل گئی تو غسل کرنے کے لیے لذت کا حصول شرط ہے۔ اگر لذت حاصل ہوئے بغیر ایسا ہوا تو اس پر

[1] البقرة 2:222. [2] المآئدة 5:6.

غسل فرض نہ ہوگا کیونکہ بیماری کی وجہ سے ایسا ہوسکتا ہے۔ اگر حالت نیند میں منی کا خروج ہوا تو وہ ''احتلام'' ہے، ایسے شخص پر غسل فرض ہوگیا کیونکہ اس صورت میں مبتلا شخص کو لذت یا عدم لذت کا شعور نہیں۔ سو کر اٹھنے والا شخص اگر منی کے اثرات دیکھے تو اس پر غسل فرض ہے۔ اگر اسے احتلام کا احساس ہوا لیکن نہ منی نکلی اور نہ اس کے اثرات نظر آئے تو اس شخص پر غسل فرض نہ ہوگا۔

▲ جماع کرنا: اگر جماع کی صورت میں مرد کا آلہ تناسل عورت کی شرم گاہ میں داخل ہوگیا تو دونوں پر غسل فرض ہو جاتا ہے، منی کا انزال ہو یا نہ ہو۔ حدیث میں ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا جَلَسَ بَيْنَ شُعَبِهَا الْأَرْبَعِ وَمَسَّ الْخِتَانُ الْخِتَانَ، فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ»

''جب کوئی مرد بیوی کے قریب جائے اور مرد کی شرم گاہ عورت کی شرم گاہ سے مل جائے تو ان پر غسل فرض ہوگیا۔''[1]

اس حدیث اور اہلِ علم کے اجماع کی بنا پر مرد و عورت دونوں پر غسل فرض ہے منی کا انزال ہو یا نہ ہو۔

▲ قبول اسلام: اہلِ علم کی ایک جماعت کے نزدیک کفر کو چھوڑ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے شخص پر غسل فرض ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض لوگوں کو (جنھوں نے اسلام قبول کیا) غسل کرنے کا حکم دیا تھا۔[2] جب کہ جمہور اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ ایسے شخص پر غسل مستحب ہے، فرض نہیں کیونکہ یہ منقول نہیں کہ نبی ﷺ نے اسلام قبول کرنے والے ہر شخص کو غسل کرنے کا حکم دیا تھا، لہٰذا ان دلائل کی روشنی میں غسل کو استحباب پر محمول کریں گے۔ (واللہ أعلم)[3]

▲ موت کا واقع ہونا: موت کی وجہ سے میت کو غسل دینا فرض ہے، البتہ میدان جنگ میں شہید ہونے والے کو غسل نہیں دیا جاتا۔ تفصیل احکام الجنائز کے باب میں ذکر ہوگی۔ إن شاء اللہ تعالیٰ

▲ حیض اور نفاس کے خون کا منقطع ہونا: جب حیض یا نفاس کے ایام ختم ہو جائیں تو اس عورت پر غسل فرض ہو

---

[1] صحيح البخاري، الغسل، باب إذا التقى الختانان، حديث: 291، وصحيح مسلم، الحيض، باب نسخ الماء من الماء ووجوب الغسل بالتقاء الختانين، حديث: 349 . [2] سنن أبي داود، الطهارة، باب الرجل يسلم فيؤمر بالغسل، حديث: 355، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما ذكر في الاغتسال عند ما يسلم الرجل، حديث: 605.

[3] ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ہر اسلام قبول کرنے والے کے لیے واجب ہے۔ کسی ایک شخص کے لیے اسے خاص کرنا محل نظر ہے کیونکہ حکم عام ہے اور شرعی مسئلہ کے ثبوت کے لیے ضروری نہیں کہ ہر فرد کو الگ الگ حکم دیا جائے۔ جب ایک شخص کے لیے حکم ثابت ہو تو تمام کے لیے ہوگا الا یہ کہ اختصاص کی کوئی دلیل ہو۔ واللہ أعلم.

جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت سے کہا:

«وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْتَسِلِي وَصَلِّي» ''جب تیرے حیض کے دن گزر جائیں تو غسل کر اور نماز ادا کر۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ ''ہاں جب وہ پاک ہو جائیں''[2]

یعنی حیض والی عورتیں حیض ختم ہونے کے بعد غسل کر کے پاک ہو جائیں۔

کامل غسل کا طریقہ: اولاً دل میں نیت کرے، پھر بسم اللہ پڑھے، تین مرتبہ ہاتھ دھوئے اور استنجا کرے، پھر مکمل وضو کرے، پھر سر پر تین چلو ڈالے اور بالوں کو جڑوں تک تر کرے، پھر سارے بدن پر (پہلے دائیں پھر بائیں) پانی ڈالے، بدن کو ہاتھوں سے خوب ملے تاکہ پانی بدن کے ہر حصے تک پہنچ جائے۔

حیض و نفاس سے فارغ ہونے والی عورت غسل کے وقت سر کے بال کھول دے لیکن غسل جنابت میں سر کے بال کھولنا ضروری نہیں کیونکہ اس میں عورت پر مشقت اور مشکل ہے، البتہ وہ پانی سر کے بالوں کی جڑوں تک ضرور پہنچائے۔

غسل جنابت کرنے والا مرد ہو یا عورت وہ بدن کے ہر حصے تک پانی کو پہنچائے اور اسے تر کرنے کی پوری کوشش کرے۔ بالوں کی جڑوں، بدن کی نظر نہ آنے والی جگہوں، حلق کے نیچے، ناف کے اندر، بغلوں کے نیچے اور گھٹنوں کے نیچے والے حصوں میں توجہ اور اہتمام سے پانی بہائے۔ گھڑی یا انگوٹھی پہنی ہو تو اسے حرکت دے تاکہ پانی ان کے نیچے تک پہنچ جائے۔ اس طرح مکمل طور پر اہتمام سے غسل جنابت کرے کہ اس کے بدن میں ایسی جگہ نہ رہ جائے جہاں پانی نہ پہنچ سکا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ تَحْتَ كُلِّ شَعْرَةٍ جَنَابَةً، فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ وَأَنْقُوا الْبَشَرَ»

''ہر بال کے نیچے جنابت ہے، لہٰذا بالوں کو دھوؤ اور اپنے جسم کو اچھی طرح صاف کرو۔''[3]

غسل کرنے والا پانی کے استعمال میں اسراف نہ کرے۔ مسنون یہ ہے کہ پانی کا کم سے کم استعمال ہو اور غسل بھی مکمل ہو جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

---

① صحيح البخاري، الحيض، باب إقبال المحيض وإدباره، حديث :320، وصحيح مسلم، الحيض، باب المستحاضة وغسلها وصلاتها، حديث : 333. ② البقرة 2:222. ③ [ضعيف] سنن أبي داود، الطهارة، باب في الغسل من الجنابة، حديث :248، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء أن تحت كل شعرة جنابة، حديث :106.

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ»

''نبی اکرم ﷺ ایک مد سے وضو اور ایک صاع سے غسل کر لیا کرتے تھے۔''[1]

ہمیں بھی چاہیے کہ آپ کی پیروی کرتے ہوئے کم از کم پانی کا استعمال کریں اور اسراف سے بچیں۔

◆ غسل کرنے والا شخص پردے کا اہتمام کرے۔ لوگوں کے سامنے ننگا غسل نہ کرے۔ حدیث میں ہے:

«إِنَّ اللهَ حَيِيٌّ سِتِّيرٌ يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالسَّتْرَ فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ»

''اللہ تعالیٰ حیا والا ہے (عیب) چھپانے والا ہے۔ وہ حیا اور پردہ پوشی کو پسند کرتا ہے۔ جب کوئی غسل کرے تو (اچھی طرح) پردہ کرے۔''[2]

◆ غسل جنابت بندے اور اس کے رب کے درمیان امانتوں میں سے ایک امانت ہے، لہٰذا بندہ اس کی محافظت کرے، اس کے احکام کا خیال رکھے تاکہ وہ مسنون طریقے سے غسل ادا کر سکے۔ اگر اسے غسل کے احکام و مسائل کا علم نہ ہو تو کسی سے پوچھ لے اور اس بارے میں جھجک اور شرم محسوس نہ کرے ارشاد نبوی ہے:

«إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ» ''اللہ تعالیٰ حق بیان کرتے نہیں شرماتا۔''[3]

جو حیا دینی امور کے سیکھنے میں رکاوٹ ہے وہ حیا قابل مذمت ہے، شیطانی کمزوری ہے۔ شیطان ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی انسان اپنے دین میں کامل ہو اور اسے احکام دین کی معرفت ہو۔ طہارت کا مسئلہ ایک عظیم مسئلہ ہے۔ اس میں کوتاہی انتہائی خطرناک اور نقصان دہ ہے کیونکہ نماز دین اسلام کا ایک ستون ہے جس کا دارومدار طہارت پر ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو دینی بصیرت سے نوازے اور قول و عمل میں اخلاص نصیب فرمائے۔

تیمّم کے احکام

اللہ تعالیٰ نے نماز کی ادائیگی کے لیے چھوٹی موٹی تمام نجاستوں سے ''پاک پانی کے ساتھ طہارت'' حاصل

[1] صحيح البخاري، الوضوء، باب الوضوء بالمد، حديث: 201، وصحيح مسلم، الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة......، حديث: 325 واللفظ له. مد اور صاع کی وضاحت ''وضو کا مفصل طریقہ'' کے باب میں کر دی گئی ہے۔ [2] سنن أبي داود، الحمام، باب النهي عن التعري، حديث: 4012، و سنن النسائي، الغسل، باب الاستتار عند الغسل، حديث: 406،407. [3] صحيح البخاري، العلم، باب الحياء في العلم، حديث: 130، والغسل، باب إذا احتلمت المرأة، حديث: 282، وسنن النسائي، الطهارة، باب غسل المرأة ترى في منامها ما يرى الرجل، حديث: 196.

کرنے کا حکم دیا ہے جو حتی الامکان واجب ہے۔ لیکن کبھی ایسے حالات پیش آ جاتے ہیں کہ پانی حقیقتاً میسر نہیں ہوتا یا پانی موجود تو ہوتا ہے لیکن شرعی عذر کی وجہ سے اس کے استعمال کی طاقت نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے تیمّم کو وضو کا قائم مقام قرار دیا ہے تاکہ مخلوق پر آسانی رہے اور مشقت و مشکل سے بچ جائے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾

”اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھو لو اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کر لو، ہاں اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو، یا تم عورتوں سے ملے ہو اور تمھیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمّم کر لو، اسے اپنے چہروں پر اور ہاتھوں پر مل لو، اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی نہیں ڈالنا چاہتا بلکہ اس کا ارادہ تمھیں پاک کرنے کا اور تمھیں اپنی بھرپور نعمت دینے کا ہے تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔“[1]

▲ تیمّم کا لغوی معنی ”قصد و ارادہ“ ہے اور اصطلاحی معنی ”چہرے اور ہاتھوں پر پاک مٹی سے مخصوص طریقے کے ساتھ مسح کرنا“ ہے۔

▲ تیمّم قرآن مجید، سنت رسول ﷺ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ تیمّم امت محمدیہ کی ایک خوبی اور اس کے لیے ایک خصوصی عطیۂ الٰہی ہے۔ حصول پاکیزگی کا یہ ذریعہ کسی اور امت کے حصے میں نہیں آیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر آسانی اور احسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أُعْطِيتُ خَمْسًا لَّمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي : نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَّجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا ، فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِّنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ»

”مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملیں۔ ایک ماہ کی مسافت پر موجود دشمن پر

[1] المآئدة 6:5.

میرا رعب طاری کر دیا گیا ہے، میرے لیے زمین مسجد اور ذریعۂ طہارت بنا دی گئی ہے، میری امت کے کسی فرد پر جہاں بھی نماز کا وقت آ جائے تو وہ وہیں ادا کر لے۔''[1]

مسند امام احمد کے الفاظ اس طرح ہیں:

«فَعِنْدَهُ مَسْجِدُهُ وَعِنْدَهُ طَهُورُهُ» ''اس کے پاس اس کی مسجد بھی ہے اور وضو بھی ہے۔''[2]

شرعی عذر کے وقت تیمّم وضو کا بدل ہے، لہٰذا تیمّم کے ساتھ ہر وہ کام کیا جا سکتا ہے جو وضو کرنے سے ہوتا ہے، مثلاً: نماز، طواف اور تلاوت قرآن وغیرہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وضو کی طرح تیمّم کو بھی طہارت کا ذریعہ اور سبب قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«جُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُورًا» ''زمین کی مٹی ہمارے لیے ذریعۂ طہارت قرار دی گئی ہے۔''[3]

درج ذیل صورتوں میں تیمّم کرنا مشروع ہے:

① پانی دستیاب نہ ہونے کی صورت میں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا﴾ ''اور تمھیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمّم کر لو۔''[4]

واضح رہے پانی کا سفر یا اقامت میں نہ ہونا یا تلاش کرنے کے باوجود پانی میسر نہ آنا، دونوں صورتوں کا ایک ہی حکم ہے کہ تیمّم کر لیا جائے۔

② پانی موجود ہو لیکن صرف پینے اور پکانے کے لیے ہو، اگر اسے طہارت کے لیے استعمال کرتا ہے تو اپنی یا ساتھی یا اپنے جانور کی جان لیوا پیاس کا خطرہ ہے، اس صورت میں تیمّم مشروع ہے۔

③ جب کسی کو پانی کے استعمال سے بیمار ہو جانے یا بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾

''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ملے ہو اور تمھیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمّم کر لو۔''[5]

④ جب کوئی شخص (بڑھاپے یا) بیماری کی وجہ سے پانی کے استعمال میں اس قدر بے بس اور عاجز ہو کہ حرکت

① صحيح البخاري، التيمم، باب:1، حديث :335، وصحيح مسلم، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلاة، حديث:521. ② مسند أحمد :248/5. ③ صحيح مسلم، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلاة، حديث : 522. ④ المآئدة 6:5. ⑤ المآئدة 6:5.

بھی نہ کرسکتا ہو اور اسے وضو کروانے والا بھی کوئی نہ ہو، نیز نماز کا وقت ختم ہونے کا خوف ہو تو وہ تیمّم کر کے نماز ادا کر لے۔

⑤ جب پانی شدید ٹھنڈا ہو اور گرم کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہ ہو۔ نیز گمان غالب بھی یہ ہو کہ اس پانی کے استعمال سے وہ بیمار ہو جائے گا تو وہ تیمّم کر کے نماز پڑھ لے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝﴾

''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے۔''[1]

▲ اگر پانی قلیل مقدار میں میسر ہو جس سے وضو کے تمام اعضاء دھل نہ سکتے ہوں تو جس قدر ممکن ہو اس قلیل پانی سے اعضائے وضو دھو لیے جائیں، باقی اعضاء پر تیمّم کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔''[2]

▲ اگر کسی زخم کو دھونے یا اس پر پانی کے ساتھ مسح کرنے سے تکلیف کا اندیشہ ہو تو اس حصے پر تیمّم کرے اور باقی حصہ دھو لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝﴾

''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے۔''[3]

▲ اگر زخم ایسا ہو کہ اس پر مسح کرنے سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو وہ مرہم لگے زخم پر مسح کر لے، تیمّم کی ضرورت نہیں۔

زمین کی سطح پر موجود صاف مٹی ہو یا ریتلی زمین یا شور کلر والی زمین ہو، سب مٹی کے حکم میں ہیں، ہر ایک سے تیمّم درست ہے۔ اہل علم کا یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ ''پاک مٹی سے تیمّم کرو۔'' عام ہے۔ علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام (سفر میں) اپنے ساتھ (تیمّم کے لیے) مٹی رکھنے کا تکلف اور اہتمام نہ کرتے تھے، بلکہ جس قسم کی زمین پر نماز ادا کرتے، وہیں مٹی، ریت وغیرہ پر ہاتھ مار کر تیمّم کر لیا کرتے تھے۔

---

① النسآء 29:4. ② التغابن 16:64. فاضل مصنف نے اس مسئلے کی دلیل ذکر نہیں کی، باقی رہا آیت سے استدلال تو وہ بعید ہے، تاہم حدیث میں ایک مد پانی سے وضو کرنے کا جو ذکر ہے اس سے کم پانی قلیل ہی شمار ہوگا اور اس حالت میں تیمّم ہی کیا جائے گا۔
③ النسآء 29:4.

تیمّم کا طریقہ: (تیمّم کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے نیت کرے اور بسم اللہ کہے) انگلیاں کھول کر دونوں ہاتھ مٹی پر ایک بار مارے، پھر ہتھیلیوں کے ساتھ مکمل چہرے پر مسح کرے اور پشت ہاتھ پر پھیرے۔ اگر کسی نے مٹی پر دو ضربیں مار کر تیمّم کیا، یعنی ایک ضرب سے چہرے پر اور دوسری ضرب سے ہاتھوں کا مسح کیا تو بھی جائز ہے۔[1] لیکن ایک ضرب والی صورت رسول اللہ ﷺ سے زیادہ صحیح سند سے منقول ہے۔ اور یہی طریقہ زیادہ بہتر ہے۔[2]

✍ جن امور سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، انھی سے تیمّم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح حدث اکبر، یعنی جنابت، حیض اور نفاس آنے سے بھی تیمّم قائم نہیں رہتا کیونکہ متبادل شے کا وہی حکم ہوتا ہے جو اصل شے کا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں تیمّم پانی میسر نہ آنے کی وجہ سے کیا گیا تھا، جب پانی میسر آ گیا تو تیمّم باقی نہ رہے گا۔ اگر کسی نے بیماری کی وجہ سے تیمّم کیا تھا تو عذر کے ختم ہونے سے تیمّم بھی ختم ہو جائے گا۔

✍ اگر کسی شخص کے ہاں نہ پانی ہو نہ مٹی، یا کسی بیماری کی وجہ سے اس میں وضو یا تیمّم کرنے کی سکت نہ ہو تو وہ وضو یا تیمّم کیے بغیر نماز ادا کر لے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی ہمت اور طاقت سے بڑھ کر مکلّف نہیں بناتا۔ اگر ادائیگیٔ نماز کے بعد پانی یا مٹی میسر آ گئی یا اس شخص میں وضو کرنے کی ہمت پیدا ہو گئی تو وہ ادا شدہ نماز نہ دہرائے کیونکہ اس نے حسب طاقت حکم الٰہی کی تعمیل کر دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔''[3]

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

''جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو تم حسب استطاعت اس کو ادا کرو۔''[4]

میرے بھائی! یہ تیمّم کے چند اہم مسائل تھے جو ہم نے آپ کے سامنے بیان کر دیے ہیں، اگر پھر بھی کسی مسئلہ میں الجھن محسوس ہو تو اہلِ علم سے اس کا حل معلوم کر لینا۔ اپنے دینی امور میں سستی کا مظاہرہ نہ کرنا، خصوصًا نماز کا جو دین اسلام کا ستون ہے، خیال رکھنا کیونکہ یہ بہت نازک اور اہم معاملہ ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، حديث:342,335. [2] صحيح البخاري، التيمم، باب المتيمم هل ينفخ فيهما؟ حديث:338، 339.
[3] التغابن 16:64. [4] صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، حديث:7288، وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرّة في العمر، حديث:1337، ومسند أحمد:258/2.

اللہ تعالیٰ ہمیں قول و عمل میں صحیح اور سچ کی توفیق دے اور ہمارا ہر عمل خالص اس کی رضا کے لیے ہو، بے شک وہی دعاؤں کا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

نجاستیں دور کرنے کے احکام اور طریقے

جس طرح نماز کے لیے وضو کر کے اعضائے بدن کو پاک صاف کرنا ایک مسلمان سے مطلوب ہے۔ اسی طرح اس سے اپنے بدن، لباس اور نماز کی جگہ کو ہر قسم کی گندگی سے پاک رکھنا مطلوب و مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ ''اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کر۔''[1]

حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو کپڑوں پر لگا ہوا حیض کا خون دھو ڈالنے کا حکم دیا تھا۔[2]

اس موضوع کی نزاکت کے پیش نظر یقیناً آپ کا مطالبہ ہوگا کہ ہم یہاں نجاستوں کو زائل کرنے کے احکام اور طریقوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں تاکہ ہمارے مسلمان بھائی اس سے مستفید ہو سکیں۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر فقہائے کرام اپنی کتب میں [إزالة النجاسة] کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کرتے ہیں، جس میں اعضائے وضو، بدن، لباس، برتن، بستر، چٹائی اور نماز کی جگہ پر لگ جانے والی نجاستوں کو دور کرنے اور انھیں پاک صاف کرنے کے مسائل و احکام تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ ان جملہ احکام کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

- نجاست زائل کر کے طہارت حاصل کرنے کا اول اور اصل ذریعہ ''پانی'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی کے اس وصف کو یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ﴾

''اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ اس پانی کے ذریعے سے تم کو پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسے دفع کر دے۔''[3]

- اگر نجاست زمین، دیوار، حوض یا کسی پتھر و چٹان پر لگی ہو تو اس پر ایک ہی بار پانی بہا کر دھو دیا جائے، نجاست

① المدثر 4:74. ② هذا معنى الحديث وأصله في صحيح البخاري، الوضوء، باب غسل الدم، حديث : 227 والحيض، باب غسل دم المحيض، حديث: 307، وصحيح مسلم، الطهارة، باب نجاسة الدم وكيفية غسله، حديث :291. ③ الأنفال 11:8.

زائل ہو جائے تو حصول طہارت کے لیے کافی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ پر پانی کا ڈول بہا دینے کا حکم دیا۔[1]

بارش یا سیلاب کے بہاؤ سے بھی زمین پاک ہو جاتی ہے۔ یعنی جب اس پر پانی بہا دیا جائے یا بارش ہو جائے یا اس زمین پر بارش کا پانی گزر جائے اور نجاست ڈھل جائے تو وہ نجس جگہ صاف ہو جاتی ہے۔

- اگر کتے یا خنزیر کا لعاب وغیرہ لگ جائے یا وہ کسی برتن میں منہ ڈال دیں تو حصولِ طہارت کے لیے اسے سات مرتبہ پانی سے اور ایک مرتبہ مٹی سے دھویا اور صاف کیا جائے۔ ارشادِ نبوی ہے:

«إِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءِ أَحَدِكُمْ، فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ أُولَاهُنَّ بِالتُّرَابِ»

”جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال دے تو وہ اس برتن کو سات مرتبہ پانی سے دھوئے۔ پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرے۔“[2]

واضح رہے اس حکم کا اطلاق برتنوں کے علاوہ کپڑوں، بستروں اور چٹائیوں پر بھی ہوتا ہے۔

- اگر پیشاب، پاخانہ یا خون وغیرہ کی نجاست لگی ہو تو خشک ہونے کی صورت میں اسے کھرچ دیا جائے، بعد ازیں پانی کے ساتھ دھو دیا جائے کہ اس کا وجود اور رنگ باقی نہ رہے۔ دھونے کے قابل اشیاء تین قسم کی ہوتی ہیں: ① جن اشیاء کا نچوڑنا ممکن ہو، مثلاً: کپڑا وغیرہ۔ ایسی اشیاء کو دھونے کے بعد نچوڑنا لازمی ہے۔ ② جن اشیاء کا نچوڑنا ممکن نہ ہو، البتہ انھیں الٹایا پلٹایا جا سکتا ہو، مثلاً: چمڑا، قالین وغیرہ۔ ایسی اشیاء کو دھوتے وقت الٹانا، پلٹانا ضروری ہے۔ ③ وہ اشیاء جنھیں نچوڑنا یا پلٹانا ممکن نہ ہو تو اسے کسی ڈنڈے وغیرہ سے کوٹ لیا جائے اور اس پر کوئی بھاری چیز رکھ دی جائے تاکہ دھونے کے بعد اس میں موجود پانی حتی الامکان خارج ہو جائے۔

- اگر بدن یا کپڑے پر نجاست لگ جائے اور اس کی جگہ مخفی ہو تو جس جگہ پر نجاست کا احتمال ہو اسے دھو لیا جائے، یہاں تک کہ نجاست کے زوال کا یقین ہو جائے۔ اگر نجاست کی جگہ کا علم نہ ہو تو وہ چیز مکمل طور پر دھو ڈالی جائے۔

- اگر چھوٹا بچہ (جو کھانا کھانے کے قابل نہ ہو) پیشاب کر دے تو اس پر پانی کے چھینٹے مار دیے جائیں تو طہارت

---

① هذا معنى الحديث وأصله في صحيح البخاري، الوضوء، باب ترك النبي ﷺ والناس الأعرابي......، حديث :219، وصحيح مسلم، الطهارة، باب وجوب غسل البول وغيره من النجاسات......، حديث : 284. ② صحيح البخاري، الوضوء، باب إذا شرب الكلب في إناء أحدكم فليغسله سبعًا، حديث : 172، وصحيح مسلم، الطهارة، باب حكم ولوغ الكلب، حديث : 279، وسنن النسائي، المياه، باب تعفير الإناء بالتراب من ولوغ الكلب فيه، حديث: 339 واللفظ له.

حاصل کرنے کے لیے کافی ہے جیسا کہ سیدہ ام قیس ﷝ سے روایت ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بچے کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائیں۔ بچے کو آپ نے اپنی گود میں بٹھا دیا تو اس نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے پانی منگوایا اور اپنے کپڑوں پر چھینٹے مار لیے، دھویا نہیں۔[1]

▲ اگر بچہ اپنی مرضی اور خواہش سے کھانا کھاتا ہو تو اس کا پیشاب بڑے آدمی کی طرح پلید ہے۔ اسی طرح چھوٹی بچی کے پیشاب کا حکم بڑی لڑکی کی طرح ہے، یعنی ان تمام صورتوں میں پیشاب کو دیگر نجاستوں کی طرح پانی سے دھویا جائے گا۔

نجاست کی تین قسمیں ہیں: ① نجاست غلیظہ، جیسے کتے کا لعاب وغیرہ ② نجاست خفیفہ، جیسے کھانا نہ کھانے والے بچے کا پیشاب ③ نجاست متوسطہ، جیسے مذکورہ بالا کے علاوہ باقی نجاستیں۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ جانوروں کی لید اور پیشاب کے پاک یا ناپاک ہونے سے متعلق شرعی احکام معلوم کریں تاکہ مزید بصیرت حاصل ہو۔

میرے بھائی! جس جانور کا گوشت کھانا حلال ہے اس کا گوبر اور پیشاب بھی پاک ہے، جیسے اونٹ، گائے، بکری اور بھیڑ وغیرہ۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ عرینہ کے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیماری کے علاج کے لیے وہاں چلے جائیں جہاں ہمارے صدقہ کے اونٹ ہیں اور ان کا پیشاب اور دودھ پئیں۔[2]

اگر کوئی کہے کہ یہ علاج ایک ضرورت اور مجبوری کی حالت میں مقرر ہوا تھا تو ہم گزارش کریں گے کہ آپ نے انھیں یہ حکم نہیں دیا تھا کہ نماز کی ادائیگی کے وقت ان اونٹوں کے پیشاب اور گوبر کے اثرات کو پانی سے دھولیا کریں۔ نیز صحیح بخاری میں ایک روایت ہے: ''نبی ﷺ مسجد بنانے سے پہلے بکریوں کے باڑے میں نماز ادا کر لیتے تھے۔''[3]

اور دوسروں کو بھی اس کی اجازت دیتے تھے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بکریاں وہاں پیشاب بھی کرتی تھیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ﷫ نے کہا ہے: ''لید کے بارے میں اصل حکم طہارت کا ہے سوائے اس لید کے جسے شریعت نے مستثنیٰ کر دیا ہے۔''[4]

① صحيح البخاري، الوضوء، باب بول الصبيان، حديث: 223، وصحيح مسلم، الطهارة، باب حكم بول الطفل الرضيع ......، حديث: 287. ② صحيح البخاري، الوضوء، باب أبوال الإبل والدواب والغنم ومرابضها، حديث: 233، وصحيح مسلم، القسامة والمحاربين، باب حكم المحاربين و المرتدين، حديث: 1671. ③ صحيح البخاري، الوضوء، باب أبوال الإبل و الدواب والغنم ومرابضها، حديث: 234، وصحيح مسلم، الحيض، باب الوضوء من لحوم الإبل، حديث: 360. ④ الفتاوى الكبرى، الاختيارات العلمية، باب إزالة النجاسة: 313/5.

- جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا جوٹھا پاک ہے۔
- ان کے علاوہ بلی کا جوٹھا بھی پاک ہے، چنانچہ بلی کے بارے میں سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ أَوِ الطَّوَّافَاتِ»

''یہ (بلی) پلید نہیں ہے، یہ تمھارے پاس کثرت سے آنے جانے والوں میں سے ہے۔''[1]

آپ نے بلی کو گھروں میں خدمت کے لیے آنے جانے والے غلاموں کے ساتھ تشبیہ دی جن سے پردہ کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ نیز بلی کے جوٹھے سے بچنا مشکل تھا، اس لیے بلی کو پاک قرار دے کر حرج اور مشقت کو ختم کر دیا۔

بعض علمائے کرام نے بلی سے چھوٹے پرندوں اور جانوروں پر بلی والا حکم لگایا ہے، یعنی چھوٹے پرندوں کا جوٹھا بلی کے جوٹھے کی طرح پاک ہے نجس نہیں کیونکہ علت طواف دونوں میں مشترک ہے۔

بلی اور جو جانور بلی کے حکم میں ہیں ان کے سوا جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا ان کی لید، پیشاب اور جوٹھا پلید ہے۔

اے مسلمان بھائی! آپ کو ظاہری و باطنی طہارت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ باطنی طہارت توحید اور قول و عمل میں اخلاص کی بدولت میسر آتی ہے اور ظاہری طہارت ہر قسم کی گندگیوں اور پلیدیوں کو دور کر کے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارا دین حقیقی اور حکمی نجاستوں سے پاک وصاف رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مسلمان پاک صاف ہے اور پاکیزگی کو اختیار کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ» ''طہارت نصف ایمان ہے۔''[2]

اللہ کے بندے! طہارت کا اہتمام کرو، نجاستوں سے دور رہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ عام طور پر قبر کا عذاب پیشاب سے بے احتیاطی کے باعث ہوتا ہے۔[3]

جب تم نجاست سے آلودہ ہو تو حتی الامکان حصولِ طہارت میں جلدی کرو تاکہ تم پاک رہو۔ خصوصًا نماز کا

---

[1] جامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء في سؤر الهرة، حديث: 92. [2] صحيح مسلم، الطهارة، باب فضل الوضوء، حديث: 223. [3] صحيح البخاري، الوضوء، باب من الكبائر أن لا يستتر من بوله، حديث: 216، وصحيح مسلم، الطهارة، باب الدليل على نجاسة البول ووجوب الاستبراء منه، حديث: 292، والمستدرك للحاكم: 184,183/1.

ارادہ ہو تو سستی نہ کیجیے۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت اپنے جوتوں کو اچھی طرح دیکھ لیں، اگر ان کو نجاست لگی ہو تو صاف کر لیں۔ نجاست سے آلودہ جوتے مسجد میں لے کر نہ جائیے اور نہ انھیں مسجد میں رکھیے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اس قول و عمل کی توفیق دے جو اسے محبوب اور پسند ہو۔

حیض اور نفاس کے احکام

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝﴾

''(اے پیغمبر!) آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے کہ وہ گندگی ہے، حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ، ہاں جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمھیں اجازت دی ہے، اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''[1]

حیض ایک طبعی اور فطری خون ہے جو مقررہ ایام میں عورت کے رحم سے نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ماں کے پیٹ میں موجود بچے کی خوراک بنایا ہے کیونکہ اسے وہاں خوراک کی حاجت ہوتی ہے۔ اگر ماں کے پیٹ میں جانے والی خوراک میں رحم کا بچہ شریک ہو جاتا تو عورت کمزور ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خون حیض کو بچے کی غذا بنا دیا۔ اسی بنا پر حاملہ عورت کو حیض نہیں آتا۔ جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس نومولود کی خوراک دودھ کی شکل میں ماں کے پستانوں میں منتقل کر دیتا ہے جو وہاں سے حاصل کرتا ہے، اس وجہ سے دودھ پلانے والی عورت کے حیض میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ جب عورت حمل اور رضاعت کے مراحل سے فارغ ہو جاتی ہے تو اس خون کی ماں کے رحم میں ضرورت نہیں رہتی، چنانچہ ہر ماہ تقریباً چھ یا سات دن اسے حیض کا خون آتا ہے، کبھی عورت کے مزاج یا خاص حالات کی وجہ سے اس میں کمی وبیشی بھی ہو جاتی ہے۔

حائضہ عورت کے حیض کے ایام اور حیض کے اختتام سے متعلق کتاب وسنت میں مفصل احکام ہیں جن کا خلاصہ

[1] البقرۃ 2:222.

درج ذیل ہے:

▲ حائضہ عورت کے لیے حیض کے ایام میں نماز اور روزہ منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«إِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ فَدَعِي الصَّلَاةَ» ''جب حیض آئے تو نماز چھوڑ دینا۔''[1]

اگر کسی عورت نے دوران حیض روزہ رکھ لیا یا نماز ادا کر لی تو اس کا روزہ یا نماز صحیح اور مقبول نہ ہوں گے کیونکہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ یہ نہی عدم صحت کی متقاضی ہے بلکہ نماز روزہ رکھنے سے حائضہ عورت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمان شمار ہوگی۔

جب عورت حیض سے پاک وصاف ہو جائے تو روزے کی قضا دے لیکن نماز کی قضا نہ دے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

«كُنَّا نَحِيضُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ ثُمَّ نَطْهُرُ فَيَأْمُرُنَا بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا يَأْمُرُ بِقَضَاءِ الصَّلَاةِ»

''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب ہم حیض کے ایام سے فارغ ہوتیں تو ہمیں روزے کی قضا کا حکم ہوتا لیکن نماز کی قضا کا حکم نہ ملتا۔''[2]

▲ حائضہ کے احکام میں یہ بھی ہے کہ وہ بیت اللہ کا طواف نہ کرے، قرآن مجید کی (پکڑ کر) تلاوت نہ کرے، مسجد میں نہ بیٹھے اور اس کا خاوند اس سے صحبت نہ کرے کیونکہ وہ حرام ہے حتیٰ کہ اسے حیض آنا بند ہو جائے اور غسل کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ﴾

''(اے پیغمبر!) آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے کہ وہ گندگی ہے، حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ، ہاں جب وہ پاک ہو

---

[1] صحيح البخاري، الحيض، باب إذا رأت المستحاضة الطهر، حديث: 331، وصحيح مسلم، الحيض، باب المستحاضة وغسلها وصلاتها، حديث: 333. [2] صحيح البخاري، الحيض، باب لا تقضي الحائض الصلاة، حديث: 321، وصحيح مسلم، الحيض، باب وجوب قضاء الصوم على الحائض دون الصلاة، حديث: 335، وسنن أبي داود، الطهارة، باب في الحائض لا تقضي الصلاة، حديث: 263،262، و سنن النسائي، الصيام، باب وضع الصيام عن الحائض، حديث: 2320 واللفظ له.

جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمھیں اجازت دی ہے۔‘‘[1]

آیت میں ﴿فَاعْتَزِلُوا﴾ سے جماع نہ کرنا مراد ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«اِصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ»

’’جماع کے علاوہ حائضہ سے ہر کام کر سکتے ہو۔‘‘[2]

- خاوند کو حائضہ بیوی کے ساتھ (فرج میں جماع کے علاوہ) معانقہ اور بوس وکنار وغیرہ کی اجازت ہے۔
- خاوند کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾

’’اے نبی! (اپنی امت سے کہو کہ) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت میں انھیں طلاق دو۔‘‘[3]

آیت میں کلمہ ﴿لِعِدَّتِهِنَّ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ حیض سے پاک ہوں اور ان سے اس طہر میں صحبت بھی نہ کی گئی ہو۔ علاوہ ازیں ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ وہ بیوی سے رجوع کریں اور اگر طلاق کا ارادہ ہو تو حالت طہر میں طلاق دیں۔[4]

- جب حیض کا خون بند ہو جائے تو عورت پاک ہو جاتی ہے۔ اب اس پر غسل کرنا فرض ہے۔ غسل کے بعد ہر وہ کام جو حیض کے سبب ممنوع تھا، انھیں کرنے کی اجازت ہے۔
- اگر طہارت حاصل کر لینے کے بعد مٹیالا پانی یا پیلا پانی دیکھے تو اس پر فکر مند نہ ہو کیونکہ سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے:

«كُنَّا لَا نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ بَعْدَ الطُّهْرِ شَيْئًا»

’’ہم (عہد نبوی میں) پاک ہو جانے کے بعد مٹیالا یا پیلا پانی کچھ شمار نہ کرتی تھیں۔‘‘[5]

---

① البقرة2:222. ② صحيح مسلم، الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها......، حديث :302، وسنن أبي داود، الطهارة، باب مؤاكلة الحائض ومجامعتها، حديث : 258. ③ الطلاق 65:1. ④ صحيح البخاري، التفسير، سورة الطلاق باب:1، حديث : 4908، وصحيح مسلم، الطلاق، باب تحريم طلاق الحائض بغير رضاها......، حديث :1471. ⑤ صحيح البخاري، الحيض، باب الصفرة والكدرة في غير أيام الحيض، حديث :326، وسنن ◄◄

تنبیہ: اگر حائضہ یا نفاس والی عورت غروب آفتاب سے پہلے پاک ہو جائے تو اسے اس دن کی ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کرنا ہوں گی۔ اگر صبح صادق سے پہلے پہلے پاک ہو جائے تو اس رات کی مغرب اور عشاء کی نماز ادا کرنا اس پر لازم ہے کیونکہ دوسری نماز کا وقت حالت عذر میں پہلی نماز کا وقت بھی ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جمہور علماء میں سے امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ اگر حائضہ عورت دن کے آخری حصہ میں پاک ہو جائے تو وہ ظہر اور عصر، دونوں نمازیں ادا کرے گی، اگر رات کے آخری حصے میں پاک ہو تو مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کرے گی۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف، سیدنا ابوہریرہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے کیونکہ حالت عذر میں یہ وقت دونوں نمازوں کے درمیان مشترک ہے۔ جب وہ دن کے آخری حصے میں پاک ہو تو ظہر کا وقت باقی ہے۔ لہٰذا عصر سے پہلے ظہر ادا کرے۔ اسی طرح اگر رات کے آخری حصے میں پاک ہو تو حالت عذر میں مغرب کا وقت باقی ہے تو اسے عشاء سے پہلے ادا کرے۔''[1]

اگر کسی نماز کا وقت شروع ہو گیا لیکن اس نے نماز ادا نہ کی کہ وہ حیض یا نفاس والی ہو گئی تو راجح قول یہی ہے کہ اس پر اس نماز کی قضا نہیں، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس مسئلے سے متعلق لکھتے ہیں:

''امام ابوحنیفہ اور مالک رحمہما اللہ کا مسلک دلائل کے لحاظ سے قوی ہے کہ ایسی صورت میں عورت پر کچھ لازم نہیں کیونکہ قضا کا وجوب کسی امر جدید سے ہوتا ہے جو یہاں نہیں ہے۔ باقی رہا اس کا نماز میں تاخیر کرنا تو اس میں جواز تھا، لہٰذا وہ کوتاہی کی مرتکب نہیں ہوئی۔ سویا ہوا یا بھول جانے والا بھی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہیں اگرچہ نماز کا وقت گزر جائے کیونکہ سو جانے والا جب سو کر اٹھے یا بھولنے والے کو جب یاد آ جائے تو ان کا وہی وقتِ نماز ہے۔''[2]

استحاضہ اور اس کے احکام: استحاضہ ایسا جاری خون ہوتا ہے جس کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا اور یہ خون بیماری

◄◄ أبي داود، الطهارة، باب في المرأة ترى الصفرة والكدرة بعد الطهر، حديث: 307 واللفظ له.

[1] مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية رحمہ اللہ: 434/21 بعض علماء کا یہ موقف بھی محل نظر ہے کیونکہ نماز کا وقت متعین ہے جیسا کہ جبریل امین نے رسول اکرم ﷺ کو بتایا تھا۔ عذر کی بنا پر ایک نماز کو دوسری نماز کے وقت میں ادا کرنے سے اشتراک وقت ثابت نہیں ہو جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں عورتوں کے ساتھ بارہا ایسا معاملہ پیش آیا لیکن آپ نے کسی کو عصر کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: محلی ابن حزم: 198/2 وفتاوی الدين الخالص: 61/3 (عثمان منیب)۔

[2] مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية رحمہ اللہ: 335/23.

کے سبب خارج ہوتا ہے۔ مستحاضہ کے معاملہ میں کچھ اشکال ہوتا ہے کیونکہ کبھی حیض کا خون استحاضہ کے خون کے مشابہ ہوتا ہے۔ جس وقت خون مسلسل یا اکثر اوقات میں خارج ہو تو کیا اسے حیض سمجھے گی یا اسے استحاضہ قرار دے گی جس کی وجہ سے نماز اور روزہ نہ چھوڑے گی؟ مستحاضہ کے احکام پاک عورتوں والے ہیں، جس کی تین حالتیں ہیں:

◢ اگر کسی عورت کو پہلی مرتبہ استحاضہ کا خون آیا اور اس کے حیض کے ایام مقرر ہیں، مثلاً: اسے ہر ماہ کے شروع یا درمیان میں پانچ یا آٹھ دن حیض آتا ہے تو یہ مقررہ دن اس کے ایام حیض شمار ہوں گے، ان میں نماز روزہ چھوڑ دے گی اور اس پر حیض کے دیگر جملہ احکام جاری ساری ہوں گے، جب اس کی عادت اور معمول کے مطابق ایام حیض پورے ہو جائیں گے تو وہ غسل کر کے نماز ادا کرے گی اور بقیہ خون ''استحاضہ'' شمار ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«اُمْكُثِي قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكِ حَيْضَتُكِ ثُمَّ اغْتَسِلِي وَصَلِّي»

''تو جتنا عرصہ حیض کی وجہ سے رکا کرتی تھی اتنے دن رک جا پھر غسل کر اور نماز پڑھ۔''[1]

اور آپ نے سیدہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«إِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَّلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلَاةَ»

''استحاضہ ایک رگ کا خون ہے، حیض نہیں۔ جب تجھے حیض آئے تو نماز چھوڑ دے۔''[2]

◢ اگر کسی عورت کی ایام حیض کے سلسلہ میں کوئی عادت اور معمول مقرر نہیں لیکن اس کے خون میں امتیازی اوصاف موجود ہیں، مثلاً: سیاہ، گاڑھا اور بدبودار ہو تو حیض ہے، اس میں نماز روزہ چھوڑ دے گی۔ اگر وہ سرخ ہو اور وہ گاڑھا بدبودار نہ ہو تو اس صورت میں وہ استحاضہ کا خون ہوگا، جس میں نماز روزہ نہ چھوڑے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ بنت ابی حبیش کو فرمایا تھا:

«إِذَا كَانَ دَمُ الْحَيْضِ فَإِنَّهُ دَمٌ أَسْوَدُ يُعْرَفُ، فَإِذَا كَانَ ذٰلِكَ فَأَمْسِكِي عَنِ الصَّلَاةِ فَإِذَا كَانَ الْآخَرُ فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي»

''جب حیض کا خون آئے جو سیاہ رنگت سے پہچانا جاتا ہے، جب یہ ہو تو نماز پڑھنے سے رک جا، جب

[1] صحيح مسلم، الحيض، باب المستحاضة وغسلها وصلاتها، حديث: 334. [2] صحيح البخاري، الوضوء، باب غسل الدم، حديث: 228، وصحيح مسلم، الحيض، باب المستحاضة وغسلها وصلاتها، حديث: 333.

دوسری قسم کا ہو تو وضو کر اور نماز پڑھ۔''[1]

اس روایت سے واضح ہوا کہ عورت علامات وصفات سے استحاضہ اور حیض میں آسانی سے امتیاز و فرق کر سکتی ہے۔

جب کسی عورت کی ایام حیض کے سلسلہ میں کوئی سابقہ عادت اور معمول نہ ہو اور اسے حیض اور استحاضہ کی تمیز بھی نہ ہو تو وہ گمان غالب کے مطابق ایک ماہ کے چھ یا سات دن حیض کے سمجھ لے کیونکہ اکثر خواتین کے ایام حیض اسی قدر رہوتے ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«إِنَّمَا هِيَ رَكْضَةٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ، فَتَحَيَّضِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ فِي عِلْمِ اللهِ، ثُمَّ اغْتَسِلِي، فَإِذَا رَأَيْتِ أَنَّكِ قَدْ طَهُرْتِ وَاسْتَنْقَأْتِ، فَصَلِّي أَرْبَعًا وَّعِشْرِينَ لَيْلَةً، أَوْ ثَلَاثًا وَّعِشْرِينَ لَيْلَةً وَّأَيَّامَهَا، وَصُومِي وَصَلِّي فَإِنَّ ذٰلِكِ يُجْزِئُكِ، وَكَذٰلِكِ فَافْعَلِي كَمَا تَحِيضُ النِّسَاءُ»

''استحاضہ کا آنا شیطان کا اثر ہوتا ہے تو اللہ کے علم کے مطابق تو چھ یا سات دن ایامِ حیض سمجھ لے، پھر غسل کر اور جب تو اچھی طرح پاک وصاف ہو جائے تو چوبیس یا تیئیس دن تک روزہ رکھ اور نماز پڑھ، تیرے لیے یہ کافی ہے اور اسی طرح کر جس طرح حیض والی عورتیں کرتی ہیں۔''[2]

گزشتہ بحث کا حاصل یہ ہے کہ جس عورت کے دن مقرر اور معروف ہیں اس کے وہی دن ''ایام حیض'' شمار ہوں گے اور جو عورت دونوں خونوں میں امتیاز کر سکتی ہے تو وہ امتیاز کر کے صورت حال کے مطابق عمل کرے۔ اور جس عورت کے حیض کے دن مقرر نہ ہوں اور نہ وہ خون میں فرق وتمیز کر سکتی ہو تو اس کے ایام حیض چھ یا سات دن قرار پائیں گے۔ یہ تطبیق کی ایک ایسی صورت ہے جس میں مستحاضہ کے بارے میں نبی ﷺ سے منقول تینوں طریقے جمع ہو جاتے ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''علماء کے اقوال کے مطابق جن علامات سے حیض کے خون کی تعیین

[1] سنن أبي داود، الطهارة، باب من قال توضأ لكل صلاة، حديث: 304، وسنن النسائي، الطهارة، باب الفرق بين دم الحيض والاستحاضة، حديث: 217,216، وصحيح ابن حبان (الإحسان) الطهارة، باب الحيض والاستحاضة: 318/2، حديث: 1345، والمستدرك للحاكم: 174/1، حديث: 618. [2] جامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء في المستحاضة: أنها تجمع بين الصلاتين بغسل واحد، حديث: 128، وسنن أبي داود، الطهارة، باب إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة، حديث: 287، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب ما جاء في البكر إذا ابتدأت مستحاضة أو كان لها أيام حيض فنسيتها، حديث: 627.

ہوسکتی ہے، وہ چھ ہیں۔ ان میں سے ایک علامت عادت ہے۔ عادت و معمول سب سے قوی علامت ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ حیض ختم ہو چکا ہے تو جاری خون کو حیض ہی سمجھا جائے گا۔ یا دوسری علامت تمیز ہے۔ سیاہ، گاڑھے اور بدبودار خون کو حیض کا خون کہنا سرخ اور پتلے خون سے زیادہ مناسب ہے۔ تیسری علامت عورتوں کی غالب اور عام عادت ہے کیونکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ فرد واحد پر اکثریت کے احکام ہی جاری ہوتے ہیں۔ یہ تین علامات ایسی ہیں جو سنت اور قیاس سے ثابت ہوتی ہیں۔''

پھر شیخ موصوف نے بقیہ تین علامات کا ذکر کیا اور آخر میں فرمایا: ''سب سے درست اور مناسب قول یہ ہے کہ ان علامات کا اعتبار و لحاظ کیا جائے جن کے بارے میں سنت نے وضاحت کر دی ہے اور باقی سب نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔''[1]

مستحاضہ کا حکم: ① جب اس کے (غالب گمان کے مطابق) حیض کے ایام پورے ہو جائیں تو وہ غسل کرے۔

② ہر نماز کے وقت استنجا کرے، فرج سے نکلنے والی آلائشوں اور نجاستوں کو صاف کرے اور انھیں روکنے کے لیے شرم گاہ میں روئی کا استعمال کرے۔ مناسب ہے کہ انڈرویئر پہن لے تا کہ روئی گر نہ سکے۔

③ ہر نماز کے لیے وضو کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے مستحاضہ ہی کے بارے میں فرمایا:

«تَدَعُ الصَّلَاةَ أَيَّامَ أَقْرَائِهَا الَّتِي كَانَتْ تَحِيضُ فِيهَا ثُمَّ تَغْتَسِلُ وَتَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ»

''وہ حیض کے دنوں میں نماز چھوڑ دے۔ جب حیض بند ہو جائے تو غسل کرے اور پھر ہر نماز کے لیے وضو کرے۔''[2]

اور فرمایا:

«أَنْعَتُ لَكِ الْكُرْسُفَ فَإِنَّهُ يُذْهِبُ الدَّمَ»

''میرا مشورہ ہے روئی استعمال کرو کیونکہ وہ خون بند کر دے گی۔''[3]

① مجموع الفتاوٰی لشیخ الإسلام ابن تیمیة رحمه الله: 21/631,630. ② سنن أبي داود، الطهارة، باب من قال تغتسل من طهر إلى طهر، حديث: 297، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء أن المستحاضة تتوضأ لكل صلاة، حديث: 126، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب ما جاء في المستحاضة التي قد عدت أيام أقرائها قبل أن يستمر بها الدم، حديث: 625. ③ سنن أبي داود، الطهارة، باب إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة، حديث: 287، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء في المستحاضة أنها تجمع بين الصلاتين بغسل واحد، حديث: 128، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب ما جاء في المستحاضة التي قد عدت أيام أقرائها......، حديث: 622.

◣ آج کل بازار سے دستیاب ہونے والی حفاظتی طبی اشیاء کا استعمال مناسب ہے۔

نفاس اور اس کے احکام: نفاس اور حیض کے احکام حلت وحرمت میں یکساں ہیں، مثلاً: حیض ونفاس میں فرج میں جماع کے علاوہ بیوی سے تمتع جائز ہے اور دونوں میں جماع حرام ہے۔ نماز روزہ منع ہے، طلاق، طواف کعبہ، تلاوت قرآن اور مسجد میں ٹھہرنا ممنوع ہے۔ دونوں کے انقطاع پر غسل فرض ہے۔ نفاس ہو یا حیض دونوں حالتوں میں نماز کی قضا نہیں، البتہ روزے کی قضا ہے۔

◣ نفاس ایک ایسا خون ہے جو ولادت کے بعد رحم سے آتا ہے۔ یہ مدت حمل کا رکا ہوا بقیہ خون ہوتا ہے۔ نفاس کے خون کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ نفاس والی عورت چالیس روز تک نماز ادا نہ کرے۔ ہاں اگر اس مدت سے پہلے اس کا خون نفاس بند ہو جائے اور اپنی طہارت کا اسے یقین ہو جائے تو غسل کر کے نماز ادا کرے۔''[1]

اب وہ تمام کام کر سکتی ہے جو نفاس کی وجہ سے ممنوع تھے۔

◣ جب حاملہ عورت ایسا ناقص بچہ جنے جس کی شکل وصورت بن چکی ہو اور اس کے فوراً بعد اسے خون آئے تو وہ نفاس کا خون شمار ہو گا۔ واضح رہے عام طور پر تین ماہ کی مدت حمل میں انسان کی تخلیق نمایاں ہو جاتی ہے، جب کہ کم از کم اکیاسی (81) دن ہوتے ہیں۔

◣ اگر عورت کا رحم (بچے کی بجائے) خون کا لوتھڑا باہر ڈال دے، جس میں بچے کی تخلیق اور اس کی شکل وصورت نمایاں نہ ہو تو اس کے بعد رحم سے خارج ہونے والا خون ''نفاس'' نہ ہو گا، لہٰذا وہ نماز، روزہ نہ چھوڑے۔ اسی طرح اس عورت پر نفاس کے دیگر جملہ احکام جاری نہ ہوں گے۔

اہم تنبیہ: یہاں ایک اہم مسئلہ پر تنبیہ کرنا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ بعض عورتیں رمضان المبارک کے روزوں کی تعداد مکمل کرنے کی خاطر یا مناسک حج کی تکمیل کے لیے مانع حیض گولیوں کا استعمال کرتی ہیں۔ اگر ان گولیوں کا استعمال محض اس لیے ہے کہ چند دنوں کے لیے روک لیا جائے اور ایک مقصد پورا ہو جائے، تب تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر ان کا استعمال خون حیض کو ہمیشہ کے لیے بند کرنا ہے تو یہ کام خاوند کی اجازت کے بغیر درست نہیں کیونکہ یہ نسل کو ختم کرنے والا عمل ہے۔[2]

---

[1] جامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء في كم تمكث النفساء، تحت الحديث: 139.

[2] ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے اِلا یہ کہ کوئی اضطراری صورت پیدا ہو جائے۔ (صارم)

یہ حیض سے متعلق چند احکام تھے جو ہم نے سرسری طور پر بیان کیے ہیں مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ اس موضوع پر اگر کسی مسئلہ میں اشکال ہو یا تفصیل درکار ہو تو علماء سے پوچھ لیا جائے، ان کے ہاں اللہ کی توفیق سے مسائل کا حل مل جائے گا۔إن شاء اللہ تعالیٰ.
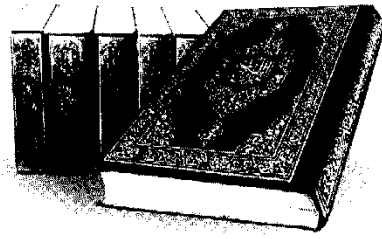
باب 2

نماز کے احکام و مسائل

پانچ نمازوں کی فرضیت

ارکان اسلام میں کلمۂ شہادت کے بعد نماز کی اہمیت اور تاکید سب سے زیادہ ہے۔ نماز عبادت کی کامل اور حسین صورتوں کا مجموعہ ہے۔ نماز عبادت کی بہت سی اقسام پر مشتمل ہے، جیسے ذکر الٰہی، تلاوت قرآن، قیام، رکوع، سجدہ، دعا، تسبیح اور تکبیر وغیرہ۔ نماز بدنی عبادات کی چوٹی ہے۔ اللہ کے رسولوں میں سے کسی کی شریعت نماز سے خالی نہ تھی۔ جملہ احکام شرعیہ میں نماز کا یہ مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ختم الرسل محمد ﷺ پر اس وقت فرض کی جب آپ معراج کی رات آسمان پر گئے تھے۔[1]

یہ خوبی نماز کی عظمت، اس کی اہمیت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بلند مرتبہ و مقام کا ہونا واضح کرتی ہے۔

ہر شخص پر نماز کی فضیلت اور نماز کی فرضیت سے متعلق بہت سی احادیث آتی ہیں حتیٰ کہ دین اسلام میں نماز کی فرضیت بدیہی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا منکر مرتد ہے جسے توبہ کا موقع دیا جائے گا، اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ورنہ اس کو قتل کرنے پر امت مسلمہ کے علماء کا اتفاق ہے۔

نماز کو عربی زبان میں ''صلاۃ'' کہتے ہیں جس کا لغوی معنی ''دعا'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾ ''اے نبی! انھیں دعا دیجیے۔''

نماز کا شرعی اور اصطلاحی معنی: ''وہ مخصوص اقوال و افعال ہیں جن کی ابتدا اللہ اکبر سے اور انتہا سلام پھیرنے سے ہوتی ہے۔'' چونکہ نمازی نماز میں عبادت، ثنا اور طلب و درخواست کی شکل میں اللہ کے حضور دعا میں مشغول رہتا ہے، اس لیے نماز کو عربی زبان میں ''صلاۃ'' کہا جاتا ہے۔

ہجرت سے پہلے معراج کی رات (ہر عاقل، بالغ مسلمان پر دن رات میں) پانچ نمازیں فرض ہوئیں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا ۝﴾

''یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔''[2]

وہ اوقات اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے قول و فعل سے واضح کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

① صحيح البخاري، الصلاة، باب كيف فرضت الصلاة في الإسراء، حديث: 349، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ......، حديث: 162. ② النسآء 4:103.

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾

''انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اسی کے لیے دین کو خالص رکھیں یکسو ہو کر، اور نماز کو قائم کریں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ ''نماز قائم کرو'' کے الفاظ متعدد بار ذکر کر کے نماز کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾

''میرے ایمان دار بندوں سے کہہ دیجیے کہ نماز کو قائم کریں۔''[2]

سورۂ روم میں فرمایا:

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ○ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ○﴾

''پس اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھا کرو جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو۔ تمام تعریفوں کے لائق آسمان وزمین میں صرف وہی ہے، تیسرے پہر کو اور ظہر کے وقت بھی (اس کی پاکیزگی بیان کرو)۔''[3]

جب کسی عاقل بالغ مسلمان پر نماز کا وقت آ جائے تو اس پر نماز فرض ہو جاتی ہے، البتہ اگر کوئی عورت حیض یا نفاس کی حالت میں ہو تو اس پر نماز فرض نہیں ہوتی اور نہ طہارت کے بعد اس کی قضا ہے۔

سویا ہوا جب بیدار ہو یا بے ہوش شخص جب ہوش میں آ جائے تو ان پر قضا دینا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ○﴾ ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''[4]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ نَّسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا ، فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُّصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»

''جو شخص نماز بھول گیا یا سو گیا تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ جب اسے یاد آئے نماز ادا کر لے۔''[5]

چھوٹے بچے کے سرپرست کے لیے ضروری ہے کہ جب بچہ سات برس کا ہو جائے تو اسے نماز کی تلقین کرے باوجودیکہ اس پر نماز فرض نہیں لیکن سرپرست اس کا اہتمام ضرور کرے، اسے نماز کا عادی بنائے، اس سے بچے اور

① البينة 5:98. ② إبراهيم 31:14. ③ الروم 18،17:30. ④ طٰهٰ 14:20. ⑤ صحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة......، حديث: 684.

اس کے سرپرست دونوں کو اجر وثواب ملے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان عام ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾

"جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس گنا ملیں گے۔"[1]

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت چھوٹا بچہ لے کر آئی اور پوچھا: کیا اس کا حج ہوگا؟ آپ نے فرمایا:

«نَعَمْ وَلَكِ أَجْرٌ» "ہاں! اور تیرے لیے اجر ہے۔"[2]

سرپرست اور ولی کو چاہیے کہ بچے کو نماز اور طہارت کے مسائل کی تعلیم دے۔ اگر بچے کی عمر دس برس کی ہو جائے اور وہ نماز میں سستی کرے تو سرپرست اسے مار کر نماز پڑھائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مُرُوا أَبْنَاءَكُمْ بِالصَّلَاةِ لِسَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا لِعَشْرِ سِنِينَ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ»

"تمھارے بچے سات برس کے ہوں تو انھیں نماز کی تلقین کرو۔ جب دس برس کے ہو جائیں اور نماز نہ پڑھیں تو انھیں مارو۔ اور ان کے بستر الگ الگ کر دو۔"[3]

▲ نماز کا وقت ہو جائے تو اس کی ادائیگی میں تاخیر جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝﴾

"یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔"[4]

البتہ سفر وغیرہ میں ظہر کو عصر اور مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھنے کی رخصت ہے۔ لیکن رات کی نماز کو دن میں یا دن کی نماز کو رات میں ادا کرنا درست نہیں۔ اسی طرح نماز فجر کو طلوع آفتاب کے بعد (بلاوجہ) پڑھنا کسی صورت میں (جنابت ہو یا نجاست) جائز نہیں، بلکہ ممکن حد تک اسے جلدی ادا کرنا چاہیے۔

بعض نادان لوگ علاج کی خاطر جب ہسپتال میں بیڈ پر ہوتے ہیں اور وضو کرنے کے لیے نیچے اتر نہیں سکتے یا ناپاک کپڑے تبدیل نہیں کر سکتے یا ان کے پاس تیمّم کے لیے مٹی موجود نہیں ہوتی یا انھیں پانی یا مٹی مہیا کرنے والا کوئی ساتھی نہیں ہوتا تو اس حالت میں نماز کو مؤخر کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ہمارا عذر ختم ہو جائے گا تو تب نماز ادا کر لیں گے۔ اس طرح بسا اوقات وہ کئی ایک نمازیں چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بہت بڑی غلطی اور خطا ہے اور نماز

[1] الأنعام 160:6. [2] صحيح مسلم، الحج، باب صحة حج الصبي وأجر من حج به، حديث: 1336. [3] سنن أبي داود، الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، حديث: 495، ومسند أحمد: 187/2 واللفظ له. [4] النسآء 103:4.

کا ضائع کرنا ہے، جس کا سبب لاعلمی اور مسائل دریافت نہ کرنا ہے۔ ایسے شخص پر لازم ہے کہ وہ ہر حال میں وقت پر نماز ادا کرے اور وہ اسے کفایت کر جائے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ) اگرچہ اس مجبوری کی حالت میں وہ تیمّم نہ کر سکا یا ناپاک کپڑے تبدیل نہ ہو سکے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔''[1]

اگر کسی مریض نے (جو قبلہ کی طرف رخ نہیں کر سکتا) غیر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر لی تو اس کی نماز درست اور صحیح ہو گی۔

جس شخص نے نماز کی فرضیت و اہمیت کا انکار کیے بغیر محض سستی اور کوتاہی سے نماز چھوڑ دی تو اس نے (اہل علم کی صحیح رائے کے مطابق) کفر کا ارتکاب کیا۔ اس بارے میں ایک دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ»

''آدمی اور اس کے کفر کے درمیان فرق، نماز کا چھوڑنا ہے۔''[2]

جو شخص نماز کا تارک ہو، اس کے اس عمل کی عام تشہیر کرنی چاہیے حتیٰ کہ اس رسوائی سے شرمندہ ہو کر نماز ادا کرنے لگے۔ اگر وہ نماز ادا نہ کرے تو اسے سلام نہ کہا جائے، اس کی دعوت قبول نہ کی جائے حتیٰ کہ توبہ کرے اور نماز قائم کرے کیونکہ نماز دین کا ستون ہے اور یہی عمل مسلمان اور کافر کے درمیان فرق و امتیاز کرنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص جب تک نماز ضائع کرتا رہے گا، اس کا کوئی عمل بھی نفع مند اور مفید نہ ہو گا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرتے ہیں۔

اذان اور اقامت کے احکام

کتب احادیث میں پانچ نمازوں کی ادائیگی کے اوقات مقرر ہیں۔ ان اوقات سے پہلے نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ چونکہ اکثر لوگوں کو نماز کا وقت ہو جانے کا علم نہیں ہوتا یا کسی کام میں اس قدر مشغول ہوتے ہیں کہ نماز کی طرف ان کی توجہ نہیں رہتی۔ ان وجوہات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اذان کو مشروع فرمایا ہے۔ تاکہ لوگوں کو نماز کے وقت کی اطلاع ہو جائے۔

[1] التغابن 16:64. [2] صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفرعلى من ترك الصلاة،حديث : 82، وسنن أبي داود، السنة ، باب في رد الإرجاء، حديث :4678 واللفظ له.

◄ اذان کا حکم ہجرت کے پہلے سال ہی جاری ہو گیا تھا۔ اس کی مشروعیت کا یہ سبب تھا کہ عام لوگوں کو نماز کے وقت کا علم نہ ہوتا تھا، چنانچہ اس کے لیے انھوں نے کوئی علامت مقرر کرنے کے لیے باہم مشورہ کیا۔ سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو خواب میں وہ کلمات بتائے گئے جو وحی کے ذریعے اذان کی صورت میں مقرر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جمعہ کے دن نماز کی اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔''[1]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ ﴾ ''اور جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو۔''[2]

◄ اذان اور اقامت ہر ایک میں ذکر کے مخصوص کلمات ہیں جو عقیدہ ایمان پر مشتمل ہیں، اذان کے ابتدائی کلمات میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اس کے جلال وعظمت کا ذکر ہے۔ پھر توحید باری تعالیٰ کا اثبات اور ہمارے نبی محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار واعلان ہے۔ پھر نماز (جو دین اسلام کا ستون ہے) کی ادائیگی کی طرف دعوت عام ہے۔ پھر اس کامیابی کی طرف دعوت ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتوں کی صورت میں جنت میں ملے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی کبریائی و بزرگی کے اعلان کا تکرار ہے۔ اور آخر میں وہ کلمہ اخلاص ہے جسے سب سے افضل اور اعلیٰ ذکر قرار دیا گیا ہے جس کا وزن اس قدر ہے کہ اگر اس کا مقابلہ وموازنہ سات آسمانوں سے اور جو مخلوقات ان میں ہیں اور سات زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے، سے کیا جائے تو یہ کلمہ وزن کے لحاظ سے بڑھ جائے۔

◄ اذان کی فضیلت میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ آپ نے فرمایا:

«اَلْمُؤَذِّنُونَ أَطْوَلُ النَّاسِ أَعْنَاقًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

''روز قیامت مؤذنوں کی گردنیں سب سے اونچی ہوں گی۔''[3]

◄ اذان اور اقامت فرض کفایہ ہے، یعنی ایسا حکم ہے جس کی ادائیگی تمام مسلمانوں پر فرض ہے، لیکن اگر اسے مناسب تعداد افراد ادا کر دیں تو سب کی طرف سے کافی ہوگا۔ وہ گناہ گار نہ ہوں گے۔

① الجمعة 9:62. ② المائدة 58:5. ③ صحيح مسلم، الصلاة، باب فضل الأذان وهرب الشيطان عند سماعه، حديث: 387.

◄ اذان اور اقامت دونوں اسلام کے ظاہری شعار ہیں۔ یہ دونوں چیزیں صرف مردوں کے لیے پانچ نمازوں میں مشروع ہیں، وہ مقیم ہوں یا سفر کی حالت میں ہوں۔ جس ملک یا شہر کے لوگ اذان اور اقامت کو چھوڑ دیں ان سے قتال ہوگا کیونکہ یہ اسلام کے ایسے ظاہری شعائر ہیں جنھیں چھوڑنا اہل اسلام کے لیے جائز نہیں۔

◄ مؤذن کو ان اہم صفات کا حامل ہونا چاہیے: ① اس کی آواز بلند اور اونچی ہو کیونکہ اس سے اعلان کا مقصد بہتر طور پر پورا ہوتا ہے۔ ② مؤذن قابل اعتماد اور امین شخص ہونا چاہیے کیونکہ نماز کا وقت ہو جانے اور روزہ رکھنے یا افطار کرنے میں اس کی اذان پر اعتبار و اعتماد کیا جاتا ہے۔ ③ اسے وقت دیکھنا اور معلوم کرنا آتا ہو تاکہ اول وقت اذان کہہ سکے۔

◄ اذان پندرہ جملوں پر مشتمل ہے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ہمیشہ یہی اذان کہا کرتے تھے۔ مستحب یہ ہے کہ مؤذن اذان کے کلمات ٹھہر ٹھہر کر کہے لیکن انھیں نہ زیادہ لمبا کرے اور نہ کھینچے۔ ہر جملے پر وقف کرے۔ اذان دیتے وقت وہ قبلہ رو ہو۔ اپنی انگلیاں کانوں میں ڈالے تاکہ آواز مزید بلند ہو جائے۔ جب حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ کے کلمات کہے تو دائیں جانب منہ پھیرے۔ اسی طرح جب حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کا جملہ کہے تو بائیں طرف چہرہ پھیرے۔ فجر کی اذان ہو تو حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے بعد اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا جملہ دو مرتبہ کہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ وقت ایسا ہوتا ہے جس میں عموماً لوگ سوتے ہیں۔

◄ مؤذن مسنون اذان کے شروع یا آخر میں کسی قسم کے الفاظ کا اضافہ نہ کرے کیونکہ یہ بدعت ہے، مثلاً: تسبیحات کہنا، اشعار پڑھنا، دعائیہ کلمات کہنا یا اذان سے پہلے یا بعد میں بلند آواز کے ساتھ اَلصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ کہنا۔ یہ سب کام حرام اور بدعت ہیں۔ جو شخص ایسا کرے اس کی تردید کرنا ضروری ہے۔

◄ اقامت گیارہ کلمات پر مشتمل ہے۔ اقامت کے کلمات قدرے جلدی جلدی کہے جائیں کیونکہ اقامت کا مقصد حاضرین کو نماز کے لیے کھڑے ہونے کی اطلاع دینا ہے، اس لیے اقامت کو آہستہ آہستہ اور بلند آواز سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ مستحب یہ ہے کہ جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔ اقامت امام کی اجازت سے کہی جائے کیونکہ اقامت کا دارومدار امام کی صوابدید پر ہے، لہٰذا جب امام کی طرف سے اشارہ ہو تب اقامت کہی جائے۔

◄ وقت سے پہلے اذان نہ کہی جائے کیونکہ اذان کا مقصد نماز کا وقت شروع ہونے کی اطلاع دینا ہے جو وقت سے پہلے اذان دینے سے حاصل نہیں ہوتا۔ نیز اس سے سننے والے کو نماز کے وقت میں مغالطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر صبح کی اذان صبح صادق سے قبل ہو جائے تو جائز ہے تاکہ لوگ پہلے بیدار ہو کر نماز کی تیاری کر لیں۔ لیکن ایسی صورت میں ضروری ہے کہ طلوع فجر کے وقت ایک اور اذان دی جائے تاکہ لوگوں کو نماز، روزے کے وقت کا علم ہو جائے۔

▲ مؤذن کی اذان کا جواب دینا مسنون ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ جو کلمہ مؤذن کہے، سننے والا بھی جواب میں وہی کلمہ دہرائے لیکن حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے جواب میں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کہے۔[1]

جب مؤذن اذان دے کر فارغ ہو جائے تو مؤذن اور سننے والا (دونوں) درود شریف پڑھیں اور پھر یہ دعا پڑھیں:

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّآمَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَّهُ»

''اے اللہ! اے اس مکمل دعوت اور قائم ہونے والی نماز کے رب! محمد ﷺ کو خاص تقرب اور خاص فضیلت عطا فرما اور انھیں اس مقام محمود پر فائز فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔''[2]

▲ جب اذان ہو جائے تب مسجد سے باہر نکلنا جائز نہیں، البتہ اگر کوئی شرعی عذر ہو یا واپس آ جانے کی نیت ہو تو کوئی حرج نہیں۔

▲ اذان کے ابتدائی کلمات سنتے ہی کسی بیٹھے ہوئے شخص کا فوراً کھڑے ہو جانا درست نہیں کیونکہ اس سے شیطان سے مشابہت ہوتی ہے بلکہ وہ آرام سے اذان سنے اور اس کا جواب دے کر مسجد کا رخ کرے اور تمام مصروفیات ترک کر دے۔[3]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوةِ ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝﴾

''ان گھروں میں جن کے ادب و احترام کا اور اللہ تعالیٰ کا نام وہاں لیے جانے کا حکم ہے، وہاں صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز

[1] صحيح مسلم، الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤذن......، حديث: 385. [2] صحيح البخاري، الأذان، باب الدعاء عند النداء، حديث: 614.

[3] اذان سنتے ہی اٹھنے اور بھاگنے میں مسلمان اور شیطان میں فرق ہے۔ پہلا مسجد کی طرف نماز ادا کرنے کے لیے اٹھنا اور بھاگنا ہے جبکہ دوسرا اس کے برعکس ہے، لہٰذا تشبیہ محل نظر ہے۔ (صارم)

قائم کرنے اور زکاۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی، اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گے۔''[1]

شرائط نماز کا بیان

شرط کا لغوی معنی ''علامت'' ہے اور اصطلاحاً شرط وہ ہے جس کے نہ ہونے سے کسی چیز کا نہ ہونا لازم آئے لیکن اس کے وجود سے کسی چیز کی موجودگی لازم نہ ہو۔ شرائط نماز سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کا حصول ممکن ہو تو ان کے بغیر نماز نہیں ہوتی، بلکہ ان میں سے ایک بھی مفقود ہو تو نماز صحیح نہیں ہوتی۔ شرائط نماز کی تفصیل درج ذیل ہے:

① نماز کا وقت ہونا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا ○﴾

''یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔''[2]

اہل اسلام کا اس امر پر اجماع ہے کہ پانچ نمازوں کے اوقات شریعت میں محدود اور مخصوص ہیں، جن سے پہلے (بلا عذر) نماز نہیں ہوتی۔ امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہر نماز کا ایک وقت ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے شرط قرار دیا ہے۔ صحیح نماز وہی ہے جو اس مقرر وقت میں ادا کی جائے۔''

یاد رکھیے! جب کسی نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے تو وہ نماز فرض ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ﴾ ''نماز قائم کریں آفتاب کے ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک۔''[3]

بنابریں علمائے کرام کا اس امر پر اجماع ہے کہ اول وقت میں نماز ادا کرنا افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَٰتِ﴾ ''تم نیکیوں کی طرف دوڑو۔''[4]

نیز اس کا فرمان ہے:

﴿وَسَارِعُوٓا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ ''اور اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو۔''[5]

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالسَّٰبِقُونَ السَّٰبِقُونَ ۙ أُولَٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ○﴾

① النور 24:36، 37. ② النسآء 4:103. ③ بنی إسرآءيل 17:78. ④ البقرة 2:148. ⑤ آل عمران 3:133.

''اور جو آگے والے ہیں وہ تو آگے والے ہی ہیں۔ وہ تو بالکل نزدیکی حاصل کیے ہوئے ہیں۔''[1]

صحیحین میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا، کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا» ''اپنے وقت پر نماز ادا کرنا۔''[2]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ ﴾ ''نمازوں کی حفاظت کرو۔''[3]

نماز کی محافظت میں یہ بھی شامل ہے کہ اسے اول وقت میں ادا کیا جائے۔

دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں اور ہر نماز کا ایک مناسب وقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پسند کیا ہے۔ اور وہ بندوں کے احوال کے اعتبار سے بھی مناسبت رکھتا ہے تاکہ وہ ان اوقات میں نمازیں ادا کر لیں اور دوسرے دنیوی کام اس میں رکاوٹ نہ بنیں بلکہ اس سے دنیوی کاموں میں معاونت ہو اور ان کی لغزشیں معاف ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے پانچ نمازوں کو بہتے ہوئے دریا سے تشبیہ دی ہے، جس میں انسان پانچ وقت غسل کرتا ہے اور اس سے اس کے جسم پر ذرہ بھر میل کچیل نہیں رہتا۔[4]

اوقات نماز کی تفصیل درج ذیل ہے:

- نماز ظہر: نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ ﴾ ''نماز کو قائم کریں آفتاب کے ڈھلنے کے وقت سے۔''[5]

زوال آفتاب کی علامت یہ ہے کہ کسی چیز کا سایہ مغرب کی جانب سے ختم ہو کر مشرق کی جانب آ جائے۔ ظہر کا وقت تب تک ہے جب ہر چیز کا سایہ لمبائی میں ایک مثل ہو جائے۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُولِهِ»

''ظہر کا وقت تب ہوتا ہے جب آفتاب ڈھل جائے حتیٰ کہ آدمی کا سایہ اس کے طول (لمبائی) کے برابر ہو جائے۔''[6]

---

[1] الواقعة 11,10:56. [2] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب فضل الصلاة لوقتها، حديث : 527، وصحيح مسلم، الإيمان ، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، حديث: 85. [3] البقرة 238:2. [4] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب الصلوات الخمس كفارة، حديث : 528، وصحيح مسلم، المساجد، باب المشي إلى الصلاة تمحى به الخطايا و ترفع به الدرجات، حديث : 667. [5] بنی إسرآء يل 78:17. [6] صحيح مسلم، المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس، حديث : 612.

نماز ظہر، اول وقت ادا کرنا مستحب ہے، البتہ سخت گرمی میں مستحب یہ ہے کہ اس میں اس قدر تاخیر کی جائے کہ گرمی کی شدت کا زور ٹوٹ جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ»

''جب گرمی شدید ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو، بے شک گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ میں سے ہے۔''[1]

▲ نماز عصر: جب ظہر کے وقت کی انتہا ہوتی ہے تب نماز عصر کے وقت کی ابتدا ہوتی ہے، یعنی جب ہر شے کا سایہ لمبائی میں ایک مثل ہو جائے۔[2] اور عصر کا آخری وقت اہل علم کے صحیح قول کے مطابق آفتاب کے زرد پڑ جانے تک ہے۔[3] نماز عصر اول وقت ادا کرنا مسنون ہے۔ اسی نماز کو اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾

''نمازوں کی حفاظت کرو بالخصوص درمیان والی نماز کی۔''[4]

میں وسطیٰ نماز کہہ کر اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اور احادیث صحیحہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

▲ نماز مغرب: مغرب کی نماز کا وقت تب شروع ہوتا ہے جب سورج مکمل طور پر غروب ہو جائے اس کا کوئی حصہ کہیں سے نظر نہ آئے۔ غروب آفتاب کی علامت یہ ہے کہ مشرق کی جانب رات کی تاریکی کے آثار نمودار ہو جائیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هَاهُنَا وَأَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَاهُنَا وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ»

''جب اس جانب (مشرق) سے رات آ جائے اور اس (مغرب کی) جانب دن رخصت ہو جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار روزہ افطار کرے۔''[5]

---

[1] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب الإبراد بالظهر في شدة الحر، حديث: 533-536، وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الإبراد بالظهر في شدة الحر ......، حديث: 615. [2] صحيح مسلم، المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس، حديث: 612، وسنن أبي داود، الصلاة، باب في المواقيت، حديث: 393. [3] حدیث میں ہے: [مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ] (صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب من أدرك الفجر ركعة، حديث: 579) ''جس نے غروب آفتاب سے قبل عصر کی ایک رکعت پڑھ لی، اس نے عصر کی نماز پالی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ عصر کا آخری وقت غروب آفتاب تک ہے۔ (صارم) [4] البقرة 2:238. [5] صحيح البخاري، الصوم، باب متى يحل فطر الصائم؟ حديث: 1954، وصحيح مسلم، الصيام، باب بيان وقت انقضاء الصوم و خروج النهار، حديث: 1100.

مغرب کی نماز کا آخری وقت سرخی غائب ہونے تک ہے۔ نماز مغرب کو جلدی اور اول وقت میں ادا کرنا مسنون ہے۔ سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي الْمَغْرِبَ إِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ وَتَوَارَتْ بِالْحِجَابِ»

''رسول اللہ ﷺ نماز مغرب اس وقت ادا کرتے جب سورج پردوں کے پیچھے غروب ہو جاتا۔''[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے اہل علم کا یہی قول ہے۔

▲ **نماز عشاء:** نماز عشاء کا وقت نماز مغرب کے آخری وقت، یعنی سرخی کے غائب ہونے کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے اور طلوع فجر تک رہتا ہے۔ نماز عشاء کا وقت دو طرح کا ہے: ① **مختار وقت:** جو تہائی رات تک رہتا ہے۔ ② **مجبوری کا وقت:** جو تہائی رات سے لے کر طلوع فجر تک ہوتا ہے۔

نماز عشاء کو تہائی رات تک مؤخر کرنا مستحب ہے، بشرطیکہ لوگوں کو اس میں آسانی ہو۔ اگر مشقت ہو تو اسے اول وقت میں ادا کرنا بہتر ہے۔

نماز عشاء ادا کرنے سے پہلے سونا مکروہ ہے کیونکہ اس میں نماز کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح نماز عشاء ادا کرنے کے بعد لوگوں کے ساتھ باتوں میں مشغول ہونا ناپسندیدہ عمل ہے کیونکہ اس سبب سے انسان نہ جلدی سو سکتا ہے اور نہ صبح سویرے نماز کے لیے اٹھ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں نماز عشاء ادا کر کے جلدی سو جانا چاہیے تاکہ رات کے آخری حصے میں نماز تہجد ادا کی جا سکے اور ہشاش بشاش طبیعت سے نماز فجر میں حاضر ہوا جا سکے۔ حدیث میں ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَ الْعِشَاءِ وَالْحَدِيثَ بَعْدَهَا»

''رسول اللہ ﷺ عشاء سے پہلے سونا اور عشاء کے بعد باتیں کرنا ناپسند کرتے تھے۔''[2]

لیکن یہ تب ہے جب عشاء کے بعد جاگنا بے مقصد ہو۔ اگر کوئی مفید مقصد یا اہم ضرورت ہو تو تب جاگنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

① صحيح مسلم، المساجد، باب بيان أن أول وقت المغرب عند غروب الشمس، حديث: 636، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في وقت المغرب، حديث: 164. ② صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب ما يكره من النوم قبل العشاء، حديث: 568، وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب التبكير بالصبح في أول وقتها......، حديث: 647.

نماز فجر: نماز فجر کا وقت طلوع فجر (صبح صادق) سے شروع ہوتا ہے اور طلوع آفتاب تک جاتا ہے۔ جب طلوع فجر کا یقین ہو جائے تب نماز فجر جلدی ادا کرنا مستحب ہے۔

پانچوں نمازوں کے یہ وہ اوقات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ہیں۔ آپ کو ان اوقات کی پابندی کرنی چاہیے۔ نماز وقت سے پہلے پڑھی جائے نہ بعد میں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝﴾

''سو ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔''[1]

یعنی وہ لوگ جو نمازوں کو ان کے اوقات سے مؤخر کرتے ہیں۔

اور فرمایا:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ﴾

''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے کہ انھوں نے نماز ضائع کر دی اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، سو ان کا نقصان ان کے آگے آئے گا۔ بجز ان کے جو توبہ کر لیں۔''[2]

جو شخص بلا شرعی عذر نماز میں تاخیر کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ''غافل اور نماز ضائع کرنے والا'' قرار دیا ہے۔ اور اسے ''ویل اور غيّ'' (وادی جہنم) کی دھمکی دی ہے۔

جو شخص نماز بھول جائے یا سو جائے تو وہ نماز کی قضا میں جلدی کرے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ نَّسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُّصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»

''جو نماز بھول گیا یا سو گیا اور پڑھ نہ سکا اسے جب بھی یاد آئے تو فوراً ادا کر دے یہی اس کا کفارہ ہے۔''[3]

جو نماز قضا ہو جائے اسے حتی الامکان فوراً ادا کر دیا جائے۔ اس کو ادا کرنے کے لیے اگلے دن کی اس کی ہم نام نماز کا انتظار نہ کیا جائے جیسا کہ عوام میں مشہور ہے۔ نیز اس کے لیے ممنوع وقت کے گزارنے کا تکلف نہ کیا جائے بلکہ اسے اسی وقت اور فوراً ادا کر دیا جائے۔

② بدن کو ڈھانپنا: شرائط نماز میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بدن کا وہ حصہ ڈھانپ لیا جائے جس کا چھپانا

① الماعون 107:4، 5. ② مريم 19:59، 60. ③ صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب من نسي صلاة فليصل إذا ذكر ولا يعيد إلا تلك الصلاة، حديث : 597، وصحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة واستحباب تعجيل قضائها، حديث : 684 واللفظ له.

بے حد ضروری ہے اور اس کا ظاہر کرنا قبیح اور باعث شرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ﴾

''اے اولاد آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَقْبَلُ اللهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ»

''اللہ تعالیٰ بالغ عورت کی نماز اوڑھنی کے بغیر قبول نہیں کرتا۔''[2]

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے: جو شخص کپڑا حاصل ہونے کے باوجود ننگا ہو کر نماز پڑھتا ہے، اس کی نماز فاسد ہوگی۔ اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔[3] نماز میں اور لوگوں کے سامنے یا خلوت میں شرمگاہ کو ڈھانپنا لازمی اور ضروری ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اِحْفَظْ عَوْرَتَكَ إِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ أَوْ مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ، قَالَ: قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! إِذَا كَانَ الْقَوْمُ بَعْضُهُمْ فِي بَعْضٍ؟ قَالَ: إِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ لَّا يَرَاهَا أَحَدٌ فَلَا تُرِيَنَّهَا، قَالَ: قُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللهِ! إِذَا كَانَ أَحَدُنَا خَالِيًا؟ قَالَ: فَاللهُ أَحَقُّ أَنْ يُّسْتَحْيٰى مِنْهُ مِنَ النَّاسِ»

''اپنی شرم گاہ کی ہر ایک سے حفاظت کر سوائے بیوی اور لونڈی کے۔'' (راوی کا بیان ہے کہ) میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! جب قوم کے لوگ جمع ہوں تو؟ فرمایا: ''اگر تو طاقت رکھے کہ اسے (شرم گاہ کو) کوئی نہ دیکھ سکے تو ایسا کر۔'' کہا: اگر کوئی الگ تھلگ اکیلا بیٹھا ہو تو؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا زیادہ حق ہے کہ اس سے لوگوں کی نسبت زیادہ شرم کی جائے۔''[4]

اللہ تعالیٰ نے شرم گاہ کو (بلاوجہ) ظاہر کرنے کو فحش سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا فَعَلُواْ فَٰحِشَةٗ قَالُواْ وَجَدۡنَا عَلَيۡهَآ ءَابَآءَنَا وَٱللَّهُ أَمَرَنَا بِهَاۗ قُلۡ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَأۡمُرُ بِٱلۡفَحۡشَآءِ﴾

---

[1] الأعراف 31:7. [2] سنن أبي داود، الصلاة، باب المرأة تصلي بغير خمار، حديث :641، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء لا تقبل صلاة المرأة الحائض إلا بخمار، حديث : 377، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب إذاحاضت الجارية لم تصل إلا بخمار، حديث :655. [3] التمهيد لابن عبدالبر :379/6. [4] سنن أبي داود، الحمام، باب في التعري، حديث :4017، وجامع الترمذي، الأدب، باب ما جاء في حفظ العورة، حديث :2794 واللفظ له.

"اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ نے بھی ہم کو یہی بتایا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ فحش بات کی تعلیم نہیں دیتا۔"[1]

آیت کی شان نزول یہ ہے کہ کفار مکہ ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے تھے اور اسے اپنے دین کا حکم سمجھتے تھے۔ شرم گاہ کو ایک دوسرے کے سامنے ظاہر کرنے اور اسے دیکھنے کی حرکت گھناؤنے گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ برائی کا سبب اور اخلاقی تباہی کا ذریعہ ہے جیسا کہ ان مادر پدر آزاد معاشروں میں دیکھا گیا ہے جہاں تعظیم وتکریم ختم ہو چکی ہے، اخلاقیات کی قدریں پامال ہو چکی ہیں اور بے حیائی عام ہے۔

شرم گاہ کو محفوظ کرنا اور اسے چھپا کر رکھنا، عزت و اخلاق کو قائم رکھنا ہے۔ عزت و شرف کو ختم کرنے کے لیے شیطان اولاد آدم کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے ننگے ہو جائیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس قبیح عمل پر یوں خبردار کیا ہے:

﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ كَمَآ أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ ٱلْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْءَٰتِهِمَآ﴾

"اے اولاد آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے جیسا اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے باہر کرا دیا ایسی حالت میں ان کا لباس بھی اتروا دیا تا کہ وہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھائے۔"[2]

جسم کے قابل ستر حصوں کی نمائش شیطانی مکروفریب کا ایسا جال ہے جس میں بہت سی انسانی سوسائیٹیاں پھنس چکی ہیں۔ وہ اسے ترقی اور فن کا نام دیتی ہیں۔ نوبت بایں جا رسید کہ مادر زاد ننگے لوگوں کی انجمنیں بن چکی ہیں۔ عورتوں میں بے پردگی عام ہوگئی ہے اور وہ مردوں کے سامنے اپنے جسم کی نمائش کرنے لگی ہیں۔ اور انھیں اس پر ذرہ بھر شرم وحیا محسوس نہیں ہوتی۔

اے مسلمان! بدن کے قابل ستر حصوں کو ایسی چیز کے ساتھ چھپا کر رکھنا ضروری ہے جس سے بدن کی نمائش نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَٰرِى سَوْءَٰتِكُمْ﴾

"اے آدم کی اولاد! ہم نے تمھارے لیے لباس پیدا کیا جو تمھاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے۔"[3]

اس آیت سے واضح ہوا کہ ستر کو، چھپانے والے لباس سے ڈھانپنا فرض ہے اور اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

① الأعراف 7:28. ② الأعراف 7:27. ③ الأعراف 7:26.

مرد کا ستر (چھپانے کے قابل حصہ) ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصہ ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَكْشِفْ فَخِذَكَ وَلَا تَنْظُرْ إِلٰى فَخِذِ حَيٍّ وَّلَا مَيِّتٍ»

''اپنی ران ظاہر نہ کر اور نہ کسی زندہ یا میت کی ران دیکھ۔''[1]

ایک اور روایت میں یوں ہے:

«غَطِّ فَخِذَكَ فَإِنَّ الْفَخِذَ عَوْرَةٌ» ''اپنی ران ڈھانپ کر رکھو کیونکہ ران شرم گاہ (میں سے) ہے۔''[2]

ان فرامین کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ مختلف کھیلوں میں شرم گاہ پر چھوٹا سا کپڑا (رومالی یا جانگیہ وغیرہ) باندھ لیتے ہیں، حالانکہ اس سے نصوص شرعیہ کی کھلی مخالفت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو خبردار رہنا چاہیے اور احکام شرعیہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ جس صورت میں نصوص شرعیہ کی مخالفت لازم آتی ہو اسے قابل التفات نہیں سمجھنا چاہیے۔ عورت کا سارا وجود ہی قابل ستر ہے، یعنی پردے میں رکھنے کے قابل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ» ''عورت کا سارا وجود ہی قابل ستر ہے۔''[3]

اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ عورت لمبی قمیص اور دوپٹے کے ساتھ نماز پڑھ لے جب کہ تہبند نہ پہنا ہوا ہو؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغًا يُغَطِّي ظُهُورَ قَدَمَيْهَا»

''ہاں! لیکن قمیص اس قدر لمبی ہو کہ قدموں کے بالائی حصوں کو ڈھانپ لے۔''[4]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ»

''اللہ تعالیٰ بالغ عورت کی نماز اوڑھنی کے بغیر قبول نہیں فرماتا۔''[5]

[1] سنن أبي داود، الجنائز، باب في ستر الميت عند غسله، حديث :3140، وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في غسل الميت، حديث :1460، وصحيح الجامع الصغير للألباني، حديث:7440. [2] جامع الترمذي، الأدب، باب ما جاء أن الفخذ عورة، حديث : 2798 ، ومسند أحمد : 479/3و290/5، والمعجم الكبير للطبراني: 271/2، حديث: 2138 واللفظ له. [3] جامع الترمذي، الرضاع، باب استشراف الشيطان المرأة إذا خرجت، حديث: 1173. [4] [ضعيف] سنن أبي داود، الصلاة، باب في كم تصلي المرأة، حديث :640. [5] سنن أبي داود، الصلاة، باب المرأة تصلي بغير خمار، حديث :641، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب إذا حاضت الجارية لم تصل إلا بخمار، حديث :655.

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہلِ علم کا اس پر عمل ہے کہ عورت جب بالغ ہو جائے اور نماز میں اس کے بال ننگے ہوں تو اس کی نماز نہیں ہو گی۔ ①

مندرجہ بالا احادیث کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات بھی ہیں:

﴿وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ﴾

''اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جواز خود ظاہر ہے۔ اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مارے رہیں اور اپنی آرائش کو ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے خاوندوں کے۔'' ②

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ﴾

''اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں۔'' ③

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ﴾

''جب تم نبی ﷺ کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو۔ تمھارے اور ان کے دلوں کے لیے کامل پاکیزگی یہی ہے۔'' ④

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّونَ بِنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ مُحْرِمَاتٌ، فَإِذَا حَاذَوْا بِنَا سَدَلَتْ إِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَأْسِهَا عَلَى وَجْهِهَا، فَإِذَا جَاوَزُونَا كَشَفْنَاهُ»

''حاجیوں کے قافلے ہمارے قریب سے گزرتے اور ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں حالتِ احرام میں ہوتیں۔ جب ان کا گزر ہمارے قریب سے ہوتا تو ہم چہروں پر پردہ ڈال لیتیں، جب وہ آگے نکل جاتے تو پردہ اٹھا لیتیں۔'' ⑤

① جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء لا تقبل صلاة المرأة الحائض إلا بخمار، حديث: 377. ② النور 24:31. ③ الأحزاب 33:59. ④ الأحزاب 33:53. ⑤ سنن أبي داود، المناسك، باب في المحرمة تغطي وجهها، حديث: 1833، وسنن ابن ماجه، المناسك، باب المحرمة تسدل الثوب على وجهها، حديث: 2935، ومسند أحمد: 6/30.

درج بالا آیات و احادیث کے علاوہ قرآن وحدیث میں اور بھی بہت سے مشہور و معروف ایسے دلائل ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ غیر محرموں کے سامنے عورت کو اپنا جسم مکمل طور پر ڈھانپنا چاہیے۔ نماز ہو یا غیر نماز کسی حالت میں بھی (ان کی موجودگی میں) اسے اپنے بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ اگر عورت خلوت میں ہو اور کوئی اجنبی آدمی وہاں نہ ہو تو وہ نماز میں اپنا چہرہ کھول سکتی ہے کیونکہ حالت نماز میں چہرہ ستر نہیں۔ صرف غیر محرم کے سامنے اس کا چہرہ پردے کے لائق ہے، جسے دیکھنا ان کے لیے جائز نہیں۔

نہایت افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ آج کے دور میں بہت سی مسلمان خواتین کافر اور مرتد عورتوں کی تقلید میں پردے کے بارے میں کمزوری اور سستی کا مظاہرہ کر رہی ہیں، بلکہ جسم کی بے جا نمائش میں مسابقت تک نوبت پہنچ چکی ہے۔ وہ ایسا لباس پہن رہی ہیں جو جسم کو مکمل طور پر نہیں ڈھانپتا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ.

اللہ تعالیٰ نے انسان کو حالت نماز میں ضروری پردہ سے بڑھ کر زینت کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾

''اے اولاد آدم! تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔''[1]

یہ حکم اس امر پر واضح دلیل ہے کہ مسلمان کے لائق یہ ہے کہ وہ نماز میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوتے وقت صاف ستھرے اور نفیس کپڑے پہنے تاکہ اس کی ظاہری اور باطنی حالت مکمل طور پر اس کے شایان شان ہو۔

③ نجاست سے اجتناب کرنا: نماز کی صحت کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ نمازی ہر قسم کی نجاست سے احتراز و اجتناب کرے۔ اس کا بدن، کپڑے اور نماز کی جگہ پاک وصاف ہو۔

▲ نجاست ایسی مخصوص گندگی ہے جس کی معمولی مقدار بھی نماز کے لیے مانع ہے، جیسے مردار، خون، شراب، پیشاب اور پاخانہ وغیرہ۔[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝﴾ ''اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کر۔''[3]

امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے ان الفاظ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے: ''اپنے کپڑے پانی کے ساتھ دھوئیے۔''[4]

---

① الأعراف 7:31.

② درست بات یہی ہے کہ یہ دونوں چیزیں: مردار اور خون حرام تو ہیں لیکن نجس (پلید) نہیں ہیں ہاں، حیض کا خون نجس ہے۔ تفصیل کے لیے علامہ شوکانی کی کتاب السیل الجرار (1/137-140) دیکھیے۔

③ المدثر 74:4. ④ تفسیر ابن جریر الطبري، المدثر 74:4.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَنَزَّهُوا مِنَ الْبَوْلِ فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ»

''پیشاب کی چھینٹوں سے بچو کیونکہ عام طور پر قبر کا عذاب اسی وجہ سے ہوتا ہے۔''[1]

اگر کسی عورت کے کپڑے کو حیض کا خون لگ جائے اور وہ اس میں نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتی ہو تو آپ ﷺ نے اس کپڑے کو دھونے کا حکم دیا ہے۔ جوتے پہن کر نماز ادا کرنے کی صورت میں جوتوں کو زمین پر رگڑنے کا حکم فرمایا ہے۔ مسجد میں کوئی پیشاب کر دے تو اس جگہ پر پانی بہانے کو کہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے دلائل ہیں جو اجتناب نجاست پر دلالت کرتے ہیں، لہٰذا نمازی کے بدن، کپڑے یا نماز کی جگہ پر اگر نجاست کا وجود ہو تو اس کی نماز نہ ہو گی۔ اسی طرح اگر اس نے کوئی ایسی چیز اٹھائی ہو جس میں نجاست ہو تو اس حال میں بھی اس کی نماز درست نہ ہو گی۔

اگر کسی نے ادائیگی نماز کے بعد اپنے وجود پر نجاست دیکھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ کب کی ہے تو اس کی ادا شدہ نماز درست ہو گی۔ اسی طرح اگر ایک شخص کو ادائیگی نماز سے قبل نجاست کا علم تھا لیکن اس نے بھول کر اسی طرح نماز ادا کر لی تو بھی قول راجح کے مطابق اس کی نماز ہو جائے گی، اگر کسی کو دوران نماز نجاست کا علم ہوا تو اگر عمل کثیر کے بغیر اسے زائل کرنا ممکن ہو تو نماز کی حالت میں ہی زائل کر دے اور نماز جاری رکھے، جیسے نجس جوتے کو اتارنا یا نجس پگڑی کو کھول دینا یا اتار دینا۔ اگر اس نجاست کو نماز کے دوران صاف کرنا یا الگ کرنا ممکن نہ ہو تو اس کی نماز باطل ہو گی۔

قبرستان میں نماز جنازہ کے علاوہ اور کوئی نماز ادا کرنا درست نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَّامَ»

''قبرستان اور حمام (غسل خانہ) کے سوا زمین کا ہر حصہ نماز کی ادائیگی کے لائق ہے۔''[2]

آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ وَلَا تَجْلِسُوا عَلَيْهَا»

---

[1] سنن الدارقطني: 126/1، حديث: 452، وصحيح الجامع للألباني، حديث: 3002. [2] جامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء أن الأرض كلها مسجد إلا المقبرة والحمام، حديث: 317، وسنن أبي داود، الصلاة، باب في المواضع التي لا تجوز فيها الصلاة، حديث: 492، وسنن ابن ماجه، المساجد والجماعات، باب المواضع التي تكره فيها الصلاة، حديث: 745، ومسند أحمد: 83/3.

''قبروں کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو۔''[1]

اور ارشاد فرمایا:

«فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ» ''قبروں کو نماز کی جگہ نہ بناؤ۔''[2]

قبرستان میں نماز سے ممانعت کی وجہ نجاست کا خوف نہیں ہے بلکہ قبر پرستی اور قبر کی تعظیم کا اندیشہ ہے۔ اس کا مقصد مُردوں کی عبادت کے راستوں کو بند کرنا ہے، البتہ نماز جنازہ قبرستان میں ادا کرنا مستثنیٰ کر دیا گیا ہے کیونکہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا عمل موجود ہے جو نہی کی تخصیص ہے۔ واضح رہے قبرستان اور اس کے اردگرد کی کھلی جگہ جہاں تک قبرستان شمار ہوتا ہے وہاں تک نماز ادا کرنا ممنوع ہے کیونکہ نہی کا اطلاق اس ساری جگہ پر ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قبر پر بنی ہوئی مسجد سے متعلق فرمایا ہے: ''اس میں فرض یا نفل کوئی نماز ادا نہ کی جائے۔ اگر مسجد قبر سے پہلے بنی ہو تو اس قبر کو ختم کر دیا جائے، یا تو قبر کو زمین کے برابر کر دیا جائے یا پھر اگر قبر نئی ہو تو میت کو اس سے نکال کر دوسری جگہ دفن کر دیا جائے۔ اور اگر قبر مسجد سے پہلے بنی ہو تو مسجد گرا دی جائے یا قبر کی شکل و صورت مٹا دی جائے۔''[3]

- اگر کسی مسجد کے قبلے کی جانب قبر ہو تو نماز ادا کرنا درست نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ» ''قبروں کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو۔''[4]

- لیٹرین میں بھی نماز ادا کرنا منع ہے کیونکہ وہ جگہ نجاست ہی کے لیے بنائی گئی ہے۔ نیز شارع علیہ السلام نے وہاں ذکر الٰہی کرنے سے منع فرمایا ہے تو نماز بطریق اولیٰ منع ہے۔ علاوہ ازیں وہاں شیطان حاضر ہوتے ہیں۔

- حمام، یعنی باتھ روم میں نماز ادا کرنا ممنوع ہے کیونکہ وہ نہانے دھونے کی جگہ ہے۔ وہاں انسان بے پردہ ہوتا ہے اور شیطانوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ یہ ممانعت دروازے کے اندر کی تمام جگہ کو شامل ہے۔

- اونٹوں کے مسکن (باڑے) میں بھی نماز پڑھنا منع ہے۔ شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اونٹوں کے باڑے میں نماز کی ممانعت، اس لیے ہے کہ وہ شیطانوں کی آماجگاہ ہے جس طرح حمام میں

---

(1) صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن الجلوس على القبر والصلاة عليه، حديث :972، وسنن أبي داود، الجنائز، باب في كراهية القعود على القبر، حديث :3229. (2) صحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور......، حديث :532. (3) مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 195/22 بتغيير يسير. (4) صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن الجلوس على القبر والصلاة عليه، حديث :972.

نماز کی ممانعت ہے کیونکہ وہ جگہ شیطانوں کا مسکن ہے، لہٰذا جو جگہ ارواح خبیثہ کا مسکن ہو وہاں ادائیگی نماز سے اجتناب کرنا ہر صورت لازم ہے۔‘‘

◄ جس جگہ تصاویر آویزاں یا چسپاں ہوں وہاں نماز ادا کرنا مکروہ ہے، چنانچہ اس بارے میں امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’تصاویر والے مقام میں نماز ادا کرنے کی کراہت حمام میں نماز کی کراہت سے بڑھ کر ہے کیونکہ حمام میں نماز پڑھنا، یا تو اس لیے مکروہ ہے کہ وہاں نجاست کا امکان ہوتا ہے، یا اس لیے مکروہ ہے کہ وہ شیطان کا ٹھکانا ہے اور یہ وجہ زیادہ صحیح ہے لیکن جہاں تصویریں ہوں وہاں شرک کا امکان ہے۔ مختلف اقوام زیادہ تر تصویروں اور قبروں کی وجہ سے ہی شرک میں مبتلا ہوئیں۔‘‘[1]

اے مسلمان بھائی! اپنی نماز پر توجہ دیجیے۔ نماز میں داخل ہونے سے پہلے نجاست دور کیجیے۔ اور جس جگہ پر نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے، رک جائیے تاکہ تمھاری نماز شریعت کے مطابق ہو۔ احکام نماز کی تعمیل میں سستی اور کوتاہی نہ کیجیے۔ تمھاری نماز تمھارے دین کا ستون ہے۔ جب ستون قائم ہے تو دین قائم ہے اور جب یہ کمزور ہوگا تو تمھارا دین کمزور پڑ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے کاموں کی توفیق دے جن میں خیر اور استقامت ہو۔ آمین!

④ استقبال قبلہ: شرائط نماز میں ایک شرط ’’کعبہ کی طرف منہ کرنا‘‘ بھی ہے۔ کعبہ کو ’’قبلہ‘‘ اس لیے کہا جاتا ہے کہ لوگ (حالت نماز میں) ادھر رخ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾

’’آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور آپ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔‘‘[2]

◄ جو شخص کعبہ کے قریب ہے اور اسے دیکھ رہا ہے تو وہ اپنا بدن اور چہرہ عین کعبہ کی جانب کرے کیونکہ وہ واقعتاً ایسا کر سکتا ہے۔

◄ جو شخص کعبہ کے قریب ہو لیکن کسی رکاوٹ کی وجہ سے اسے دکھائی نہ دے تو وہ جس حد تک ممکن ہو کعبہ کی طرف سیدھا رخ کرے اور خود کو سامنے رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرے۔

◄ جو شخص کعبہ سے دور زمین کی کسی بھی جہت میں ہو تو وہ شخص اپنی نماز میں کعبہ کی جہت اور سمت کی طرف منہ کرے۔ اگر اس میں دائیں بائیں ہو جانے کی وجہ سے معمولی سا فرق پڑ گیا تو حرج نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

---

① زاد المعاد لابن القیم: 3/458. ② البقرة 2:144.

«مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ» ''مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔''[1]

واضح رہے کہ آپ کا درج بالا فرمان اہل مدینہ کے لیے اور ان لوگوں کے لیے ہے جن کی سمت اہل مدینہ کے مطابق ہے، البتہ جو لوگ کعبہ کی مشرق اور مغرب والی سمتوں میں رہتے ہیں ان کا قبلہ جنوب اور شمال کے درمیان ہے۔

▲ استقبال قبلہ کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾

''اور آپ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔''[2]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان زمین پر ہو یا فضا میں، جنگل میں ہو یا سمندر میں، مشرق میں ہو یا مغرب میں، شمال میں ہو یا جنوب میں، بہرصورت نماز میں کعبہ کی جانب رخ کرنا ہوگا، البتہ اگر کوئی شخص استقبال قبلہ سے عاجز ہو جیسے بندھا ہوا کوئی شخص جو کعبہ کی طرف چہرہ نہ کر سکتا ہو تو وہ حسب طاقت کوشش کر کے نماز ادا کرے کیونکہ اس کی بے بسی کی وجہ سے استقبال کعبہ کی شرط ختم ہو جائے گی۔ اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔

▲ اسی طرح گھمسان کی جنگ ہو یا سیلاب، آگ، درندے یا دشمن کا خوف ہو یا ایسا مریض ہو جو قبلہ رخ ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو یہ لوگ حسب حال نماز ادا کر لیں، اگر قبلہ کی طرف رخ نہ بھی ہو تو ان کی نماز ہو جائے گی کیونکہ یہ حضرات استقبال کعبہ کی شرط کو قائم رکھنے سے عاجز ہیں، لہٰذا یہ شرط ان کے حق میں ساقط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

''جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو حسب استطاعت اس پر عمل کرو۔''[4]

حدیث شریف میں ہے: ''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حالتِ خوف میں جیسے بھی ممکن ہوتا نماز ادا کر لیتے تھے، چاہے

---

[1] جامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء أن ما بين المشرق والمغرب قبلة، حديث: 342-344، وسنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب القبلة، حديث: 1011. [2] البقرة 2:144. [3] التغابن 64:16. [4] صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، حديث: 7288، و صحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، حديث: 1337.

قبلہ کی طرف رخ ہو یا نہ ہو۔‘‘[1]

▲ جب کعبہ کی سمت کا علم نہ ہو تو متعدد اشیاء سے راہنمائی لی جا سکتی ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں: ① جب کوئی عاقل، بالغ، معتبر اور با اعتماد شخص سمت قبلہ کی خبر دے دے تو اس کی خبر پر عمل کیا جائے گا۔ بشرطیکہ خبر دینے والے شخص کو جانب قبلہ کا یقینی علم ہو۔ ② سمت قبلہ کے بارے میں مساجد کی محرابوں سے بھی راہنمائی لی جا سکتی ہے کیونکہ ان کا رخ بھی قبلہ کی جانب ہوتا ہے۔ ③ سمت قبلہ کا تعین ستاروں سے بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝﴾ ’’اور ستاروں کے ذریعے سے بھی لوگ راہنمائی لیتے ہیں۔‘‘[2]

⑤ نیت کرنا: شرائط نماز میں ایک شرط ’’نیت کرنا‘‘ ہے۔ نیت کا لغوی معنی ’’قصد و ارادہ کرنا‘‘ ہے جب کہ شرعی معنی ’’اللہ تعالیٰ کے ہاں حصول قرب کی خاطر عبادت کرنے کا عزم و ارادہ کرنا‘‘ ہے۔

▲ نیت کا مقام ’’دل‘‘ ہے۔ زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بدعت ہے کیونکہ نہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے اختیار کیا، لہٰذا نمازی کو چاہیے کہ دل ہی سے مطلوب نماز (مثلاً: ظہر یا عصر) کی نیت کرے کیونکہ حدیث شریف میں ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» ’’اعمال کا دارومدار صرف نیتوں پر ہے۔‘‘[3]

▲ نماز ادا کرنے والا تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہی نیت کرے تاکہ نیت عبادت کے ساتھ جمع ہو جائے۔ نماز سے کچھ وقت پہلے بھی نیت کر لی جائے تو مضائقہ نہیں۔

▲ نیت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مکمل نماز تک مسلسل قائم رہے۔ اگر اثنائے نماز میں نیت توڑ دی گئی تو نماز باطل ہو جائے گی۔

▲ اگر کسی شخص نے مقتدی یا منفرد کی حیثیت سے فرض نماز کی نیت کی اور تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کر دی۔ پھر اس نے دوران نماز کسی وجہ سے نفلی نماز کی نیت کر لی تو جائز اور درست ہے، مثلاً: کسی شخص نے بلا جماعت نماز شروع کی تھی، پھر نماز کے دوران (کسی دوسرے شخص کے آ جانے پر) جماعت کی نیت کر لی تو یہ درست ہے۔

① صحيح البخاري، التفسير، سورة البقرة، باب قوله:﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا ......﴾، حديث : 4535، والموطأ للإمام مالك ، صلاة الخوف: 184، وصحيح ابن خزيمة : 90/2، حديث :980. ② النحل16:16. ③ صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ...... ، حديث :1، وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ: إنما الأعمال بالنية......، حديث : 1907.

▲ یاد رکھیے! بعض لوگوں نے نیت کے بارے میں ایسی بدعات جاری کر لی ہیں جن کی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی۔ ایک شخص زبان سے نماز کی نیت کرتا ہے، مثلاً: نماز ظہر ادا کرتے وقت کہتا ہے: ''چار رکعات، فرض اللہ تعالیٰ کے، نماز ظہر، منہ طرف قبلہ شریف کے، پیچھے اس امام کے۔'' اس قسم کے الفاظ وکلمات اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں کہے اور نہ سرًا یا جھرًا الفاظ کے ساتھ نیت کرنا آپ ﷺ سے منقول ہے اور نہ آپ ﷺ نے اس کا حکم دیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نیت کے کلمات ''بلند آواز'' سے کہنا اور انھیں دہرانا قطعاً جائز نہیں۔ جو شخص ان کلمات کو بلند آواز سے کہے اور ساتھ والے نمازی کے لیے تکلیف وتشویش کا باعث ہو تو اسے حقیقتِ مسئلہ سمجھا دیا جائے، اگر باز نہ آئے تو تادیب کے طور پر وہ سزا کا مستحق ہے۔''

پھر آگے چل کر شیخ الاسلام رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بعض متاخرین نے امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول کہ ''نماز سے پہلے زبان سے بولنا ضروری ہے۔'' زبان سے نیت کرنے کے لیے دلیل قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہاں امام موصوف کا مطلب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے کلمات زبان سے ادا کیے جائیں۔ یہ مطلب نہیں کہ نیت کے کلمات زبان سے ادا کیے جائیں۔ ایسا سمجھنے والے حضرات غلطی پر ہیں۔ اکثر شوافع نے امام شافعی رحمہ اللہ کی بات کا یہ مفہوم غلط قرار دیا ہے۔''[1]

نیت کو کلمات کی صورت میں زبان سے ادا کرنا نہ صرف بدعت ہے بلکہ ریاکاری بھی ہے کیونکہ عبادت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے عمل میں اخلاص ہو اور جس حد تک ممکن ہو مخفی رہے اِلاّ یہ کہ اس کے اظہار پر واضح دلیل مل جائے تو وہ جائز ہے۔

ہر مسلمان کے لائق اور زیبا ہے کہ وہ حدود شرعیہ سے واقف ہو۔ سنت نبوی کا عامل ہو اور ہر قسم کی بدعت سے اجتناب کرنے والا بلکہ نفرت رکھنے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سب کو ایسے اعمال کی توفیق دے جو اس کے ہاں محبوب اور پسندیدہ ہوں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

''کہہ دیجیے! کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو اپنی دینداری سے آگاہ کر رہے ہو، اللہ ہر اس چیز سے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے بخوبی آگاہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ دلوں کی نیتوں اور ان کے مقاصد سے خوب واقف ہے۔ اسے نماز اور دیگر عبادات زبان سے بتانے کی ضرورت وحاجت نہیں۔

[1] مجموع الفتاوٰی لشیخ الإسلام ابن تیمیة رحمہ اللہ: 221,218/22. [2] الحجرات 16:49.

نماز کے لیے نکلنے اور چلنے کے آداب

اے مسلمان! آپ کو ان شرعی آداب سیکھنے کی ضرورت ہے جو ادائیگی نماز سے پہلے اس کی تیاری سے متعلق ہیں۔ چونکہ نماز ایک عظیم عبادت ہے، اس لیے دائرہ عبادت میں داخل ہونے سے قبل اس کے مناسب اور شایان شان تیاری از حد ضروری ہے۔

▲ جب آپ با جماعت نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف جائیں تو اطمینان کے ساتھ اور پر وقار طریقے سے چلیں۔ حلم ہو، نگاہ نیچی ہو، آواز پست ہو اور دائیں بائیں دیکھنا کم سے کم ہو۔ صحیحین میں ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا أَتَيْتُمُ الصَّلَاةَ (وَفِي لَفْظٍ: إِذَا سَمِعْتُمُ الْإِقَامَةَ) فَامْشُوا إِلَى الصَّلَاةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ وَالْوَقَارِ وَلَا تُسْرِعُوا فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا»

''جب تم نماز کے لیے آؤ (ایک روایت میں ہے جب تم اقامت سنو) تو اطمینان و سکون اور وقار سے چلو، دوڑ کر نہ آؤ، نماز کا جو حصہ (امام کے ساتھ) مل جائے پڑھ لو اور جو حصہ رہ جائے بعد میں پورا کر لو۔''[1]

صحیح مسلم کی روایت ہے:

«فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا كَانَ يَعْمِدُ إِلَى الصَّلَاةِ فَهُوَ فِي صَلَاةٍ»

''جب کوئی نماز کا ارادہ کرتا ہے (اور اس کی ادائیگی کے لیے چل پڑتا ہے) تو وہ حالت نماز میں ہوتا ہے۔''[2]

▲ آپ نماز کے لیے مسجد میں جلدی آئیں تاکہ تکبیر تحریمہ مل جائے اور جماعت کے ساتھ شروع ہی سے شامل ہو جائیں۔ چلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائیں تاکہ آپ کی نیکیاں زیادہ سے زیادہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا الصَّلَاةُ لَمْ يَخْطُ خَطْوَةً إِلَّا رُفِعَتْ لَهُ بِهَا دَرَجَةٌ وَّحُطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةٌ»

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب قول الرجل: فاتتنا الصلاة، حديث: 635، و باب لا يسعى إلى الصلاة وليأتها بالسكينة والوقار، حديث: 636، وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب إتيان الصلاة بوقار وسكينة......، حديث: 602. [2] صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب إتيان الصلاة بوقار وسكينة ......، حديث :602.

''جب کوئی شخص اچھی طرح مکمل وضو کرتا ہے اور مسجد کی طرف نکلتا ہے اور وہ نماز ہی کے لیے نکلتا ہے تو جب وہ ایک قدم چلتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند کر دیا جاتا ہے اور ایک گناہ مٹا دیا جاتا ہے۔''[①]

- جب آپ مسجد کے دروازے پر پہنچیں تو داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں اندر رکھیں اور یہ دعا پڑھیں:

«أَعُوذُ بِاللهِ الْعَظِيمِ، وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيمِ، وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللهِ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُولِ اللهِ، اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْلِي ذُنُوبِي، وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ»

''میں عظمت والے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کے مبارک چہرے اور اس کی قدیم سلطنت کے ساتھ شیطان مردود کے شر سے پناہ طلب کرتا ہوں۔[②] اللہ کے نام کے ساتھ،[③] محمد ﷺ پر صلاۃ وسلام ہو۔[④] اے اللہ! میرے گناہ معاف کر دے اور میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔''[⑤]

جب آپ مسجد سے نکلیں تو بایاں قدم باہر رکھیں اور مذکورہ دعا پڑھیں، البتہ [وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ] کی جگہ پر یہ الفاظ پڑھیں:

«وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ فَضْلِكَ» ''اے اللہ! میرے لیے اپنے فضل کے دروازے کھول دے۔''[⑥]

اس دعا کی تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ مسجد کی جگہ مقام رحمت ہے اور مسجد سے باہر کی جگہ (بازار وغیرہ) رزق ڈھونڈنے کا مقام ہے۔ اور رزق حلال اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

- جب مسجد میں داخل ہوں تو بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسْ حَتّٰى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ»

---

① صحيح البخاري، الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، حديث : 647، وصحيح مسلم، المساجد، باب صلاة الجماعة من سنن الهدى، حديث : 654. ② سنن أبي داود، الصلاة، باب مايقول الرجل عند دخوله المسجد؟ حديث: 466. ③ سنن ابن ماجه، المساجد والجماعات، باب الدعاء عند دخول المسجد، حديث :771. ④ جامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء ما يقول عند دخوله المسجد؟ حديث:314، وسنن ابن ماجه، المساجد والجماعات، باب الدعاء عند دخول المسجد، حديث : 771. ⑤ صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب ما يقول إذا دخل المسجد؟ حديث: 713، وسنن ابن ماجه، المساجد والجماعات، باب الدعاء عند دخول المسجد، حديث:771. ⑥ سنن ابن ماجه، المساجد والجماعات، باب الدعاء عند دخول المسجد ، حديث :771.

''جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں ضرور پڑھے۔''[1]

پھر آپ بیٹھ جائیں اور جماعت کھڑی ہونے کا انتظار کریں۔ انتظار کے لمحات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تلاوت قرآن مجید میں مشغول رہیں۔ بے مقصد شغل، مثلاً: تشبیک (ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کرنا) وغیرہ سے اجتناب کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الْمَسْجِدِ فَلَا يُشَبِّكَنَّ ، فَإِنَّ التَّشْبِيكَ مِنَ الشَّيْطَانِ»

''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں (نماز کے انتظار میں) ہو تو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسری میں داخل نہ کرے، بے شک انگلیوں کو ایک دوسری میں داخل کرنا (تشبیک) شیطان کی طرف سے ہے۔''[2]

البتہ انتظار نماز کے لمحات کے علاوہ عام حالت میں عمل تشبیک میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے نماز سے سلام پھیرنے کے بعد انگلیوں میں تشبیک کا عمل ثابت ہے۔[3]

نماز کے انتظار کی حالت میں دنیوی باتوں میں مشغول نہ ہوں کیونکہ حدیث میں ہے کہ یہ چیز نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو۔[4] ایک اور روایت میں ہے ''جب تک بندہ نماز کے انتظار میں رہتا ہے تب تک وہ نماز میں ہوتا ہے۔[5] اور فرشتے اس کے حق میں استغفار کرتے ہیں۔''[6] اس لیے اے مسلمان! اس اجر و ثواب کے حصول میں کوتاہی نہ کیجیے، ادھر ادھر کی باتوں اور بے مقصد مشاغل سے قیمتی اوقات و لمحات کو ضائع نہ کیجیے۔

جب نماز کے لیے ''اقامت'' کہی جائے اور مؤذن [قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ] کے کلمات کہے، تب آپ کھڑے ہوں کیونکہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔[7] البتہ اگر آپ ابتدائے اقامت ہی میں کھڑے ہو جائیں

① صحيح البخاري، التهجد، باب ماجاء في التطوع مثنى مثنى، حديث: 1163، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب تحية المسجد بركعتين......، حديث: 715،714. ② سنن أبي داود، الصلاة، باب ما جاء في الهدي في المشي إلى الصلاة، حديث: 562، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في كراهية التشبيك بين الأصابع في الصلاة، حديث: 386، ومسند أحمد: 43/3 واللفظ له. ③ صحيح البخاري، الصلاة، باب تشبيك الأصابع في المسجد وغيره، حديث: 482،481.

④ فاضل مؤلف ﷾ نے اس حدیث کا حوالہ نہیں دیا، ہمارے علم کی حد تک ایسی کوئی حدیث نہیں۔ تاہم یہ بات صحیح ہے کہ نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے اللہ کا ذکر کرنا چاہیے، نہ کہ دنیاوی باتوں میں وقت ضائع کیا جائے۔ (صلاح الدین یوسف)

⑤ صحيح البخاري، الأذان، باب فضل الجماعة، حديث: 647، ومسند أحمد: 348/3. ⑥ مسند أحمد: 352/2.

⑦ مؤلف ﷾ کا کہنا کہ ''رسول اکرم ﷺ ایسا کرتے تھے'' محل نظر ہے کیونکہ مؤذن اقامت کہنے میں امام کے تابع ہے نہ کہ امام کھڑا ہونے میں مؤذن کی اقامت کا جیسا کہ سیدنا بلال ؓ رسول اکرم ﷺ کو جا کر نماز کی اطلاع دیا کرتے تھے۔ حضرت ◄◄

تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ تب ہے جب مقتدی امام کو آتا ہوا دیکھ لے۔ اگر اقامت کے دوران وہ امام کو نہ دیکھے تو کھڑا نہ ہو۔

▲ پہلی صف میں کھڑا ہونے کی کوشش کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي النِّدَاءِ وَالصَّفِّ الْأَوَّلِ ثُمَّ لَمْ يَجِدُوا إِلَّا أَنْ يَّسْتَهِمُوا عَلَيْهِ لَاسْتَهَمُوا»

''اگر لوگوں کو اذان اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کا اجر و ثواب معلوم ہو جائے اور اس کی خاطر انھیں قرعہ اندازی کرنا پڑے تو یہ کام ضرور کریں۔''[1]

اور فرمایا:

«خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا» ''مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے۔''[2]

◄◄ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: أَنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ تُقَامُ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ. ''نماز رسول اکرم ﷺ کے لیے کھڑی کی جاتی تھی۔'' صحیح مسلم، المساجد، باب متی یقوم الناس للصلاۃ؟ حدیث: 605. حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ کو آتا دیکھتے تو تب تکبیر کہتے تھے۔ صحیح مسلم، المساجد، باب متی یقوم الناس للصلاۃ؟ حدیث: 606. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کے لیے قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ کے وقت کھڑا ہونے کی کوئی اصل نہیں ہے۔ جہاں تک مقتدیوں کا تعلق ہے تو ان کا معاملہ بھی امام سے مربوط ہے۔ سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: [إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَقُومُوا حَتّٰى تَرَوْنِي] ''جب نماز کے لیے اقامت ہو تو مجھے دیکھے بغیر کھڑے نہ ہو'' صحیح مسلم، المساجد، باب متی یقوم الناس للصلاۃ؟ حدیث: 604. اور اگر امام مسجد ہی میں موجود ہو تو پھر بھی قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ کے وقت کھڑا ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: فَيَأْخُذُ النَّاسُ مَصَافَّهُمْ قَبْلَ أَنْ يَّقُومَ النَّبِيُّ ﷺ مَقَامَهُ ''لوگ نبی اکرم ﷺ کے مصلی امامت پر کھڑا ہونے سے پہلے ہی صفیں بنا لیتے تھے۔'' امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز کے لیے کھڑے ہونے کے وقت کے تعین کے بارے میں سلف سے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرے خیال میں یہ نمازیوں پر نماز کے لیے کھڑے ہونے کے وقت کے تعین پر منحصر ہے کہ تکبیر شروع ہونے کے بعد جب انھیں آسانی ہو کھڑے ہو جائیں سب لوگوں کا بیک وقت کھڑے ہونا ضروری نہیں۔ (الموطأ: 71/1) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں وارد سلف کے اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حدیث: [لَا تَقُومُوا حَتّٰى تَرَوْنِي] ان کے خلاف حجت ہے اور حَتّٰى تَرَوْنِي مطلق ہے، اسے الفاظ اقامت کے ساتھ مقید نہیں کیا جا سکتا (فتح الباري: 120,119/2) اس سے معلوم ہوا کہ امام ہو یا مقتدی اس کا کھڑا ہونا اقامت کے کسی کلمے کے ساتھ مشروط نہیں۔ واللہ أعلم. (صحیح مسلم، المساجد، باب متی یقوم الناس للصلاۃ؟ حدیث: 605)۔ (عثمان منیب)

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب الاستهام في الأذان، حديث: 615، وصحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها ......، حديث: 437. [2] صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها وفضل الأول فالأول منها......، حديث: 440، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في فضل الصف الأول، حديث: 224.

▲ آپ کو امام کے قریب جگہ لینی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«وَلْيَلِنِي مِنْكُمْ أُولُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى»

''میرے قریب وہ لوگ کھڑے ہوں جو عقل مند اور سمجھ دار ہیں۔''[1]

واضح رہے یہ حکم مردوں کے لیے ہے، البتہ عورتوں کے بارے میں اس کے برعکس حکم ہے، یعنی

«خَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا» ''عورتوں کی آخری صف بہترین صف ہے۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ آخری صف والی عورتوں پر مردوں کی نگاہ نہیں پڑتی۔

▲ نمازیوں کو چاہیے کہ پوری توجہ سے صفیں سیدھی کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«سَوُّوا صُفُوفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصَّفِّ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ»

''اپنی صفوں کو درست کرو کیونکہ صفوں کی درستی سے نماز کی تکمیل ہے۔''[3]

ایک دوسری روایت میں ہے:

«لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَكُمْ أَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوهِكُمْ»

''تم اپنی صفوں کو درست رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے چہروں کے درمیان مخالفت ڈال دے گا۔''[4]

صفوں کی درستی کا مطلب یہ ہے کہ کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ٹخنہ ملا کر صفوں کو سیدھا کیا جائے۔[5]

▲ نمازیوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے درمیان فاصلوں کو حتی الامکان ختم کریں۔ اس کے لیے باہم مل کر اور جڑ کر کھڑے ہوں تاکہ شیطانی سوراخ بند ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ وَتَرَاصُّوا»

---

[1] صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها......، حديث : 432، وسنن أبي داود، الصلاة، باب من يستحب أن يلي الإمام في الصف......، حديث : 674. [2] صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقا متها وفضل الأول فالأول منها......، حديث : 440، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في فضل الصف الأول، حديث: 224. [3] صحيح البخاري، الأذان، باب إقامة الصف من تمام الصلاة، حديث : 723، وصحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها ......، حديث : 433 واللفظ له. [4] صحيح البخاري، الأذان، باب تسوية الصفوف عند الإقامة و بعدها، حديث : 717، وصحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها......، حديث : 436. [5] صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کے پیچھے یوں ہی کھڑے ہوتے تھے۔ صحيح البخاري، الأذان، باب إلزاق المنكب بالمنكب والقدم بالقدم في الصف، حديث :725.

''صفوں کو درست کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اور جڑ کر کھڑے ہو۔''[1]

خود نبی ﷺ صفوں کو درست کرتے اور مقتدیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ یہ امر اس مسئلے کی اہمیت و فائدے کو اجاگر کرتا ہے۔

واضح رہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ملنے اور جڑنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی پاؤں کو کھول کر ٹیڑھا کرے اور دائیں بائیں والے نمازیوں کو تنگی و تکلیف میں ڈال دے کیونکہ اس قسم کی حرکت سے فاصلہ اور کشادگی بند ہونے کی بجائے بڑھتی ہے اور نمازیوں کے لیے باعث تکلیف ہے، جس کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں۔ مسلمانوں کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ نبی ﷺ کی اتباع و اطاعت ہو اور ہر اعتبار سے نماز مکمل ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے اعمال کی توفیق دے جو اس کے ہاں محبوب اور پسندیدہ ہوں۔ آمین!

نماز کے ارکان، واجبات اور سنن کے احکام

نماز ایک عظیم عبادت ہے جو مخصوص اقوال اور افعال سے مل کر ایک اعلیٰ شکل اختیار کرتی ہے۔ اہل علم نے نماز کی تعریف یوں کی ہے:

''نماز کچھ مخصوص اور مقرر اقوال وافعال کا نام ہے، جس کا آغاز تکبیر تحریمہ سے ہوتا ہے اور اختتام سلام پھیرنے پر ہوتا ہے۔''

یہ اقوال وافعال تین قسم کے ہیں۔ ارکان، واجبات اور سنن۔ ہر ایک کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

ارکان: رکن کی یہ اہمیت ہے کہ اگر اسے ارادتاً یا بھول کر چھوڑ دیا جائے تو پوری نماز باطل اور ضائع ہو جاتی ہے یا وہ رکعت باطل ہو جاتی ہے جس میں رکن چھوٹ گیا ہو۔ اور بعد والی رکعت اس کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔ تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیں گے۔

واجبات: اگر واجب عمداً چھوڑ دیا جائے تو نماز باطل ہو جائے گی اور اگر بھول کر رہ جائے تو نماز باطل نہ ہوگی، البتہ سجدہ سہو سے کمی پوری ہو جائے گی۔

سنن: کسی سنت کے عمداً یا سہواً چھوٹ جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی، البتہ نماز کی مسنونہ ہیئت میں نقص لازم آجاتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے کامل نماز ادا کی ہے جس میں جملہ ارکان، واجبات اور سنن کو ادا فرمایا ہے اور امت

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب إقبال الإمام على الناس ...... ، حديث : 719.

سے بھی ایسی ہی نماز پڑھنے کا مطالبہ ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» ''تم ایسے نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[1]

ارکان نماز کی تفصیل ① فرض نماز میں قیام کرنا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ○﴾ ''اللہ کے لیے خشوع وخضوع کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔''[2]

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صَلِّ قَائِمًا فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا ، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ»

''کھڑے ہو کر نماز ادا کرو، اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر ادا کر لو، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر ہی پڑھو۔''[3]

اس سے واضح ہوا کہ طاقت ہو تو فرض نماز میں قیام (کھڑا ہونا) فرض ہے، البتہ بیماری کے باعث کھڑا ہونے پر قدرت نہ ہو تو حسب حال بیٹھ کر یا لیٹ کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

اس طرح کسی خوف میں مبتلا مریض یا ننگا شخص ہو تو ان کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ اور جو شخص کسی عذر کی وجہ سے نماز میں کھڑا نہیں ہو سکتا بلکہ اسے بیٹھنے یا لیٹنے کی ضرورت ہے یا کوئی شخص چھت نیچی ہونے کی وجہ سے نماز میں کھڑا نہیں ہو سکتا اور کسی وجہ سے اس کے لیے چھت سے باہر آنا بھی ممکن نہیں یا کوئی مقرر امام کے پیچھے کھڑے ہو کر لمبی قراءت سننے سے عاجز ہے تو یہ لوگ معقول عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز ادا کر سکتے ہیں۔

اگر امام نے بیٹھ کر نماز ادا کرنا شروع کی تو اس کے مقتدی بھی (امام کی اقتدا کی بنا پر) بیٹھ جائیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب (گھوڑے سے گرنے پر زخمی ہونے کی وجہ سے) بیٹھ کر نماز پڑھائی تھی تو دوسرے نمازیوں کو بھی بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔[4] نفلی نماز کھڑے یا بیٹھے دونوں طرح ادا کرنا جائز ہے، اس میں کھڑا ہونا فرض نہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نفل نماز کبھی بلا عذر بیٹھ کر ادا کر لیا کرتے تھے۔ (البتہ کھڑے ہو کر پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔)

② **تکبیر تحریمہ:** تکبیر تحریمہ، یعنی اللہ اکبر کہنا (اس سے انسان نماز میں داخل ہوتا ہے) نماز کا رکن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

① صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعة والإقامة......، حديث: 631. ② البقرة2:238.
③ صحيح البخاري، التفسير، باب إذا لم يطق قاعدًا صلى على جنب، حديث: 1117، وسنن أبي داود، الصلاة، باب في صلاة القاعد، حديث: 952، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء أن صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم، حديث: 372. ④ صحيح البخاري، الأذان، باب إنما جعل الإمام ليؤتم به، حديث: 689,688، وصحيح مسلم، الصلاة، باب ائتمام المأموم بالإمام، حديث: 411-414.

کا فرمان ہے:

«ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ» ''پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہو اور تکبیر کہہ۔''[1]

ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا:

«تَحْرِيمُهَا التَّكْبِيرُ» ''نماز کی تحریم تکبیر سے ہے۔''[2]

تنبیہ رسول اللہ ﷺ سے قطعاً یہ ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے تکبیر (اللہ اکبر) کے علاوہ کسی اور کلمہ سے نماز شروع کی ہو۔ اللہ اکبر کے علاوہ کوئی دوسرا کلمہ کفایت نہیں کرے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے یہی ثابت ہے۔

③ **قراءت فاتحہ:** رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ» ''جو شخص سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا، اس کی نماز نہیں ہوتی۔''[3]

ثابت ہوا کہ سورۂ فاتحہ نماز کی ہر رکعت کا رکن ہے۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسے ہر رکعت میں پڑھتے تھے۔ حدیث مسيئ الصلاة میں ہے کہ ایک شخص نے درست طریقے سے نماز ادا نہ کی، رسول اللہ ﷺ نے اسے نماز کا طریقہ سکھایا تو اسے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا۔[4]

اب رہا یہ مسئلہ کہ کیا سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہر نمازی پر فرض ہے یا اس کی فرضیت صرف امام یا منفرد کے لیے خاص ہے؟ تو اس میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔ اس بارے میں محتاط فتویٰ یہی ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے سری نمازوں میں بھی فاتحہ پڑھے اور جہری نمازوں میں امام کے سکتوں میں پڑھے۔[5]

④ **ہر رکعت میں رکوع کرنا:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا﴾ ''اے ایمان والو! رکوع و سجدہ کرتے رہو۔''[6]

---

① صحيح البخاري، الاستئذان، باب من رد فقال : عليك السلام ، حديث :6251، وصحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة......، حديث : 397. ② سنن أبي داود، الطهارة، باب فرض الوضوء، حديث:61، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء أن مفتاح الصلاة الطهور، حديث : 3. ③ صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلوات كلها......، حديث : 756، وصحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة......، حديث : 394. ④ سنن أبي داود، الصلاة، باب صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود، حديث: 859، وصفة صلاة النبيﷺ للألباني، ص : 98.

⑤ مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، لہٰذا مقتدی ہر حالت میں سورۂ فاتحہ پڑھے گا، خواہ امام کے سکتوں میں پڑھے یا دوران قراءت۔ (ع۔و)

⑥ الحج 22:77.

علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ سے ہر رکعت میں رکوع کرنا ثابت ہے، لہٰذا کتاب وسنت اور اجماع سے رکوع کی فرضیت ثابت ہے۔[1]

رکوع کا معنی ''جھکنا'' ہے۔ اگر کھڑے شخص کی ہتھیلیاں جھک کر اس کے گھٹنوں تک پہنچ گئیں یا بیٹھ کر نماز ادا کرنے والے شخص کا چہرہ اس کے گھٹنوں کے قریب ہو جائے تو اس کا رکوع ہو جائے گا۔[2]

⑤ رکوع سے اٹھنا اور سیدھا کھڑا ہونا: رکوع سے اٹھنا اور سیدھا کھڑا ہونا، جیسے پہلے (قیام میں) کھڑا ہوا تھا، نماز کا رکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر ہمیشگی فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» ''تم ایسے نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[3]

⑥ سجدہ کرنا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا﴾ ''اے ایمان والو! رکوع وسجدہ کرتے رہو۔''[4]

احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سجدے کا حکم دیا اور خود بھی کیا، نیز فرمایا:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» ''تم ایسے نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[5]

سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں۔ سجدہ کا ہر رکعت میں دو بار ہونا اور سات اعضاء پر ہونا ضروری ہے۔ سات اعضاء یہ ہیں: پیشانی (اس میں ناک بھی شامل ہے)، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں (کی انگلیاں)۔ ان سات اعضاء کا حالتِ سجدہ میں حتی الامکان سجدہ کی جگہ پر لگنا ضروری ہے۔[6]

سجدہ ارکان نماز میں سے سب سے اہم رکن ہے کیونکہ سجدہ کی حالت میں بندہ اپنے رب کے قریب تر ہوتا ہے اور جب بندہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہو تو یہ اس کی سب سے افضل حالت ہوتی ہے۔

⑦ سجدے سے اٹھنا اور دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

---

① احادیث کے عموم سے رکوع پر استدلال کیا جاتا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث اور صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے۔ صحيح البخاري، الأذان، باب سنة الجلوس في التشهد، حديث: 828، وصحيح مسلم، الصلاة، باب مايجمع صفة الصلاة......، حديث: 498.

② رکوع اور سجدے میں سکون واعتدال فرض ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ فاضل مصنف نے اس کی وضاحت آگے چل کر (نویں رکن) کے تحت کی ہے۔ (صارم)

③ صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين...... ، حديث: 631. ④ الحج 22:77. ⑤ صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين ...... ، حديث: 631. ⑥ صحيح البخاري، الأذان، باب السجود على الأنف، حديث: 812، وصحيح مسلم، الصلاة، باب أعضاء السجود والنهي عن كف الشعر والثوب......، حديث: 490.

«وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السَّجْدَةِ لَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَسْتَوِيَ جَالِسًا»

''نبی ﷺ جب سجدہ کر کے سر اٹھاتے تھے تو اس وقت تک دوسرا سجدہ نہ کرتے جب تک برابر ہو کر اطمینان سے بیٹھ نہ جاتے تھے۔''[1]

⑨ **افعال مذکورہ میں اعتدال کا ہونا:** مندرجہ بالا ارکان میں اعتدال اور سکون بھی فرض اور رکن ہے اگرچہ قلیل مقدار ہی میں کیوں نہ ہو۔ کتاب و سنت کے دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص اپنی نماز میں اعتدال و سکون کا اہتمام نہیں کرتا تو وہ ایسے ہے جیسے اس نے نماز پڑھی ہی نہیں، لہٰذا اسے دوبارہ نماز ادا کرنے کا حکم دیا جائے گا۔[2]

⑩ **آخری تشہد پڑھنا اور اس کے لیے بیٹھنا:** نماز کے آخر میں تشہد کے لیے بیٹھنا اور اس میں تشہد کے کلمات پڑھنا نماز کا ایک رکن ہے۔ تشہد کے کلمات [اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ...... عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ][3] تک ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نماز میں یہ کلمات پڑھتے تھے اور آپ کا ارشاد ہے:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» ''تم ایسے نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[4]

اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

«كُنَّا نَقُولُ فِي الصَّلَاةِ قَبْلَ أَنْ يُفْرَضَ التَّشَهُّدُ»

''تشہد فرض ہونے سے قبل ہم نماز میں یہ کہا کرتے تھے۔''[5]

اس روایت کے الفاظ: قَبْلَ أَنْ يُفْرَضَ تشہد کی فرضیت پر دلیل ہیں۔

⑪ **آخری تشہد میں درود شریف کا پڑھنا:** [اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ] اس قدر کہنا فرض ہے۔ اور اس سے زیادہ کلمات (درود ابراہیمی) کہنا سنت ہے۔[6]

① صحيح مسلم، الصلاة، باب مايجمع صفة الصلاة وما يفتتح به ويختتم به...... ، حديث: 498. ② جیسا کہ نبی ﷺ نے اس شخص کو دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا جس نے اعتدال و سکون کے بغیر نماز ادا کی تھی۔ صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم ......، حديث: 757، وصحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة......، حديث: 397. ③ صحيح البخاري، الأذان، باب التشهد في الآخرة، حديث: 831، وصحيح مسلم، الصلاة، باب التشهد في الصلاة، حديث: 402، و باب الصلاة على النبي ﷺ بعد التشهد، حديث: 405. ④ صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين...... ، حديث: 631. ⑤ سنن النسائي، السهو، باب إيجاب التشهد، حديث: 1278. ⑥ درود پڑھنے کے بعد رسول اکرم ﷺ نے درج ذیل دعا پڑھنے کا بھی حکم دیا ہے، لہٰذا اس کا بھی التزام کرنا چاہیے، صحیح مسلم میں ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: [إِذَا تَشَهَّدَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنْ أَرْبَعٍ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ.] صحيح مسلم، المساجد، باب مايستعاذ منه في الصلاة، حديث: 588. (عثمان منیب)

⑫ ارکان میں ترتیب قائم رکھنا: رسول اللہ ﷺ نماز ادا کرتے وقت ارکان نماز کو ترتیب سے ادا کیا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» ''تم ایسے نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[1]

علاوہ ازیں جس شخص نے درست طریقے سے نماز ادا نہیں کی تھی، رسول اللہ ﷺ نے اسے نماز کی تعلیم دی تو ترتیب کو قائم رکھا۔

⑬ سلام پھیرنا: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَخِتَامُهَا التَّسْلِيمُ» ''نماز کا اختتام سلام پھیرنے سے ہے۔''[2]

ایک دوسری روایت میں یوں ہے:

«وَتَحْلِيلُهَا التَّسْلِيمُ» ''نماز کی تحلیل سلام ہے۔''[3]

الغرض، رسول اللہ ﷺ نے نماز سے نکلنے کے لیے سلام کو بطور علامت کے مقرر کیا ہے۔

عزیزم قاریٔ کتاب! جو شخص ان ارکان میں سے ایک رکن بھی چھوڑ دے گا (اگر اس نے تکبیر تحریمہ نہ کہی) تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ اگر اس نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ کوئی اور رکن عمدًا چھوڑ دیا تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ اگر اس سے رکوع یا سجدہ وغیرہ سہواً چھوٹ گیا لیکن بعد والی رکعت کی قراءت شروع کرنے سے پہلے پہلے اسے یاد آ گیا تو وہ واپس لوٹ آئے اور چھوٹ جانے والا رکن ادا کرے اور اس رکن کے بعد والے ارکان بھی دوبارہ ادا کرے جو اس رکعت سے متعلق ہیں۔ اگر اسے دوسری رکعت کی قراءت شروع کرنے کے بعد یاد آیا تو اس کے چھوٹے ہوئے رکن والی رکعت باطل ہوگی اور بعد والی رکعت اس کے قائم مقام ہو جائے گی، اسے ایک رکعت اور ادا کرنا ہوگی۔ اور وہ آخر میں سجدہ سہو بھی کرے گا۔

اگر سلام پھیرنے کے بعد اسے متروک رکن کا علم ہوا تو اگر وہ رکن آخری تشہد یا سلام ہو تو اسے ادا کرے اور سجدہ سہو کر کے سلام پھیر دے اور اگر رکوع یا سجدہ چھوٹ گیا ہو تو مکمل رکعت ادا کرے اور سجدہ سہو کرے، بشرطیکہ سلام پھیرے ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا ہو۔ اگر وقت زیادہ گزر گیا یا اس کا وضو ٹوٹ گیا تو وہ دوبارہ مکمل نماز ادا کرے۔

---

① صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين ......، حديث: 631.

② ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نہیں ملی۔

③ سنن أبي داود، الطهارة، باب فرض الوضوء، حديث: 61، وجامع الترمذي، الطهارة، باب ما جاء أن مفتاح الصلاة الطهور، حديث: 3.

اندازہ فرمائیے! نماز اور جو اس میں اقوال وافعال ہیں ان کی کس قدر اہمیت اور عظمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی نماز کی اقامت اور محافظت کی توفیق دے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور و مقبول ہو۔

نماز کے واجبات کی تفصیل: ① تکبیر تحریمہ کے علاوہ نماز کی وہ تمام تکبیرات جو حالت بدلنے کے لیے کہی جاتی ہیں، واجب ہیں، رکن نہیں ہیں۔

② امام اور منفرد کے لیے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہنا واجب ہے، البتہ مقتدی نہ کہے۔[1]

③ تحمید، یعنی رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہنا امام، مقتدی اور منفرد کے لیے واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا قَالَ الْإِمَامُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، فَقُولُوا: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ»

''جب امام سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہے تو تم رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہو۔''[2]

④ رکوع میں ایک مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ کہنا واجب ہے۔ تین مرتبہ کہنا مسنون اور مکمل تسبیحات ہیں،[3] جب کہ دس مرتبہ تک یہ تسبیحات کہنا اعلیٰ درجہ ہے۔

⑤ سجدہ کی حالت میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى ایک مرتبہ کہنا واجب ہے، تین مرتبہ مسنون ہے۔[4]

⑥ رَبِّ اغْفِرْلِي[5]

دو سجدوں کے درمیان کہنا۔ ایک مرتبہ واجب ہے جب کہ تین مرتبہ کہنا مسنون ہے۔

⑦ پہلا تشہد پڑھنا واجب ہے، جس کے الفاظ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یوں منقول ہیں:

«اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ

---

① صحيح البخاري، الأذان، باب فضل اللّٰهم ربنا لك الحمد، حديث: 796، وصحيح مسلم، الصلاة، باب التسميع والتحميد والتأمين، حديث: 409. (حدیث مسيء الصلاة کے عموم کی بنا پر مقتدی بھی سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ کہہ سکتے ہیں)۔ سنن أبي داود، الصلاة، باب صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود، حديث: 857. ② صحيح البخاري، الأذان، باب فضل اللّٰهم ربّنا لك الحمد، حديث: 796، وصحيح مسلم، الصلاة، باب التسميع والتحميد والتأمين، حديث: 409، وجامع الترمذي، الصلاة، باب مايقول الرجل إذارفع رأسهٗ من الركوع؟ حديث: 266، و باب منه آخر، حديث: 267 واللفظ له. ③ سنن أبي داود، الصلاة، باب مايقول الرجل في ركوعه وسجوده؟ حديث: 871,870. ④ سنن أبي داود، الصلاة، باب مايقول الرجل في ركوعه و سجوده؟ حديث: 871. ⑤ سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب مايقول بين السجدتين؟ حديث: 897.

وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِينَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ»

''تمام قولی، بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اے نبی! آپ پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکات ہوں، ہم پر اور تمام اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔''[1]

⑧ تشہد اول کے لیے بیٹھنا واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر ہمیشگی فرمائی ہے۔ نیز آپ کا حکم ہے:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» ''تم ایسے نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[2]

جس شخص نے ان قولی یا فعلی آٹھ واجبات میں سے کسی ایک کو عمداً چھوڑ دیا تو اس کی نماز باطل ہوگی کیونکہ وہ نماز کو ایک کھیل اور شغل سمجھ رہا ہے۔ اور اگر اس سے بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے چھوٹ گیا تو وہ سجدہ سہو کرے کیونکہ اس نے ایک ایسے واجب کو ترک کیا ہے جسے ترک کرنا حرام ہے، لہٰذا سجدہ سہو سے اس کی کو پورا کرے۔

نماز کی سنتیں: نماز کے مذکورہ اقوال وافعال کے علاوہ باقی سب کام سنت کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کے ترک سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ نماز کی سنتوں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: اقوال مسنونہ، یعنی وہ سنتیں جن کا تعلق زبان سے ہے، ان میں چند یہ ہیں:

دعائے استفتاح، تعوذ، تسمیہ، آمین کہنا، اس کے علاوہ نماز فجر، نماز جمعہ، نماز عید، نماز کسوف میں اور مغرب، عشاء، ظہر اور عصر کی نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے علاوہ قراءت کرنا۔ اسی طرح رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہنے کے بعد یہ کلمات کہنا:

«مِلْءَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْءَ الْأَرْضِ وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ»

''آسمان کو بھر کر اور زمین کو بھر کر اور اس کے بعد (اے اللہ) جسے تو چاہے اسے بھر کر (تیرے لیے حمد وثنا ہو۔)''[3]

رکوع اور سجدہ میں ایک بار سے زائد تسبیحات کہنا، دو سجدوں کے درمیان رَبِّ اغْفِرْلِي ایک سے زائد بار کہنا

① صحيح البخاري، الأذان، باب التشهد في الآخرة، حديث :831، وصحيح مسلم، الصلاة، باب التشهد في الصلاة، حديث :402. ② صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين ...... ، حديث :631. ③ صحيح مسلم، الصلاة، باب اعتدال أركان الصلاة......، حديث :471.

مسنون ہے۔ علاوہ ازیں آخری تشہد میں درج ذیل دعا کا پڑھنا:

«اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ»

''اے اللہ میں عذاب جہنم، عذاب قبر، زندگی اور موت کے فتنوں اور مسیح دجال کے فتنے سے بچنے کے لیے تیری پناہ کا طالب ہوں۔''[1]

اس دعا کے علاوہ مزید دعاؤں کا پڑھنا سنن نماز میں شامل ہے۔

دوسری قسم: افعال مسنونہ، یعنی وہ سنن جن کا تعلق عمل سے ہے، مثلاً: تکبیر تحریمہ کے وقت یا رکوع جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرنا، دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھنا۔ حالت قیام میں دونوں ہاتھوں کو سینے پر یا ناف کے نیچے باندھنا[2] سجدہ کی جگہ پر نظر رکھنا، رکوع میں دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں پر رکھنا، سجدے میں پیٹ کو رانوں سے اور رانوں کو پنڈلیوں سے جدا کر کے رکھنا، رکوع کی حالت میں کمر کو اعتدال پر رکھنا، سر کو کمر کے برابر اس طرح رکھنا کہ اٹھا ہوا ہو نہ جھکا ہوا، سجدہ کی جگہ پر پیشانی اور ناک وغیرہ اعضاء کو اچھی طرح زمین پر ٹکانا۔ اس کے علاوہ اور بھی نماز کی سنن ہیں جن کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔

ان تمام سنن کو نماز میں ادا کرنا فرض یا واجب نہیں، البتہ ان کو ادا کرنے سے اجر وثواب میں اضافہ ضرور ہوگا۔ نماز مکمل ہوگی اور مسنون ہوگی۔ (اور مسنون نماز ہی مطلوب ہے۔)

بعض نوجوان نماز کی سنن کے معاملہ میں انتہا پسندی اور تشدد کی راہ اختیار کرتے ہیں، جس سے عملی طور پر عجیب وغریب صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں، مثلاً: بعض لوگ قیام میں اس قدر سر جھکا کر کھڑے ہوتے ہیں کہ وہ رکوع کی حالت کے قریب قریب دکھائی دیتے ہیں۔ کئی اپنے ہاتھوں کو سینے پر یا ناف کے نیچے باندھنے کی بجائے گلے کے قریب یا (ناف سے بہت نیچے) باندھتے ہیں۔ اسی طرح وہ سُترہ کے بارے میں بھی سخت رویہ اختیار کرتے ہیں حتیٰ کہ نفلی نماز ادا کرتے وقت صف میں قیام کو چھوڑ کر دوسری جگہ سترہ ڈھونڈنے کے لیے چلے جاتے ہیں بعض لوگ سجدہ کی حالت میں سر بہت آگے بڑھا دیتے ہیں اور پاؤں پیچھے لے جاتے ہیں

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب الدعاء قبل السلام، حديث: 832، وصحيح مسلم، المساجد، باب ما يستعاذ منه في الصلاة، حديث: 588 و اللفظ له.

[2] ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی تمام روایات ضعیف ہیں، لہٰذا سینے ہی پر ہاتھ باندھنا مسنون ہے۔ (صارم)

یوں وہ کمان کی شکل بنا لیتے ہیں یا لیٹنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ کئی حضرات نماز میں کھڑے ہو کر اپنے پاؤں اس قدر ٹیڑھے کر لیتے ہیں کہ ساتھ والا نمازی تنگ اور پریشان ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب و غریب صورتیں ہیں جو کبھی غلو تک پہنچا دیتی ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے اور اپنے لیے حق اور اس پر عمل کی توفیق کی دعا کرتے ہیں۔

نمازِ نبوی کی عملی صورت

پچھلے صفحات پر ہم نے نماز کے ارکان، واجبات اور سنن کا تذکرہ کیا ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ان ارکان، واجبات اور سنن پر مشتمل رسول اللہ ﷺ کا طریقہ نماز قدرے تفصیل سے بیان کریں۔ جو ایک مسلمان کے لیے نمونہ و آئینہ ہو اور اس کی نماز اس فرمانِ رسول ﷺ کے مطابق ہو:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

''تم ایسے نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[1]

▲ رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو قبلہ کی طرف رخ کرتے اور اپنے ہاتھوں کو کندھوں یا کانوں کے برابر اٹھاتے۔ اپنی ہتھیلیوں کو قبلہ کی جانب کرتے اور ''اللہ اکبر'' کہتے تھے۔[2]

▲ پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑتے[3] اور دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ لیتے۔[4]

▲ پھر آپ دعائے استفتاح پڑھتے۔ اور ایک دعائے استفتاح پر دوام نہیں کرتے تھے بلکہ آپ سے اس بارے میں متعدد دعائیں منقول ہیں، ان میں سے کوئی ایک پڑھی جا سکتی ہے۔ ایک دعا یہ ہے:

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ»

''اے اللہ! تو اپنی تعریفوں کے ساتھ پاک ہے۔ تیرا نام بابرکت ہے۔ تیری شان بلند ہے۔ تیرے سوا

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين......، حديث: 631. [2] صحيح مسلم، الصلاة، باب استحباب رفع اليدين حذو المنكبين مع تكبيرة الإحرام......، حديث: 391,390. [3] سنن النسائي، الافتتاح، باب وضع اليمين على الشمال في الصلاة، حديث: 888. [4] سنن أبي داود، الصلاة، باب وضع اليمنى على اليسرى في الصلاة، حديث: 759، وصحيح ابن خزيمة، الصلاة، باب وضع اليمين على الشمال في الصلاة قبل افتتاح القراءة: 243/1، حديث: 479.

کوئی معبود حقیقی نہیں۔"[1]

▲ پھر آپ أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ [2] اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ پڑھتے تھے۔[3]

▲ پھر آپ سورۂ فاتحہ پڑھتے۔[4] جب سورۂ فاتحہ ختم کرتے تو آمین کہتے تھے۔[5]

▲ سورۂ فاتحہ کے بعد آپ ﷺ کبھی لمبی، کبھی چھوٹی اور کبھی درمیانی سورتیں پڑھتے۔[6] فجر کی نماز میں دوسری نمازوں کی نسبت لمبی قراءت کرتے۔[7] آپ فجر کی نماز میں[8] اور مغرب[9] اور عشاء[10] کی پہلی دو رکعتوں میں بلند آواز سے قراءت کرتے تھے۔ باقی رکعات میں آہستہ (بے آواز) قراءت کرتے۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ ہر نماز میں پہلی رکعت دوسری سے قدرے لمبی کرتے۔[11]

▲ پھر اسی طرح رفع الیدین کرتے جس طرح نماز شروع کرتے وقت کرتے تھے اور "اللّٰہ أکبر" کہتے ہوئے حالتِ رکوع میں چلے جاتے۔[12] اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر گھٹنوں کے اوپر یوں رکھتے جیسا کہ انھیں مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔[13] اپنی کمر ہموار رکھتے اور سر کو کمر کے برابر اس طرح رکھتے کہ وہ نہ اونچا ہوتا اور نہ جھکا ہوا ہوتا[14] اور سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ [15] کہتے۔

▲ پھر سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ [16] کہتے ہوئے رکوع سے سر اٹھاتے اور رفع الیدین کرتے تھے۔[17]

---

① سنن أبي داود، الصلاة، باب من رأى الاستفتاح بسبحانك اللهم وبحمدك، حديث :776,775، والمستدرك للحاكم :235/1، حديث :860,859. ② سنن أبي داود، الصلاة، باب ما يستفتح به الصلاة من الدعاء، حديث : 764، وسنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب الاستعاذة في الصلاة، حديث :808، والمستدرك للحاكم :235/1، حديث :858، والمصنف لعبدالرزاق :86/2. ③ صحيح مسلم، الصلاة، باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة، حديث :399 وسنن النسائي، الافتتاح، باب قراءة ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾، حديث:906,905. ④ صحيح مسلم، الصلاة، باب ما يجمع صفة الصلاة وما يفتتح به ويختم به......، حديث :498. ⑤ سنن النسائي، الافتتاح، باب رفع اليدين حيال الأذنين، حديث :880. ⑥ سنن النسائي، الافتتاح، باب تخفيف القيام والقراءة، حديث : 983. ⑦ صحيح البخاري، الأذان، باب القراءة في الفجر، حديث :771. ⑧ صحيح البخاري، الأذان، باب الجهر بقراءة صلاة الصبح، حديث : 773. ⑨ صحيح البخاري، الأذان، باب القراءة في المغرب، حديث :764,763. ⑩ صحيح البخاري، الأذان، باب الجهر في العشاء، حديث :767,766. ⑪ صحيح البخاري، الأذان، باب القراءة في الظهر، حديث :759,758. ⑫ صحيح البخاري، الأذان، باب رفع اليدين إذا كبر وإذا ركع وإذا رفع، حديث : 737,736. ⑬ صحيح البخاري، الأذان، باب سنة الجلوس في التشهد، حديث : 828. ⑭ صحيح مسلم، الصلاة، باب ما يجمع صفة الصلاة وما يفتتح به ويختم به......، حديث : 498. ⑮ سنن أبي داود، الصلاة، باب ما يقول الرجل في ركوعه و سجوده؟ حديث :871، و مسند أحمد :371/1. ⑯ صحيح البخاري، الأذان، باب ما يقول الإمام ومن خلفه إذا رفع رأسه من الركوع؟ حديث :795. ⑰ صحيح البخاري، الأذان، باب رفع اليدين إذا كبر و إذا ركع وإذا رفع، حديث :736.

▲ جب آپ سیدھے کھڑے ہو جاتے تو رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہتے۔ ① اس حالت میں آپ قدرے زیادہ دیر تک کھڑے رہتے تھے۔ ②

▲ پھر اللّٰہُ أَکبر کہتے اور سجدے میں چلے جاتے۔ ③ اس موقع پر آپ رفع الیدین نہ کرتے تھے۔ ④ آپ پیشانی، ناک، دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنوں اور دونوں قدموں کی انگلیوں پر سجدہ کرتے تھے۔ ⑤ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی جانب رکھتے۔ ⑥ حالتِ سجدہ میں اعتدال واطمینان کا خاص خیال رکھتے۔ پیشانی اور ناک اچھی طرح زمین پر ٹکاتے۔ ⑦ ہتھیلیوں پر بوجھ ڈالتے اور کہنیوں کو زمین سے اٹھا کر رکھتے۔ ⑧ اپنے بازوؤں کو بدن سے الگ رکھتے۔ ⑨ پیٹ کو رانوں سے اور رانوں کو پنڈلیوں سے اونچا رکھتے۔ ⑩ حالتِ سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى کہتے تھے۔ ⑪

▲ پھر اللّٰہُ أَکبر کہتے ہوئے سجدہ سے سر مبارک اٹھاتے۔ ⑫ بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھ جاتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے اور ہاتھ رانوں پر رکھ لیتے ⑬ اور یہ دعا پڑھتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْلِي وَارْحَمْنِي وَاجْبُرْنِي وَاهْدِنِي وَارْزُقْنِي»

''اے اللہ مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، میرے نقصان پورے کر دے، مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق دے۔'' ⑭

---

① صحيح البخاري، الأذان، باب فضل اللهم ربنا لك الحمد، حديث: 796، و جامع الترمذي، الصلاة ، باب مايقول الرجل إذا رفع رأسه من الركوع؟ حديث: 266، باب منه آخر، حديث: 267 واللفظ له. ② صحيح البخاري، الأذان، باب الاطمأنينة حين يرفع رأسه من الركوع، حديث: 800، وصحيح مسلم، الصلاة، باب اعتدال أركان الصلاة وتخفيفها في تمام، حديث: 473,472، ومسند أحمد: 172/3. ③ صحيح البخاري، الأذان، باب التكبير إذا قام من السجود، حديث: 789. ④ صحيح البخاري، الأذان، باب رفع اليدين في التكبيرة الأولى مع الافتتاح سواءً، حديث: 735، و باب رفع اليدين إذا كبر وإذا ركع وإذا رفع، حديث: 736، وباب إلى أين يرفع يديه؟ حديث: 738. ⑤ صحيح البخاري، الأذان، باب السجود على الأنف، حديث: 812. ⑥ صحيح البخاري، الأذان، باب سنة الجلوس في التشهد، حديث: 828. ⑦ سنن أبي داود، الصلاة، باب صلاة من لا يقيم صلبه في الركوع والسجود، حديث: 858. ⑧ صحيح مسلم، الصلاة، باب الاعتدال في السجود ووضع الكفين على الأرض...... ، حديث: 494. ⑨ صحيح البخاري، الصلاة، باب يبدي ضبعيه و يجافي في السجود، حديث:390، وسنن أبي داود، الصلاة، باب صفة السجود، حديث: 900. ⑩ صحيح مسلم، الصلاة، باب الاعتدال في السجود ووضع الكفين...... ، حديث: 496. ⑪ سنن أبي داود، الصلاة، باب ما يقول الرجل في ركوعه و سجوده؟ حديث: 871. ⑫ صحيح البخاري، الأذان، باب التكبير إذا قام من السجود، حديث: 789. ⑬ سنن أبي داود، الصلاة، باب كيف الجلوس في التشهد، حديث: 957. ⑭ جامع الترمذي، الصلاة، باب مايقول بين السجدتين؟ حديث: 284، و في صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب فضل التهليل و التسبيح والدعاء، حديث: 2679 بلفظ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَارْحَمْنِي وَاهْدِنِي وَعَافِنِي وَارْزُقْنِي.

▲ پھر آپ اَللّٰهُ أَكْبَر کہہ کر سجدہ میں چلے جاتے [1] اور اسی طرح کرتے جس طرح پہلے سجدے میں کیا تھا۔

▲ پھر اَللّٰهُ أَكْبَر کہہ کر سر مبارک اٹھاتے [2] اور قدموں کے اگلے حصوں کے سہارے کھڑے ہو جاتے۔ [3] علاوہ ازیں اپنے گھٹنوں اور رانوں سے (اٹھتے وقت) سہارا لیتے تھے۔ جب آپ ﷺ اچھی طرح کھڑے ہو جاتے تو قراءت شروع کرتے اور پھر دوسری رکعت اسی طرح پڑھتے جس طرح پہلی رکعت پڑھتے تھے۔

▲ پھر تشہد اول کے لیے یوں بیٹھتے جس طرح دو سجدوں کے درمیان بیٹھتے تھے۔ دایاں ہاتھ دائیں ران پر اور بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھتے۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو درمیان والی انگلی کے ساتھ ملا کر حلقہ کی شکل بنا لیتے تھے۔ شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے [4] اور اس پر نظر رکھتے [5] پھر یہ کلمات پڑھتے تھے:

«اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِينَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ»

''تمام قولی، بدنی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اے نبی! آپ پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکات ہوں، ہم پر اور تمام اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔'' [6]

آپ درمیانے تشہد کے لیے تھوڑی دیر بیٹھتے تھے۔

▲ پھر آپ تکبیر کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے [7] اس موقع پر آپ رفع الیدین بھی کرتے تھے۔ [8] اور تیسری پھر

---

① صحيح البخاري، الأذان، باب يهوي بالتكبير حين يسجد، حديث: 803. ② صحيح البخاري، الأذان، باب يهوي بالتكبير حين يسجد، حديث: 803. ③ [ضعيف] جامع الترمذي، الصلاة، باب منه أيضا، حديث: 288 اور صحیح یہ ہے کہ دوسری اور چوتھی رکعت کے لیے اُٹھتے وقت دونوں ہاتھوں کو زمین پر لگایا جائے اور ان کے سہارے کھڑا ہوا جائے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے۔ صحيح البخاري، الأذان، حديث: باب كيف يعتمد على الأرض إذا قام من الركعة، حديث: 824. اسی طرح دوسری اور چوتھی رکعت کے لیے اٹھتے وقت جلسہ استراحت کرنا آپ ﷺ کا معمول تھا، نیز حدیث مسيئ الصلاة میں آپ نے اس کا حکم بھی دیا ہے۔ دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 757. ④ سنن أبي داود، الصلاة، باب كيف الجلوس في التشهد، حديث: 957. ⑤ سنن أبي داود، الصلاة، باب الإشارة في التشهد، حديث: 990، ومسند أحمد: 3/4. ⑥ صحيح البخاري، الأذان، باب التشهد في الآخرة، حديث: 831، وصحيح مسلم، الصلاة، باب التشهد في الصلاة، حديث: 402. ⑦ صحيح البخاري، الأذان، باب يهوي بالتكبير حين يسجد، حديث: 803. ⑧ صحيح البخاري، الأذان، باب رفع اليدين إذا قام من الركعتين، حديث: 739.

چوتھی رکعت ادا کرتے۔ یہ دو رکعتیں پہلی دو رکعتوں سے مختصر ہوتی تھیں کیونکہ آپ ان میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔[1]

▲ پھر آخری تشہد میں اس طرح بیٹھتے کہ بائیں پاؤں کو بچھا کر دائیں پاؤں کی پنڈلی کے نیچے سے قدم باہر نکال لیتے، دائیں پاؤں کو کھڑا کر لیتے اور زمین پر بیٹھ جاتے تھے۔[2]

▲ پھر آخری تشہد پڑھتے۔ اس میں تشہد اول کے علاوہ درود شریف کے یہ کلمات پڑھتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ! صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ، اَللّٰهُمَّ! بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ»

''اے اللہ! رحمت نازل کر محمد ﷺ اور آپ کی آل پر جیسا کہ تو نے ابراہیم علیہ السلام کی آل پر رحمت نازل کی ہے بے شک تو قابل تعریف اور بزرگی والا ہے۔ اے اللہ! محمد ﷺ اور آپ کی آل پر برکت نازل کر جیسا کہ تو نے ابراہیم علیہ السلام کی آل پر برکت نازل کی بے شک تو قابل تعریف اور بزرگی والا ہے۔''[3]

▲ پھر آپ آخر میں جہنم، عذاب قبر، زندگی اور موت کے فتنوں اور دجال کے فتنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے اور وہ دعائیں کرتے جو کتاب و سنت میں موجود اور محفوظ ہیں۔ درج ذیل دعا آپ کو بہت پسند تھی (بلکہ آپ نے اس کے پڑھنے کا حکم دیا):

«اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ»

''اے اللہ! میں عذابِ جہنم، عذابِ قبر، زندگی اور موت کی آزمائش اور مسیح دجال کے فتنے سے تیری پناہ اور حفاظت کا طلب گار ہوں۔''[4]

▲ پھر آپ دائیں جانب اور پھر بائیں جانب اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ کہہ کر سلام پھیرتے تھے۔[5]

① صحيح البخاري، الأذان، باب يقرأ في الأخريين بفاتحة الكتاب، حديث:776، وصحيح مسلم، الصلاة، باب القراءة في الظهر والعصر، حديث:451. ② صحيح البخاري، الأذان، باب سنة الجلوس في التشهد، حديث:828. ③ صحيح مسلم، الصلاة، باب الصلاة على النبي ﷺ بعد التشهد، حديث:406. ④ صحيح مسلم، المساجد، باب ما يستعاذ منه في الصلاة، حديث:588. ⑤ صحيح مسلم، المساجد، باب السلام للتحليل من الصلاة عند فراغها وكيفيته، حديث:582، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في التسليم في الصلاة، حديث:295.

کلمات سلام کی ابتدا قبلہ کی طرف منہ کر کے کرتے اور آخری کلمہ ادا کرنے تک چہرہ مکمل طور پر دائیں یا بائیں طرف پھیر لیتے تھے۔

▲ جب آپ سلام پھیر لیتے تو تین مرتبہ أَسْتَغْفِرُاللّٰه (میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا طلب گار ہوں) کہتے اور پھر یہ کلمات کہتے:

«اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَاالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ»

''اے اللہ! تو سلامتی والا ہے اور سلامتی تیری ہی طرف سے ہے، اے جلال و عزت کے مالک تو برکت والا ہے۔''[1]

▲ پھر آپ ﷺ وہ دعائیں پڑھتے جو کتب احادیث میں محفوظ اور موجود ہیں۔

اے مسلمان! کتاب و سنت کی روشنی میں نماز کا یہ مختصر سا بیان ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اپنی نماز میں ان چیزوں کا خوب اہتمام کریں تاکہ آپ کی نماز حتی الامکان رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اچھے اعمال کی توفیق دے اور انھیں شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین

مکروہات نماز کا بیان

▲ نماز میں چہرے کو پھیر کر ادھر ادھر دیکھنا مکروہ ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«هُوَ اخْتِلَاسٌ يَّخْتَلِسُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ»

''(ادھر ادھر دیکھنا) یہ نقصان ہے اور شیطان بندے کی نماز میں نقصان کرتا ہے۔''[3]

[1] صحیح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، حديث: 592. [2] الأحزاب 21:33.

[3] صحيح البخاري، الأذان، باب الالتفات في الصلاة، حديث: 751.

کسی شدید ضرورت کی وجہ سے دائیں بائیں دیکھنا پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں، مثلاً: خوف کی حالت ہو یا کوئی اور معقول وجہ ہو۔[1]

اگر کوئی شخص اپنے تمام جسم سمیت نماز میں گھوم گیا یا حالت خوف کے بغیر کعبہ کی طرف پشت کر لی تو اس کی نماز باطل ہوگی کیونکہ اس نے سمت کعبہ بلا عذر ترک کی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ حالت خوف میں نماز کے دوران میں دائیں بائیں دیکھ لیا جائے تو مضائقہ نہیں کیونکہ جنگ میں اس کی ضرورت پڑ جاتی ہے، حالت خوف کے علاوہ اگر کسی ضرورت کے تحت صرف چہرہ اور سینہ پھیر لے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر بلا ضرورت ہو تو مکروہ ہے بلکہ اس نے سارا بدن جانب کعبہ سے پھیر لیا تو نماز باطل ہو جائے گی۔[2]

▲ نماز کے دوران آسمان کی طرف دیکھنا مکروہ ہے آپ نے اسے ناپسند کرتے ہوئے فرمایا:

«مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَرْفَعُونَ أَبْصَارَهُمْ إِلَى السَّمَاءِ فِي صَلَاتِهِمْ؟» فَاشْتَدَّ قَوْلُهُ فِي ذٰلِكَ حَتَّى قَالَ: «لَيَنْتَهِيَنَّ عَنْ ذٰلِكَ أَوْ لَتُخْطَفَنَّ أَبْصَارُهُمْ»

''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ نماز میں آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہیں؟ بلکہ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ لوگ (ایسی حرکت سے) باز آ جائیں یا پھر اللہ تعالیٰ ان کی نگاہیں چھین لے گا۔''[3]

پچھلے صفحات پر ہم بیان کر چکے ہیں کہ حالت نماز میں نمازی کی نظر مقام سجدہ پر رہنی چاہیے، ادھر ادھر دیکھنا، نگاہ کو آوارہ رکھنا، سامنے دیواروں پر بنے ہوئے نقش و نگار یا تحریروں کو دیکھنا ایک مسلمان کے لائق نہیں کیونکہ یہ چیز نماز سے غافل کر دیتی ہے اور روح نماز (خشوع وخضوع) کو ختم کر دیتی ہے۔

▲ نماز میں بلا ضرورت آنکھیں بند کرنا بھی مکروہ ہے کیونکہ یہود ایسا کیا کرتے تھے، البتہ کسی نے کسی مقصد کی خاطر ایسا کیا تو کوئی حرج نہیں، مثلاً: اس کے سامنے کوئی ایسی چیز ہے جو اس کی نماز کے لیے تشویش کا باعث بن رہی ہے جیسے نقش و نگار یا بیل بوٹے وغیرہ۔ اس بارے میں ابن قیم رحمہ اللہ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا یہی مفہوم ہے۔[4]

▲ نماز میں ''اقعاء'' کی صورت میں بیٹھنا مکروہ ہے، جس کی صورت و شکل یہ ہے کہ ''آدمی اپنے پاؤں کے تلوے زمین پر لگا کر رانوں اور پنڈلیوں کو کھڑا کر کے اپنے چوتڑ پر بیٹھ جائے۔'' رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نصیحت

---

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب أهل العلم والفضل أحق بالإمامة، حديث: 680، وسنن أبي داود، الجهاد، باب في فضل الحرس في سبيل الله عز وجل، حديث: 2501.

[2] بعض علماء نے چہرہ اور سینہ پھیرنے پر نماز کے باطل ہونے کا حکم لگایا ہے۔ دیکھیے فتاوی الدین الخالص: 61/1 (ع۔و)

[3] صحيح البخاري، الأذان، باب رفع البصر إلى السماء في الصلاة، حديث: 750. [4] زاد المعاد: 294/1.

کرتے ہوئے فرمایا:

«يَا عَلِيُّ ! لَا تُقْعِ إِقْعَاءَ الْكَلْبِ» ''اے علی! تو اس طرح نہ بیٹھ جیسے کتا بیٹھتا ہے۔''[1]

▲ حالتِ قیام میں دیوار وغیرہ کے ساتھ بلاضرورت ٹیک لگا کر کھڑے ہونا مکروہ ہے کیونکہ یہ چیز قیام کی مشقت کو ختم کر دیتی ہے، البتہ اگر کسی بیماری اور مثل بیماری کی وجہ سے ایسا کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

▲ نماز میں سجدے کے دوران اپنے بازوؤں کو پھیلا کر زمین پر بچھانا مکروہ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اِعْتَدِلُوا فِي السُّجُودِ وَلَا يَبْسُطْ أَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ انْبِسَاطَ الْكَلْبِ»

''سجدہ میں اعتدال کو قائم رکھو اور کوئی شخص کتے کی طرح اپنے بازو نہ پھیلائے۔''[2]

▲ نماز میں کھیلنا یا ہاتھ، پاؤں، ڈاڑھی، کپڑے وغیرہ کے ساتھ بلا مقصد کوئی حرکت کرنا یا بلاضرورت زمین پر ہاتھ پھیرنا یہ سب کام مکروہ ہیں۔

▲ حالت نماز میں پہلوؤں پر ہاتھ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ یہ کافر اور متکبر لوگوں کا انداز ہے۔ اور ہمیں ان لوگوں کے ساتھ مشابہت سے روکا گیا ہے، چنانچہ بخاری و مسلم کی روایت میں پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر نماز ادا کرنے کی ممانعت موجود ہے۔[3]

▲ نماز کے دوران انگلیاں چٹخانا[4] اور عمل تشبیک، یعنی ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کرنا مکروہ ہے۔[5]

▲ یہ امر بھی مکروہ ہے کہ کوئی شخص ایسی حالت میں نماز ادا کرے کہ اس کے آگے اسے مشغول یا غافل کرنے والی کوئی چیز ہو کیونکہ یہ صورت نماز کے درجہ کمال کے حصول میں رکاوٹ ہے۔

▲ جہاں تصاویر ہوں وہاں نماز ادا کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس سے بت پرستوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔ وہ تصاویر کسی جگہ نصب ہوں یا دیوار وغیرہ پر نقش ہوں یا کسی اور شکل میں ہوں، ایک ہی حکم میں ہے۔[6]

① سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب الجلوس بين السجدتين، حديث : 895. ② صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب المصلي يناجي ربه عز وجل، حديث : 532، وصحيح مسلم، الصلاة، باب الاعتدال في السجود و وضع الكفين على الأرض......، حديث : 493 واللفظ له. ③ صحيح البخاري، العمل في الصلاة، باب الخَصْرِ في الصلاة، حديث : 1220,1219، وصحيح مسلم، المساجد، باب كراهة الاختصار في الصلاة، حديث: 545. ④ [ضعيف] سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب مايكره في الصلاة، حديث : 965، و نصب الراية: 87/2. ⑤ سنن أبي داود، الصلاة، باب ما جاء في الهدي في المشي إلى الصلاة، حديث : 562. ⑥ صحيح البخاري، الصلاة، باب إن صلى في ثوب مصلب أو تصاوير هل تفسد صلاته......؟ حديث : 374.

▲ کسی شخص کا نماز میں ایسی حالت میں داخل ہونا کہ وہ پیشاب، پاخانہ، ہوا کے روکنے یا شدید سردی یا گرمی یا سخت بھوک، پیاس کی وجہ سے فکر مند و پریشان ہو، مکروہ ہے۔[1] کیونکہ یہ صورتیں نماز کے خشوع وخضوع میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔[2]

▲ بھوک کی وجہ سے کھانے کی شدید خواہش ہو اور کھانا بھی حاضر ہو تو ایسی صورت میں نماز شروع کرنا مکروہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا صَلَاةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ»

''کھانا حاضر ہو تو نماز نہیں ہوتی اور تب بھی نماز نہیں ہوتی جب کوئی پیشاب، پاخانہ کے دباؤ کی وجہ سے پریشان ہو۔''[3]

یہ تمام ہدایات اللہ تعالیٰ کے حق کی ادائیگی کے بارے میں ہیں تاکہ بندہ اپنے رب کی عبادت میں دل و دماغ کے ساتھ حاضر رہے۔

▲ سجدہ کرتے وقت پیشانی زمین پر رکھنے کے لیے کوئی خاص چیز سامنے رکھنا مکروہ ہے کیونکہ یہ رافضیوں کا شعار اور انداز ہے اور اس میں ان کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔

▲ سجدہ کرنے کی وجہ سے پیشانی یا ناک پر لگی ہوئی مٹی وغیرہ کو نماز میں صاف کرنا مکروہ ہے، البتہ نماز کے بعد ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

▲ نماز کے دوران ڈاڑھی سے کھیلنا، کپڑے کو کھولنا یا بند کرنا، ناک کی صفائی کرنا وغیرہ یہ کام مکروہ ہیں کیونکہ یہ کام نماز کے خشوع وخضوع کو ختم کر دیتے ہیں۔

ایک مسلمان سے مطلوب و مقصود یہ ہے کہ وہ کلی طور پر نماز میں مشغول رہے۔ نماز کے منافی کاموں سے اجتناب کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ○﴾

''نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص درمیان والی نماز کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے باادب کھڑے رہا کرو۔''[4]

---

[1] صحيح مسلم، المساجد، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام الذي يريد أكله في الحال و كراهة الصلاة مع مدافعة الحدث و نحوه، حديث :557-560.

[2] شدید سردی یا گرمی کی صورت میں نماز میں نہ داخل ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور سخت بھوک و پیاس کی صورت میں جب کھانا حاضر ہو تب مکروہ بلکہ فاسد ہے۔

[3] صحيح مسلم، المساجد، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام......، حديث :560. [4] البقرة 2:238.

مسلمان سے یہ بھی مطلوب ہے کہ وہ حضورِ قلب اور خشوع وخضوع کے ساتھ نماز قائم کرے اور اس کی معاون صورتوں کو اپنائے جو چیزیں خشوع وخضوع کے خلاف ہیں انھیں چھوڑ دے تاکہ اس کی نماز کامل اور صحیح ہو اور ذمہ داری ادا ہو جائے۔ ظاہری اور حقیقی طور پر اس کی نماز ہو نہ کہ صرف ظاہری نماز ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے۔

نماز کے مستحبات اور مباحات

٭ نماز کے دوران میں آگے قریب سے گزرنے والے شخص کو روک دینا مسنون ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ يُصَلِّي فَلَا يَدَعْ أَحَدًا يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَإِنْ أَبٰى فَلْيُقَاتِلْهُ، فَإِنَّ مَعَهُ الْقَرِينَ»

''جب کوئی شخص نماز ادا کر رہا ہو تو وہ کسی کو اپنے آگے سے گزرنے نہ دے، اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے لڑائی کرے کیونکہ اس کے ساتھ اس کا ساتھی (شیطان) ہے۔''[1]

جب نمازی کے آگے سترہ ہو تو تب سترے کے پیچھے سے گزر جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر نمازی کے آگے جگہ تنگ ہو اور آگے گزرنے کی شدید ضرورت ہو تو تب نماز ادا کرنے والا اسے پیچھے نہ ہٹائے کیونکہ اس صورت میں آگے گزرنے والا مجبور ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حرم میں نماز پڑھ رہا ہو تو وہ بھی آگے سے گزرنے والے شخص کو نہ روکے کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں نماز ادا کرتے تھے تو لوگ آگے سے گزر جاتے تھے حالانکہ آپ کے آگے سترہ نہ ہوتا تھا۔[2]

جب نماز ادا کرنے والا اکیلا ہو یا امام ہو تو تب سترے کا استعمال مسنون ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ فَلْيُصَلِّ إِلٰى سُتْرَةٍ وَّلْيَدْنُ مِنْهَا»

''جب کوئی شخص نماز ادا کرے تو وہ سترہ سامنے رکھے اور اس کے قریب ہو۔''[3]

[1] صحيح مسلم، الصلاة، باب منع المار بين يدي المصلي، حديث: 506. [2] [ضعيف] سنن أبي داود، المناسك، باب في مكة، حديث: 2016، وسنن النسائي، القبلة، باب الرخصة في ذلك، حديث: 759، وسنن ابن ماجه، المناسك، باب الركعتين بعد الطواف، حديث: 2958، ومسند أحمد: 399/6. لہٰذا حرم میں بھی نمازی کے آگے سے گزرنے سے اجتناب کرنا چاہیے الا یہ کہ شدید مجبوری ہو۔ [3] سنن أبي داود، الصلاة، باب مايؤمر المصلي أن يدرأ ......، حديث: 698.

واضح رہے مقتدی کے لیے اس کے امام کا سترہ ہی کافی ہے۔

سترے کا استعمال واجب نہیں ہے کیونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ صَلَّى فِي فَضَاءٍ لَّيْسَ بَيْنَ يَدَيْهِ شَيْءٌ»

''رسول اللہ ﷺ نے ایک کھلے میدان میں نماز پڑھائی اور آپ کے آگے کوئی شے (بطور سترہ) نہ تھی۔''[1]

سترہ باریک ہو یا موٹا یا چوڑا، اسے کھڑا کر کے رکھنا چاہیے۔ سترہ کجاوے کی پچھلی لکڑی کی طرح (ڈیڑھ فٹ کے قریب) ہونا چاہیے۔ سترہ کے استعمال میں یہ حکمت ہے کہ وہ نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو روک دے گا اور سترہ کے پیچھے جو کچھ ہوگا نمازی اس میں (نظر و فکر کر کے) مشغول نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص صحراء میں نماز ادا کرنا چاہے تو وہ کسی ایسی چیز کو سترہ بنا لے جو گزرنے والے کو با سانی نظر آ جائے، مثلاً: درخت، پتھر اور لاٹھی وغیرہ۔ اگر زمین میں لاٹھی کو گاڑنا ممکن نہ ہو تو اسے چوڑائی کی صورت ہی میں اپنے سامنے رکھ لے۔

▲ اگر امام قراءت کرتے وقت کلمات میں کمی بیشی کر جائے تو مقتدی لقمہ دے کر اس کی اصلاح کر دے۔

▲ نماز کے دوران کپڑا اوڑھنا، اتارنا، کسی چیز کو اٹھانا، رکھنا، دروازہ کھولنا وغیرہ مباح کام ہیں۔ نماز میں سانپ اور بچھو مارنا درست ہے کیونکہ

«أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقَتْلِ الْأَسْوَدَيْنِ فِي الصَّلَاةِ: الْحَيَّةِ وَالْعَقْرَبِ»

''رسول اللہ ﷺ نے نماز کی حالت میں دو سیاہ موذی جانوروں سانپ اور بچھو کو مارنے کا حکم دیا ہے۔''[2]

کسی مباح کام کو کثرت سے نہیں کرنا چاہیے الا یہ کہ اس کی شدید ضرورت ہو۔ اگر کسی نے کوئی مباح کام بلاضرورت، کثرت سے اور لگا تار کیا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ یہ چیز نماز کے منافی ہے اور خشوع و خضوع کو ختم کر دینے والی ہے۔

▲ جب نمازی کو نماز کے دوران کوئی اہم معاملہ پیش آ جائے، مثلاً: کوئی شخص اندر آنے کی اجازت طلب

[1] مسند أحمد: 224/1 و327۔ اوپر والی روایت میں سترہ کے استعمال کے بارے میں امر کا صیغہ [فَلْيُصَلِّ إِلىٰ سُتْرَةٍ] آیا ہے جو وجوب کا متقاضی ہے، لہٰذا سترہ رکھنا واجب ہے۔ مصنف نے آگے چل کر صحراء کے بارے میں جو لکھا ہے وہ عبارت بھی سترہ کے وجوب کی تائید میں ہے۔ باقی رہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی روایت تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے آپ کے پاس کوئی شے نہ ہو جسے سترہ بنا لیتے۔ (صارم)

[2] سنن أبي داود، الصلاة، باب العمل في الصلاة، حديث: 921، وجامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في قتل الأسودين في الصلاة، حديث: 390 واللفظ له.

کرے یا امام بھول جائے یا کسی انسان کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ اسے متنبہ کر سکتا ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ مرد تسبیح (سبحان اللہ) کہے اور عورت (ایک ہاتھ کی پشت دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر) تالی بجا دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! مَالَكُمْ حِينَ نَابَكُمْ شَيْءٌ فِي الصَّلَاةِ أَخَذْتُمْ بِالتَّصْفِيحِ؟ إِنَّمَا التَّصْفِيحُ لِلنِّسَاءِ، مَنْ نَابَهُ شَيْءٌ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَقُلْ: سُبْحَانَ اللهِ»

''اے لوگو! تمھیں کیا ہو گیا ہے جب تمھیں نماز میں کوئی شے درپیش ہوتی ہے تو تم تالیاں بجانا شروع کر دیتے ہو؟ تالی تو عورتوں کے لیے ہے۔ جس کو نماز میں کوئی شے پیش آ جائے تو وہ سبحان اللہ کہے۔''[1]

▲ جب کوئی شخص حالت نماز میں سلام کا جواب دینے کا طریقہ جانتا ہو تو اسے سلام کہنا درست ہے۔ تب نمازی کو چاہیے کہ دوران نماز اشارے کے ساتھ سلام کا جواب دے، البتہ زبان کے ساتھ وعلیکم السلام نہ کہے، ورنہ اس کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ وہ نماز میں آدمی سے مخاطب ہوا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ سلام پھیرنے کے بعد زبان سے جواب دے۔

▲ نمازی حالت قیام میں ایک رکعت میں متعدد سورتیں پڑھ سکتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَرَأَ سُورَةَ الْبَقَرَةِ وَآلَ عِمْرَانَ وَالنِّسَاءَ فِي رَكْعَةٍ»

''نبی ﷺ نے ایک رکعت میں سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کی قراءت فرمائی۔''[2]

اسی طرح نمازی دو رکعتوں میں ایک ہی سورت تکرار سے پڑھ سکتا ہے۔ یا ایک سورت کو تقسیم کر کے دو رکعتوں میں قراءت کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی سورت کے آخری حصہ کو پڑھنا یا درمیان سے پڑھنا جائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ (کبھی کبھار) فجر کی سنتوں کی پہلی رکعت میں:

﴿قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَآ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَآ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَمَآ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۖ وَنَحۡنُ لَهٗ

---

[1] صحيح البخاري، العمل في الصلاة، باب رفع الأيدي في الصلاة لأمر ينزل به، حديث: 1218، وصحيح مسلم، الصلاة، باب تسبيح الرجل وتصفيق المرأة...... ، حديث: 422. [2] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب تطويل القراءة في صلاة الليل، حديث: 772، وسنن النسائي، الافتتاح، باب مسألة القارئ إذا مر بآية رحمة، حديث: 1010 واللفظ له.

مُسْلِمُوْنَ ○﴾[1]

پڑھتے، جب کہ دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران کی آیت:

﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○﴾[2]

پڑھتے تھے۔''[3]

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ﴾ ''سو تم بہ آسانی جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھو۔''[4]

میں عموم ہے، یعنی قرآن مجید کے کسی بھی مقام سے نماز میں قراءت ہو سکتی ہے۔

- دوران قراءت اگر ایسی آیت کی تلاوت ہو جس میں عذاب کا ذکر ہو تو نماز ادا کرنے والا اللہ کی پناہ طلب کرے اور اگر رحمت کے ذکر پر مشتمل آیت آئے تو اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال کرے۔ اگر قراءت میں محمد ﷺ کا نام آئے تو درود شریف (ﷺ) پڑھے کیونکہ اس کی بہت تاکید آئی ہے۔

یہ چند امور ہیں جو حالت نماز میں نمازی کے لیے مستحب اور مباح ہیں۔ ہم نے ان کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ آپ بوقت ضرورت ان سے مستفید ہو سکیں۔ نیز آپ کو ان مسائل سے واقفیت اور بصیرت حاصل ہو۔

نماز ایک عظیم عبادت ہے اس میں وہی کام اور بات درست ہے جو ان شرعی حدود کے اندر ہو جو رسول اللہ ﷺ سے وارد ہیں، لہٰذا آپ ان حدود کا خیال رکھیں اور جن امور سے نماز مکمل ہوتی ہو یا اس میں نقص آتا ہو ان سے واقفیت حاصل کریں تاکہ آپ اپنی نماز کامل طور پر ادا کر سکیں۔

سجدہ سہو کا بیان

انسان بھول چوک کا نشانہ بن جاتا ہے اور شیطان کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نمازی کو اثنائے نماز میں مختلف افکار اور اشغال میں الجھا کر رکھے۔ بسا اوقات اس بھول چوک کے نتیجے میں نماز میں کمی بیشی بھی ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں اللہ تعالیٰ نے نمازی کو نماز کے آخر میں سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے جو ایک فدیہ ہے اور اس کے

[1] البقرة 2:136. [2] آل عمران 3:64. [3] صحیح مسلم، صلاة المسافرین، باب استحباب رکعتي سنة الفجر……، حدیث: 727. [4] المزمّل 73:20.

ذریعے سے شیطان ذلیل ہو جاتا ہے، رحمان راضی ہو جاتا ہے اور نماز کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ علمائے کرام اس سجدے کو ''سجدہ سہو'' کا نام دیتے ہیں۔

▲ سہو کا معنی ''بھول جانا'' ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ متعدد بار نماز میں بھول گئے تھے۔ آپ کی یہ بھول امت محمدیہ پر اللہ کی نعمت کا اتمام اور دین کی تکمیل کا سبب ثابت ہوئی تاکہ بھول چوک کے وقت وہ نبی ﷺ کے طریقے کی پیروی کر سکیں۔ بھول چوک میں نبی ﷺ کے جملہ واقعات کتب احادیث میں محفوظ ہیں۔ ایک بار آپ نے چار رکعات کی بجائے دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ پھر باقی دو رکعات پڑھ کر نماز مکمل کی آخر میں سلام سے قبل سجدہ سہو کر لیا۔ ایک دفعہ تین رکعات پڑھا کر سلام پھیر دیا تو پھر ایک رکعت مزید پڑھی اور سجدہ سہو کر لیا۔ ایک موقع پر دو رکعتیں پڑھا کر کھڑے ہو گئے اور درمیانی تشہد میں نہ بیٹھے تو آخر میں سجدہ سہو ادا کر دیا وغیرہ۔ اور آپ نے فرمایا:

«إِذَا سَهَا أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ، فَلَمْ يَدْرِ أَزَادَ أَمْ نَقَصَ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ»

''تم میں سے جب کوئی نماز میں بھول جائے، اسے معلوم نہ ہو کہ کتنی نماز پڑھی ہے، زیادتی ہوئی ہے یا کمی؟ تو وہ دو سجدے کرے۔''[1]

▲ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت پیش آ جائے تب سجدہ سہو مشروع ہوتا ہے: ① جب بھول کر نماز میں کوئی زیادتی ہو جائے۔ ② یا نماز میں کوئی کمی واقع ہو جائے۔ ③ نماز کے دوران میں کسی شے کی کمی بیشی میں شک پڑ جائے۔

ان صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آ جائے تو سجدہ سہو لازمی ہے، جس کی دلیل اور طریقہ سنت رسول ﷺ میں موجود ہے۔ واضح رہے کہ کمی بیشی یا ہر شک سجدہ سہو کرنے کا سبب نہیں بنتا بلکہ اس مسئلہ میں جو سنت رسول ہے اس پر عمل کیا جائے گا، جس کی تفصیل آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے:

▲ جب سجدہ سہو کرنے کا سبب پیدا ہو جائے تب وہ مشروع ہو جاتا ہے، خواہ فرض نماز ہو یا نفل کیونکہ دلائل میں عموم ہے۔

▲ نماز میں بھول چوک کے سبب سجدہ سہو کے بارے میں مندرجہ بالا تین حالتوں کی وضاحت اور تفصیل درج ذیل ہے:

① بھول کر نماز کے افعال یا اقوال میں زیادتی ہو جائے۔ افعال میں زیادتی سے مراد جنس نماز کے افعال ہیں۔

[1] جامع الترمذي، الصلاة، باب في من يشك في الزيادة والنقصان، حديث: 398، وشرح السنة للبغوي: 3/282، حديث: 755، وكنز العمال: 7/473، حديث: 19843 واللفظ له.

جیسے بیٹھنے کے موقع پر کھڑے ہو جانا۔ یا کھڑے ہونے کے مقام پر بیٹھ جانا، یا رکوع، سجدہ زیادہ کر لینا۔ ان صورتوں میں سجدہ سہو لازم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا زَادَ الرَّجُلُ أَوْ نَقَصَ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ»

''جب کوئی شخص (اپنی نماز میں بھول کر) زیادتی یا کمی کرے تو (آخر میں) دو سجدے کر لے۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں کسی عمل کی زیادتی درحقیقت نماز کی شکل و صورت میں ایک قسم کی کمی ہے۔ اس کے لیے سجدہ سہو کرنے کا حکم ہے تا کہ یہ کمی پوری ہو جائے۔

اسی طرح اگر ایک رکعت زائد پڑھ لی اور نماز سے فارغ ہو جانے کے بعد اسے یاد آیا تو وہ صرف سہو کے دو سجدے کرے۔ اور اگر اسے زائد رکعت ادا کرنے کے دوران میں یاد آیا تو وہ فوراً بیٹھ جائے۔ اگر تشہد نہیں پڑھا تھا تو پڑھے، پھر سجدہ سہو کرے اور سلام پھیر دے۔

اگر کوئی امام ہے تو جس مقتدی کو کسی کام کی زیادتی کا علم ہو جائے تو وہ امام کو توجہ دلانے کے لیے کلمہ تسبیح (سبحان اللہ) کہے اور عورت تالی بجا دے تو امام ان کے توجہ دلانے پر واپس لوٹ جائے، بشرطیکہ امام کو اپنے درست ہونے کا یقین نہ ہو کیونکہ مقصد درست صورت کی طرف لوٹنا ہے۔ جب نقص پیدا ہو تو تب بھی مقتدیوں پر امام کو تنبیہ کرنا لازم ہے۔

اقوال میں زیادتی کی متعدد صورتیں ہیں، مثلاً: رکوع یا سجدہ میں قراءت کرنا، چار رکعتوں والی نماز کی آخری دو رکعتوں میں یا مغرب کی تیسری رکعت میں فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کی قراءت کرنا۔ ان صورتوں میں بھی سجدہ سہو کرنا مستحب ہے۔[2]

② نماز میں بھول کر کمی واقع ہو جائے، یعنی ایسا فعل جو نماز کا حصہ ہے چھوٹ جائے۔ اگر چھوٹ جانے والا عمل نماز کا رکن ہے اور رکن بھی تکبیر تحریمہ ہو تو اس کی نماز ہی نہ ہو گی، نہ سجدہ سہو کافی ہو گا۔ اور اگر تکبیر تحریمہ کے علاوہ کوئی اور رکن چھوٹ گیا ہے، مثلاً: رکوع یا سجدہ۔ اگر بعد والی رکعت کی قراءت سے پہلے پہلے اسے یاد آ گیا تو اس پر لازم ہے کہ واپس پلٹ آئے اور چھوٹ جانے والا رکوع یا سجدہ ادا کرے اور اس رکوع یا سجدے کے بعد والے تمام کام دوبارہ ادا کرے۔ اور اگر بعد والی رکعت کی قراءت شروع کر دی تھی تب اسے چھوٹ جانے والا رکن

---

① صحيح مسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة والسجود له، حديث: 572.

② چار رکعتوں والی نماز کی آخری دو رکعتوں میں یا مغرب کی تیسری رکعت میں فاتحہ کے علاوہ قراءت کرنا مشروع ہے۔ سجدہ سہو یہاں نہیں ہو گا۔ (ابوزید)

(رکوع یا سجدہ) یاد آیا تو جس رکعت میں رکوع یا سجدہ چھوٹ گیا تھا وہ ساری رکعت باطل ہو جائے گی اور شمار نہ ہوگی، بعد والی رکعت باطل رکعت کے قائم مقام ہوگی۔ الغرض اسے ایک رکعت مزید پڑھنا ہوگی کیونکہ اس نے ایسا رکن چھوڑا ہے جس کا استدراک ممکن نہیں۔

اگر کسی کو متروک رکن کا علم سلام پھیرنے کے بعد ہوا تو یہ سمجھا جائے کہ گویا ایک رکعت چھوٹ گئی ہے، لہٰذا وہ ایک مکمل رکعت ادا کرے۔ ہاں اگر اس کی نماز کا آخری تشہد یا سلام چھوٹ گیا ہو تو صرف آخری تشہد ادا کر کے سجدہ سہو کرے اور سلام پھیر دے۔

اگر کوئی شخص تشہد اول میں بیٹھنا بھول گیا اور تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا تو وہ تشہد کی حالت کی طرف پلٹ آئے بشرطیکہ وہ سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو۔ اور اگر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا ہو تو اس کا واپس تشہد کی حالت میں پلٹنا مکروہ ہے، اگر وہ پلٹ گیا تو نماز باطل نہ ہوگی۔ اگر تیسری رکعت میں فاتحہ کی قراءت شروع کر دی تو تب پلٹنا قطعاً درست نہیں کیونکہ وہ دوسرے رکن کی ادائیگی شروع کر چکا ہے، جسے توڑنا یا چھوڑنا قطعاً مناسب نہیں۔

اگر کسی سے رکوع یا سجدے میں تسبیحات چھوٹ گئیں تو اس رکوع یا سجدے کو دوبارہ ادا کرے، بشرطیکہ وہ بعد والی رکعت ادا کرنے کے لیے سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو اور وہ ان تمام حالات میں سجدہ سہو ادا کرے۔

③ نماز میں شک پڑ جائے: اگر کسی کو نماز کی رکعات کی تعداد میں شک پڑ جائے، مثلاً: اس نے دو رکعتیں ادا کی ہیں یا تین تو دو سمجھے کیونکہ کم تعداد یقینی ہے۔ پھر سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے کیونکہ مشکوک چیز معدوم کے حکم میں ہے۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلَمْ يَدْرِ أَوَاحِدَةً صَلَّى أَمْ ثِنْتَيْنِ فَلْيَجْعَلْهَا وَاحِدَةً، وَإِذَا لَمْ يَدْرِ ثِنْتَيْنِ صَلَّى أَمْ ثَلَاثًا فَلْيَجْعَلْهَا ثِنْتَيْنِ»

''جب کسی کو اپنی نماز میں شک پڑ جائے اور اسے علم نہ ہو کہ ایک رکعت پڑھی ہے یا دو تو وہ ایک رکعت سمجھے۔ اور اگر وہ نہیں جانتا کہ اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا تین تو وہ دو ہی سمجھ لے۔''[1]

اگر کسی مقتدی کو شک ہوا کہ جب وہ امام کے ساتھ شامل ہوا تھا آیا وہ پہلی رکعت تھی یا دوسری تو وہ دوسری رکعت سمجھ لے یا اسے شک ہوا کہ امام کے ساتھ اسے پوری رکعت ملی تھی یا نہیں وہ مکمل رکعت شمار نہ کرے اور سجدہ سہو کرے۔

① مسند أحمد: 190/1، وجامع الترمذي، الصلاة، باب في من يشك في الزيادة والنقصان، حديث: 398، وصحيح مسلم، المساجد، باب السهو في الصلاة والسجود له، حديث: 571 عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه.

اگر کسی کو نماز کے رکن چھوٹ جانے پر شک ہو تو وہ اس رکن اور اس رکن کے بعد والی ایک رکعت کے ارکان دوبارہ ادا کرے جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اگر کسی واجب کے چھوٹ جانے میں شک ہو تو اس شک کو معتبر نہ سمجھے اور سجدہ سہو نہ کرے۔ اسی طرح اگر کسی واجب کی زیادتی میں شک ہو تو اسے قابل التفات نہ سمجھے کیونکہ اصل چیز کمی یا زیادتی کا نہ ہونا ہے۔

یہ سجدہ سہو کے چند احکامات تھے جو ہم نے بیان کر دیے، تفصیل کا طالب بڑی کتب کی طرف رجوع کرے۔ واللہ الموفق.

نماز کے بعد کے اذکار اور وظائف

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۙ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ○﴾

''مسلمانو! اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرو۔ اور صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عبادات کی ادائیگی کے بعد ذکر کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ﴾

''پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے رہو۔''[2]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○﴾

''پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور بکثرت اللہ کا ذکر کیا کرو تاکہ تم فلاح پالو۔''[3]

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ رمضان المبارک کے روزے مکمل کرنے کے بعد ذکر کریں۔ ارشاد ہے:

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○﴾

''وہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کر لو اور اللہ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں بیان کرو اور اس کا

[1] الأحزاب 33:41,42. [2] النسآء 4:103. [3] الجمعة 62:10.

شکر کرو۔"①

مناسک حج کے بعد ذکر کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾

"پھر جب تم ارکان حج ادا کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"②

عبادات کے بعد ذکر کا حکم دینے میں حکمت الٰہی شاید یہ ہے کہ ادائیگی عبادت میں اگر کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو یا شیطانی وسوسے آ گئے ہوں تو ذکر کے ساتھ ان کا علاج اور مداوا ہو جائے۔ علاوہ ازیں انسان کو توجہ دلانا ہے کہ مسلسل ذکر و عبادت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمہ وقت رابطہ مطلوب ہے، نیز وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اس نے عبادت سے فارغ ہو کر اپنے خالق کا حق کامل طور پر ادا کر دیا ہے۔

فرض نماز کے بعد مسنون ذکر ایسے انداز اور طریقہ سے ہونا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے۔ اس بارے میں ان بدعات سے اجتناب کیا جائے جنھیں بعض بدعتی صوفیاء نے اختیار کر رکھا ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے منقول بعض اذکار کی تفصیل کچھ یوں ہے:

① سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین بار أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ کہتے اور پھر یہ دعا پڑھتے:

«اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ!»

"اے اللہ! تو سلامتی والا ہے اور سلامتی تیری ہی طرف سے ہے، اے جلال اور عزت والے تو برکت والا ہے۔"③

② سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوتے تو یہ کلمات پڑھتے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَللّٰهُمَّ! لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ

① البقرة 2:185. ② البقرة 2:200. ③ صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، حديث:591،592، وسنن النسائي، السهو، باب الاستغفار بعد التسليم، حديث:1338. نماز سے فارغ ہو کر پہلے [اَللّٰهُ أَكْبَرُ] اور پھر یہ کلمات کہنے چاہئیں جیسے کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے۔ صحيح البخاري، الأذان، باب الذكر بعد الصلاة، حديث: 842، وسنن النسائي، السهو، باب التكبير بعد تسليم الإمام، حديث: 1336.

مِنْكَ الْجَدُّ»

''ایک اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، ملک اسی کا ہے اور تعریف بھی اسی کے لیے ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ جو تو دے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو تو روک دے اسے دے کوئی نہیں سکتا اور کسی بڑے کو اس کی بڑائی تیری گرفت سے نہیں بچا سکتی۔''[1]

③ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے وقت سلام پھیرنے کے بعد یہ کلمات پڑھتے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ، لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ، لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ، وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ»

''ایک اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، ملک اسی کا ہے اور تعریف بھی اسی کے لیے ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ گناہ سے بچنے کی اور نیکی کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کے بغیر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں، اس کی نعمت اور اسی کا فضل ہے اور اسی کی اچھی تعریف ہے، اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں۔ ہم اسی کی اطاعت میں مخلص ہیں اگرچہ کافر پسند نہیں کرتے۔''[2]

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے فجر کی نماز سے سلام پھیرنے کے بعد اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے اور دنیاوی کلام کیے بغیر درج ذیل کلمات ''دس مرتبہ'' پڑھے۔ اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اس کے دس گناہ مٹا دیے جائیں گے اور دس درجے بلند ہو جائیں گے، اس کا سارا دن ہر قسم کی پریشانی سے محفوظ ہوگا، وہ شخص شیطان سے مامون ہوگا، شرک کے سوا کوئی گناہ اس کے قریب تک نہ پھٹکے گا۔ کلمات یہ ہیں:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ

---

① صحيح البخاري، الأذان، باب الذكر بعد الصلاة، حديث: 844، وصحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، حديث: 593. ② صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، حديث: 594.

عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»①

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مندرجہ بالا کلمات مغرب کی نماز کے بعد بھی دس مرتبہ پڑھے جائیں۔②

علاوہ ازیں مغرب اور فجر کی نماز کے بعد [اَللّٰهُمَّ ! أَجِرْنِي مِنَ النَّارِ] ''الٰہی ! مجھے آگ سے بچانا۔'' کے کلمات بھی سات مرتبہ پڑھے جائیں۔③

④ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو شخص ہر فرض نماز کے بعد تینتیس (33) مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ اور تینتیس (33) مرتبہ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ اور تینتیس (33) مرتبہ اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہے اور سو کا عدد مکمل کرنے کے لیے ایک مرتبہ یہ کلمات پڑھے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»

''ایک اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، ملک اسی کا ہے اور تعریف بھی اسی کے لیے ہے اور وہی ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' تو اگر اس کے گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر بھی ہوں گے تو معاف کر دیے جائیں گے۔''④

⑤ پھر آیۃ الکرسی، سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھے۔⑤ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا تو اس کے جنت میں داخل ہونے کے لیے موت کے سوا اور کوئی شے رکاوٹ نہ ہوگی۔''⑥

ایک اور روایت میں یوں ہے:

① جامع الترمذي، الدعوات، باب في ثواب كلمة التوحيد التي فيها : إلهاً واحدًا أحدًا صمدًا......، حديث:3474، وصحيح الترغيب والترهيب للألباني:321/1، حديث :472. ② مسند أحمد:298/6، وموارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان، باب ما يقول من الذكر بعد الصلاة، حديث :2341 (صحیح بخاری میں ہے، جس نے یہ کلمات سو مرتبہ پڑھے اسے دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ہوگا۔ سو نیکیاں ملیں گی، سو گناہ مٹا دیے جائیں گے اور صبح سے شام تک شیطان سے حفاظت میں رہے گا۔'' صحيح البخاري، بدء الخلق، باب صفة إبليس و جنوده، حديث:3293) . ③ سنن أبي داود، الأدب، باب ما يقول إذا أصبح؟ حديث :5079، والسنن الكبرٰى للنسائي، عمل اليوم والليلة، باب ثواب من استجار من النار سبع مرات ...... ، حديث :9939. ④ صحيح مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، حديث : 595-597. ⑤ سنن أبي داود، الوتر، باب في الاستغفار، حديث :1523، وموارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان، باب قراءة المعوذات دبر الصلاة، حديث :2347. ⑥ السنن الكبرٰى للنسائي، عمل اليوم والليلة، باب ثواب من قرأ آية الكرسي دبر كل صلاة، حديث :9928، والمعجم الكبير للطبراني:134/8، حديث :7532.

«كَانَ فِي ذِمَّةِ اللهِ إِلَى الصَّلَاةِ الْأُخْرٰى»

''وہ شخص دوسری نماز تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے گا۔''[1]

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

«أَمَرَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ أَقْرَأَ بِالْمُعَوِّذَتَيْنِ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ»

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہر نماز کے بعد معوذات (سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس) پڑھنے کا حکم دیا۔''[2]

مندرجہ بالا احادیث سے واضح ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد اذکار مذکورہ مسنون اور مشروع ہیں اور انھیں پڑھنے کا بہت زیادہ اجر وثواب ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ مسنون طریقے سے ان وظائف کو پڑھنے کا اہتمام کریں۔ یہ اذکار نماز کے فوراً بعد نماز کے مقام سے کھڑا ہونے سے قبل ادا کرنے چاہئیں جس کی ترتیب اس طرح ہو سکتی ہے۔

① سلام کے بعد (بلند آواز سے تکبیر کہہ کر) تین بار [أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ] پڑھیں۔

② پھر پڑھیں:

«اَللّٰهُمَّ! أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ!»

③ پھر پڑھیں:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَللّٰهُمَّ! لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»

④ اس کے بعد یہ کلمات پڑھیں:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ، لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ، لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ، وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ»

① [ضعيف] المعجم الكبير للطبراني: 85/3، حديث: 2733، وسلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني، رقم: 5135.

② سنن النسائي، السهو، باب الأمر بقراءة المعوذات بعد التسليم من الصلاة، حديث: 1337، وسنن أبي داود، الوتر، باب في الاستغفار، حديث: 1523، وجامع الترمذي، فضائل القرآن، باب ما جاء في المعوذتين، حديث: 2903 واللفظ له.

⑤ پھر 33 مرتبہ ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' 33 مرتبہ ''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ'' 33 مرتبہ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' اور سو کی گنتی پورا کرنے کے لیے ایک مرتبہ پڑھیں:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»

⑥ پھر آیۃ الکرسی اور تینوں ''قل'' ایک ایک بار پڑھیں۔

⑦ بعد نماز مغرب اور فجر دس مرتبہ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ پڑھیں اور سات مرتبہ اَللّٰهُمَّ! أَجِرْنِي مِنَ النَّارِ پڑھیں۔

⑧ مغرب اور فجر کی نمازوں کے بعد تینوں ''قل'' تین بار پڑھنا مستحب ہے۔

نماز کے بعد لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ، سُبْحَانَ اللّٰهِ ، اَلْحَمْدُلِلّٰهِ اور اَللّٰهُ أَكْبَرُ کے کلمات انفرادی طور پر با آواز پڑھے جائیں تو مستحب ہے۔[1] البتہ انھیں اجتماعی طور پر اور مل کر ایک آواز سے پڑھنا درست نہیں۔

تسبیحات، تحمیدات اور تکبیرات وغیرہ کی تعداد کو انگلیوں کی گرہوں پر شمار کیا جائے کیونکہ روز قیامت (پڑھنے والے کے حق میں بطور شہادت) ان کو بولنے کی قوت ملے گی[2] (علاوہ ازیں یہ سنت رسول ﷺ بھی ہے)۔

اذکار وتسبیحات کے لیے موجودہ ''تسبیح'' کا استعمال مباح ہے۔ بشرطیکہ اس کو استعمال کرنے والا اسے باعث فضیلت نہ سمجھتا ہو، ورنہ (بعض علماء کے نزدیک) اس کا استعمال مکروہ بلکہ بدعت ہے، چنانچہ کئی صوفیاء کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے گلوں میں ہار کی طرح تسبیح لٹکائے پھرتے ہیں، یا ہاتھوں میں کنگن کی طرح سجائے رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کام نہ صرف بدعت ہے بلکہ ریا کاری اور تکلف کے زمرے میں بھی آتا ہے۔

نمازی اذکار مذکورہ سے فارغ ہو کر انفرادی طور پر حسب خواہش سراً دعا کرے کیونکہ عبادت اور اذکار کے بعد دعا کی قبولیت کا بہت مناسب موقع ہے۔

فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کی جائے جیسا کہ بعض لوگوں کی عادت ہے کیونکہ یہ بدعت ہے۔ البتہ نفلی نماز کے بعد کبھی کبھار ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

① یہ بعض علماء کی رائے ہے جو صحیح بخاری کی حدیث نمبر 841 سے استدلال کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے علماء مقتدیوں کے لیے ایک دفعہ بلند آواز سے اللہ اکبر کے سوا مزید جہری ذکر کے قائل نہیں۔ دیکھیے فتاوی الدین الخالص: 4/429۔(ع۔و)

② سنن أبي داود، الوتر، باب التسبيح بالحصى، حديث :1501، وجامع الترمذي، الدعوات، باب في فضل التسبيح والتهليل والتقديس، حديث :3583، ومسند أحمد:6/371,370.

بلند آواز سے دعا کرنے کی بجائے آہستہ آواز میں دعا کرنا زیادہ مناسب اور بہتر ہے کیونکہ یہ انداز اخلاص اور خشوع وخضوع کے قریب تر اور ریا کاری سے دور تر ہے۔

بعض ممالک میں کئی حضرات نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر با آواز بلند اجتماعی طور پر دعا کرتے ہیں یا امام دعا کرتا ہے اور حاضرین ہاتھ اٹھائے ہوئے امام کے دعائیہ کلمات پر آمین، آمین کہتے ہیں، یہ کام سراسر بدعت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں کہ آپ نے لوگوں کو نماز پڑھا کر بعد میں اس طرح دعا کی ہو۔ فجر میں نہ عصر میں اور نہ کسی اور نماز میں۔ اور نہ ائمہ کرام میں سے کسی نے اسے پسند کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس نے نماز کے بعد اجتماعی دعا کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کا کوئی قول نقل کیا ہے وہ غلط فہمی کا شکار ہوا ہے۔''[1] ہمارے لیے تو اس چیز کی پابندی واجب ہے جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

''اور تمھیں جو کچھ رسول دے اسے لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔''[2]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (ﷺ) میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔''[3]

نفل نماز کا بیان

اللہ کے بندو! تمھارے رب نے اپنے تقرب کے لیے فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ نفل نماز کو بھی مشروع قرار دیا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ اور طلب علم کے بعد نفل نماز اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے نفل نماز پر مداومت فرمائی ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ

[1] مجموع الفتاوی لشیخ الإسلام ابن تیمیة: 512/22. [2] الحشر 7:59. [3] الأحزاب 21:33.

نے فرمایا ہے:

«اِسْتَقِيمُوا وَلَنْ تُحْصُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ خَيْرَ أَعْمَالِكُمُ الصَّلَاةُ»

''سیدھے چلتے رہو اور تم ہرگز مکمل طور پر سیدھے نہیں رہ سکتے (کوئی نہ کوئی غلطی ہو ہی جاتی ہے) اور جان لو کہ تمھارے اعمال میں سے بہترین عمل نماز ہے۔''[1]

نماز کئی طرح کی عبادتوں کا مجموعہ ہے، مثلاً: قراءت، رکوع، سجدہ، دعا، تذلل، خشوع و خضوع، مناجات، تکبیر، تسبیح اور درود وغیرہ۔

نفل نماز کی دو انواع ہیں: ① وہ نفل نمازیں جن کے اوقات متعین اور مقرر ہیں۔ انھیں ''نوافل مقیدہ'' کہا جاتا ہے۔ ② وہ نفل نمازیں جن کے اوقات متعین اور مقرر نہیں۔ انھیں ''نوافل مطلقہ'' کہا جاتا ہے۔

پہلی نوع کی متعدد اقسام ہیں۔ ان میں بعض کی تاکید دوسری نفل نمازوں سے زیادہ ہے، مثلاً: سب سے زیادہ تاکید نماز کسوف کی ہے۔ پھر نماز استسقا کی، پھر نماز تراویح کی، پھر نماز وتر کی۔ ان تمام نمازوں کی تفصیل اور احکام آپ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

نماز وتر

نفل نماز کے بارے میں ہم اپنی بات کا آغاز نماز وتر سے کرتے ہیں کیونکہ اس کی خاص اہمیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نفل نمازوں میں نماز وتر کی سب سے زیادہ تاکید ہے بلکہ بعض علماء تو اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ اور جس مسئلہ کے واجب یا غیر واجب ہونے میں اختلاف ہو اس کی تاکید و اہمیت اس عمل سے زیادہ ہی ہوگی جس کے غیر واجب ہونے پر اتفاق ہے۔

نماز وتر کی مشروعیت پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور اس کا چھوڑنا کسی مسلمان کے لائق نہیں۔ جو شخص ترک وتر پر اصرار کرے اس کی شہادت مردود ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے: ''جس نے وتر کی نماز عمداً چھوڑ دی وہ برا آدمی ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی شہادت قبول نہ کی جائے۔''[2]

سنن ابوداود میں مرفوع روایت ہے:

① سنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، باب المحافظة على الوضوء، حديث: 277، والموطأ للإمام مالك، الطهارة، باب جامع الوضوء: 34/1، حديث: 36. ② المغني لابن قدامة: 829/1.

«مَنْ لَّمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا»

”جس شخص نے وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“ ①

◭ وتر دراصل ایک مستقل اور الگ رکعت کا نام ہے۔ اگر ایک ہی سلام سے متصل تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ رکعتیں ہوں گی تو یہ تمام رکعتیں وتر کہلائیں گی۔ البتہ جب دو یا زیادہ مرتبہ سلام پھیرا جائے گا تو وتر صرف اس رکعت کا نام ہوگا جو مستقل اور الگ پڑھی گئی ہے۔

◭ وتر کا وقت نماز عشاء کے بعد شروع ہوتا ہے اور طلوع فجر تک رہتا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کے ہر حصے میں وتر ادا کیے ہیں۔ یعنی رات کے شروع حصے میں، وسط میں اور آخری حصے میں، حتیٰ کہ آپ نے طلوعِ فجر کے قریب تک وتر ادا کیے ہیں۔ ②

بہت سی احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ ساری رات ہی نماز وتر کا وقت ہے، البتہ نماز عشاء کی ادائیگی سے قبل وتر جائز نہیں۔ جس شخص کو رات کے آخری حصے میں اٹھنے پر اعتماد ہو تو اس کے لیے رات کے آخری حصے میں وتر ادا کرنا افضل ہے۔ اور جسے اعتماد و یقین نہ ہو تو وہ سونے سے پہلے پہلے وتر ادا کر لے، یہی رسول اللہ ﷺ کی وصیت اور تلقین ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَيُّكُمْ خَافَ أَنْ لَّا يَقُومَ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوتِرْ، ثُمَّ لِيَرْقُدْ وَمَنْ وَّثِقَ بِقِيَامٍ مِّنَ اللَّيْلِ فَلْيُوتِرْ مِنْ آخِرِهِ، فَإِنَّ قِرَاءَةَ آخِرِ اللَّيْلِ مَحْضُورَةٌ، وَذٰلِكَ أَفْضَلُ»

”جس شخص کو یہ خوف ہو کہ وہ رات کے آخری حصے میں اٹھ نہ سکے گا تو وہ وتر ادا کر لے اور سو جائے اور جس شخص کو رات کے کسی حصے میں اٹھ جانے پر یقین واعتماد ہو تو وہ رات کے آخری حصے میں وتر ادا کر لے، رات کے آخری حصے میں قراءت قرآن کے وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہ افضل ہے۔“ ③

◭ وتر کم از کم ایک رکعت ہے۔ اس بارے میں متعدد احادیث بھی ہیں اور تقریباً دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا ثبوت ملتا ہے لیکن افضل اور احسن یہ ہے کہ اس سے پہلے جفت رکعات ادا کی جائیں۔

◭ نماز وتر ادا کرنے والا زیادہ سے زیادہ گیارہ یا تیرہ رکعات، دو دو کر کے ادا کرے، پھر آخر میں ایک رکعت

① سنن أبي داود، الوتر، باب فيمن لم يوتر، حديث: 1419، ومسند أحمد: 443/2. ② صحيح البخاري، الوتر، باب ساعات الوتر، حديث: 996، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل و عدد ركعات النبيﷺ في الليل ...... ، حديث: 745. ③ صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب من خاف أن لا يقوم من آخر الليل فليوتر أوله، حديث: 755.

پڑھے تب اس کی ساری نماز وتر بن جائے گی۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي بِاللَّيْلِ إِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً يُوتِرُ مِنْهَا بِوَاحِدَةٍ»

''رسول اللہ ﷺ رات کو گیارہ رکعات ادا کرتے،ایک رکعت سے ساری نماز وتر بنا لیتے۔''

دوسری روایت میں یوں ہے:

«يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوتِرُ بِوَاحِدَةٍ»

''ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرتے اور آخر میں ایک رکعت سے ساری نماز کو وتر بنا لیتے۔''[1]

نماز وتر پڑھنے والے کے لیے یہ بھی درست ہے کہ وہ لگاتار دس رکعات پڑھے، پھر دسویں رکعت پڑھ کر بیٹھ جائے،تشہد پڑھے اور بغیر سلام پھیرے سیدھا کھڑا ہو جائے اور گیارہویں رکعت پڑھ کر تشہد بیٹھے اور سلام پھیر دے۔اور یہ بھی درست ہے کہ وہ لگاتار گیارہ رکعات پڑھ کر آخر میں تشہد پڑھے اور پھر سلام پھیر دے۔[2]

▲ نو رکعات نماز وتر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بغیر سلام پھیرے لگاتار پڑھے۔آٹھویں رکعت کے بعد تشہد میں بیٹھ جائے اور پھر بغیر سلام پھیرے نویں رکعت ادا کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔پھر آخری تشہد پڑھے اور سلام پھیر دے۔

▲ سات رکعات یا پانچ رکعات ادا کرنی ہوں تو آخری رکعت میں تشہد بیٹھے اور سلام پھیر دے کیونکہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سات یا پانچ رکعات سے نماز کو وتر بناتے تو درمیان میں نہ سلام پھیرتے اور نہ کلام کرتے۔[3]

▲ رات کی نماز کو تین رکعات کے ساتھ وتر بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرا جائے، پھر تیسری رکعت الگ طور پر ادا کی جائے۔[4] پہلی رکعت میں سورة الأعلىٰ، دوسری میں سورة الكٰفرون اور تیسری رکعت میں سورة الإخلاص پڑھنا مستحب ہے۔

① صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل وعدد ركعات النبي ﷺ في الليل ...... ، حديث : 736. ② سنن النسائي، قيام الليل، باب كيف الوتر بخمس ...... ، حديث : 1715، وسنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ما جاء في الوتر بثلاث و خمس و سبع و تسع، حديث : 1192.

③ ایک ہی سلام کے ساتھ نو رکعات وتر ادا کرنا صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، تاہم دس یا گیارہ رکعات ادا کرنے کے بارے میں فاضل مصنف نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔(صارم)

④ مذکورہ بالا طریقہ زیادہ بہتر ہے، تاہم تین رکعات وتر ایک ہی تشہد اور سلام کے ساتھ پڑھنا بھی رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو محلی ابن حزم: 47/3.(صارم)

مندرجہ بالا روایات سے واضح ہوگیا کہ رات کی نماز کو تیرہ، گیارہ، نو، سات، پانچ، تین اور ایک رکعت سے وتر بنانا جائز ہے۔ گیارہ رکعات ادا کرنا ''درجہ کمال'' ہے۔ تین رکعات وتر ادا کرنا کمال کا ادنیٰ درجہ ہے جب کہ ایک رکعت وتر ''کفایت'' کا درجہ ہے۔

مستحب یہ ہے کہ وتر میں رکوع کے بعد قنوت کریں، جس میں ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کی جائے۔[1]

«اَللّٰهُمَّ! اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِي فِيمَا أَعْطَيْتَ، وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ، إِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ، وَإِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ [وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ] تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ، لَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ»

''اے اللہ! تو نے جن لوگوں کو ہدایت دی ہے مجھے بھی ان میں ہدایت دے۔ اور جن لوگوں کو تو نے عافیت دی ہے مجھے بھی ان میں عافیت دے اور جن لوگوں کی تو نے سرپرستی فرمائی ہے ان لوگوں میں میرا بھی سرپرست بن۔ اور جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لیے برکت فرما۔ اور تو نے جو فیصلے کیے ہیں ان کے شر سے مجھے بچا کیونکہ تو ہی (حتمی) فیصلے کرتا ہے اور تیرے (فیصلے کے) خلاف کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ یقینی بات ہے کہ تو جس کا دوست بن جائے وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا اور جس سے تو دشمنی کرلے وہ ہرگز معزز نہیں ہوسکتا۔ اے ہمارے رب! تو بابرکت اور بلند شان والا ہے۔[2] اور تیرے عذاب سے تیرے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہے۔''[3]

نماز تراویح

ہادی برحق سیدنا محمد ﷺ نے رمضان المبارک کے مہینہ میں ''نماز تراویح'' کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نماز ''سنت مؤکدہ'' ہے۔

[1] رکوع کے بعد قنوت وتر جائز ہے جبکہ افضل عمل یہ ہے کہ رکوع سے قبل ہاتھ اٹھائے بغیر قنوت کیا جائے۔ (ابوزید) صفة صلاة النبي ﷺ للألباني، باب القنوت في الوتر، ص: 179.

[2] سنن أبي داود، الوتر، باب القنوت في الوتر، حديث: 1425، و جامع الترمذي، الوتر، باب ماجاء في القنوت في الوتر، حديث: 464، وسنن النسائي، قيام الليل، باب الدعاء في الوتر، حديث: 1746. [3] صفة صلاة النبي ﷺ للألباني، ص: 181.

تراویح کا لغوی معنی ’’آرام کرنا‘‘ ہے۔ چونکہ اس نماز میں ہر چار رکعات کے طویل قیام کے بعد قدرے وقفہ اور آرام کیا جاتا ہے، اس لیے اس کا نام تراویح رکھا گیا ہے۔

نماز تراویح مسجد میں با جماعت ادا کرنا افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک میں اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے ساتھ چند راتیں مسجد میں قیام اللیل کیا۔ پھر اس خوف کی بنا پر اسے چھوڑ دیا کہ کہیں لوگوں پر فرض نہ ہو جائے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ صَلّٰى ذَاتَ لَيْلَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَصَلّٰى بِصَلَاتِهِ نَاسٌ، ثُمَّ صَلّٰى مِنَ الْقَابِلَةِ فَكَثُرَ النَّاسُ، ثُمَّ اجْتَمَعُوا مِنَ اللَّيْلَةِ الثَّالِثَةِ أَوِ الرَّابِعَةِ فَلَمْ يَخْرُجْ إِلَيْهِمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَلَمَّا أَصْبَحَ قَالَ: قَدْ رَأَيْتُ الَّذِي صَنَعْتُمْ وَلَمْ يَمْنَعْنِي مِنَ الْخُرُوجِ إِلَيْكُمْ إِلَّا أَنِّي خَشِيتُ أَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ، وَذٰلِكَ فِي رَمَضَانَ»

’’نبی ﷺ نے ماہ رمضان میں ایک رات قیام کیا اور کچھ لوگوں نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ قیام کیا۔ پھر اگلی رات قیام کیا تو اور لوگ بھی کثیر تعداد میں شریک ہو گئے، پھر تیسری یا چوتھی رات ہوئی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قیام رمضان کے لیے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئے لیکن آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف نہ لائے۔ جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم (اپنی موجودگی کے اظہار کے لیے) جو کچھ کر رہے تھے مجھے معلوم تھا لیکن جس چیز نے مجھے روک دیا وہ یہ خوف تھا کہ یہ نماز تم پر فرض ہو جائے گی۔ اور یہ رمضان کا مہینہ تھا۔‘‘ [1]

آپ ﷺ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نماز تراویح کا اہتمام کیا اور امت محمدیہ نے بھی اسے قبول کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهُ مَنْ قَامَ مَعَ الْإِمَامِ حَتّٰى يَنْصَرِفَ كَتَبَ اللهُ لَهُ قِيَامَ لَيْلَةٍ»

’’جس نے امام کے ساتھ نماز تراویح میں مکمل قیام کیا، اس کے اعمال نامہ میں ساری رات کا قیام لکھا جائے گا۔‘‘ [2]

① صحيح البخاري، التهجد، باب تحريض النبي ﷺ على قيام الليل و النوافل من غير إيجاب، حديث: 1129، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان وهو التراويح، حديث: 761. ② سنن النسائي، قيام الليل، باب قيام شهر رمضان، حديث: 1606، وسنن الدارمي، الصوم، باب في فضل قيام شهر رمضان، حديث: 1778.

اورفرمایا:

«مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»

''جس نے ایمان اورطلب ثواب کی نیت کے ساتھ رمضان المبارک کا قیام کیا، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کردیے جائیں گے۔''[1]

نمازتراویح سنت ثابتہ ہے،لہٰذا کسی مسلمان کے لائق نہیں کہ وہ اسے چھوڑ دے۔نمازتراویح کی رکعات کی تعداد کی تعیین رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں،لہٰذا اس امر میں وسعت ہے۔[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:''نمازتراویح ادا کرنے والا چاہے تو بیس رکعات ادا کرے جیسا کہ امام احمد اورامام شافعی رحمہما اللہ کا مذہب مشہور ہے، یا وہ چھتیس رکعات ادا کرے جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو گیارہ یا تیرہ رکعات پڑھ لے، جس قدر بھی پڑھے درست ہے۔قیام چھوٹا ہوتو رکعات کی تعداد بڑھالی جائے اوراگر رکعات کی تعداد کم ہوتو قیام لمبا کرلیا جائے۔[3]

سیدنا امیرالمومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کولوگوں کا امام مقرر کیا تو انھوں نے بیس رکعات پڑھائیں۔[4] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی کم رکعات پڑھتا اورکوئی زیادہ۔الغرض شارع علیہ السلام سے محدود یا متعین تعداد کے بارے میں کوئی نص وارد نہیں۔

اکثر ائمۂ مساجد جونمازتراویح پڑھاتے ہیں، وہ توجہ سے نماز نہیں پڑھاتے، ان کے رکوع وسجود میں اطمینان اور سکون نہیں ہوتا، حالانکہ طمانینت رکن نماز ہے۔نماز کا مطلوب حضور قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونا ہے اوراس قرآن مجید کے پڑھے جانے والے حصے پر غور کرنا اورنصیحت حاصل کرنا ہے۔لیکن یہ چیزیں ناپسند حد تک جلد بازی کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ایسی دس رکعات جن میں قیام لمبا ہواوراطمینان وسکون ہوان بیس رکعات سے کہیں بہتر ہیں جوانتہائی جلد بازی سے ادا ہوں کیونکہ نماز کا لب لباب اورروح، اللہ تعالیٰ کے حضور دل کو

---

[1] صحيح البخاري، الإيمان، باب تطوع قيام رمضان من الإيمان، حديث:37، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان وهو التراويح، حديث :759.

[2] مؤلف رحمہ اللہ کی یہ بات محل نظر ہے کہ آپ ﷺ سے تعداد کی تعیین ثابت نہیں کیونکہ آپ ﷺ نے تین دن جونمازتراویح پڑھائی تھی وہ گیارہ رکعات تھیں،لہٰذا سنت گیارہ رکعت ہی ہیں۔(قيام الليل للمروزي)(صارم) صحيح البخاري، حديث: 1147، وصحيح ابن خزيمة: 138/2، حديث: 1070. [3] حاشية الروض المربع شرح زاد المستقنع :201/2. [4] [ضعيف] المصنف لابن أبي شيبة: 165/2، رقم : 7683، البتہ موطأ امام مالک (الصلاة في رمضان، باب ماجاء في قيام رمضان: 114/1) کی صحیح روایت کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں گیارہ رکعات پڑھانے کا حکم دیا تھا۔(صارم)

متوجہ رکھنا ہے۔ بسا اوقات قلیل میں کثیر کی نسبت زیادہ خیر ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کو ترتیل سے، یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا تیزی کے ساتھ پڑھنے سے افضل ہے۔ تلاوت قرآن مجید میں مناسب تیزی یہ ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حرف چھوٹنے نہ پائے۔ اگر تیزی کی وجہ سے قرآن مجید کے حروف چھوٹ گئے تو یہ ناجائز کام ہوگا، ایسا کرنے والے کو روکنا چاہیے کیونکہ یہ انداز حکم باری تعالیٰ کے خلاف ہے۔ قاری اس طرح قراءت کرے کہ سامعین مستفید اور محظوظ ہوں تو یہ انداز مناسب اور خوب ہے جو لوگ قرآن مجید کو سوچ سمجھ کر نہیں پڑھتے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی ہے، ارشاد باری ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ ﴾

''اور ان میں سے کچھ اَن پڑھ ہیں، وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور بس وہ صرف گمان کرتے ہیں۔''[1]

قرآن مجید کو نازل کرنے کا مقصد اس کے معانی کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ نہ کہ محض اس کی تلاوت کرنا۔

''بعض ائمۂ مساجد مسنون طریقے سے نماز تراویح ادا نہیں کرتے کیونکہ وہ قرآن مجید اس قدر تیزی سے پڑھتے ہیں کہ الفاظ قرآن کی ادائیگی صحیح نہیں ہوتی، نیز ان کے قیام، رکوع اور سجدہ میں اطمینان و سکون نہیں ہوتا، حالانکہ اطمینان اور ٹھہراؤ نماز کا ایک رکن ہے۔ مزید افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ رکعات بھی کم پڑھتے ہیں۔ یہ انداز عبادت کو کھیل تماشہ بنانے کے مترادف ہے۔[2] ان لوگوں کو چاہیے کہ اپنے اندر خوف الٰہی پیدا کریں، اپنی نمازوں کو صحیح اور درست کریں۔ اپنے آپ کو اور اپنے پیچھے کھڑے ہونے والوں کو نماز تراویح کی ادائیگی میں مسنون طریقے سے محروم نہ رکھیں۔[3]

---

[1] البقرۃ 2:78.

[2] بعض ائمہ کرام لاؤڈ سپیکر کے ذریعے سے مسجد سے باہر کے لوگوں کو اپنی قراءت سناتے ہیں جس سے اردگرد کی مساجد کے نمازیوں اور اہل محلہ کو تشویش ہوتی ہے جو قطعاً جائز نہیں۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے اور لوگ اس کے پاس نفل ادا کر رہے ہیں تو اس کے لیے مناسب نہیں کہ اونچی قراءت کر کے دوسروں کو پریشان کرے۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ اپنے اصحاب کے ہاں تشریف لائے جو مسجد میں قیام اللیل کر رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! تم میں سے ہر ایک اپنے رب سے سرگوشیاں کر رہا ہے، لہٰذا کوئی بلند آواز سے قراءت کر کے دوسرے کی نماز میں خلل نہ ڈالے۔'' (سنن أبي دواد، التطوع، باب رفع الصوت بالقراءة في صلاة الليل، حديث:1332، ومجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية:23/62,61 (مؤلف)

[3] بعض ائمہ مساجد نماز تراویح میں قرآن مجید کی قراءت بہت تیزی سے کرتے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ وہ آخری عشرہ کے شروع یا درمیان میں قرآن مجید مکمل کر لیتے ہیں۔ پھر مسجد چھوڑ کر عمرہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں، ◄◄

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ایسے اعمال کی توفیق دے جس میں ہماری اصلاح اور فلاح ہو۔

سنن مؤکدہ

سنن مؤکدہ کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کا ترک مکروہ ہے۔ بعض ائمہ کے نزدیک سنن مؤکدہ کا تارک نا قابل اعتبار ہے، یعنی شرعاً اس کی گواہی قابل قبول نہیں بلکہ گناہ گار ہے۔ کسی شخص کا سنن مؤکدہ کو دائمی ترک کرنا اس کی دینی کمزوری اور لاپرواہی کا مظہر ہے۔ سنن مؤکدہ دس رکعات ہیں جو درج ذیل ہیں:

- ظہر سے پہلے دو رکعتیں۔ اکثر علماء کے نزدیک ظہر سے پہلے چار رکعات سنن مؤکدہ ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں سنن مؤکدہ کی کل تعداد بارہ رکعات ہیں۔
- ظہر کے بعد دو رکعتیں
- مغرب کے بعد دو رکعتیں
- عشاء کے بعد دو رکعتیں
- طلوع فجر کے بعد اور نمازِ فجر سے پہلے دو رکعتیں

سنن مؤکدہ کی اس تفصیل کی دلیل سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

«حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَشْرَ رَكَعَاتٍ: رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ، وَكَانَتْ سَاعَةً لَّا يُدْخَلُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فِيهَا»

”میں نے رسول اللہ ﷺ کا دس رکعات کے بارے میں جو عمل یاد کیا وہ یوں ہے: ظہر سے پہلے دو رکعتیں

◄◄ اور اپنی جگہ پر کسی نااہل شخص کو امام بنا لیتے ہیں، یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہے اور امامت کی ذمہ داری سے غفلت اور کوتاہی ہے۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی ان پر واجب ہے جب کہ عمرہ مستحب ہے یہ لوگ فعل مستحب کی خاطر واجب کو کیونکر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان لوگوں کا مسجد میں رہنا اور اپنی ذمہ داری کو مکمل طور پر ادا کرنا عمرہ کرنے سے کہیں افضل ہے۔
بعض حضرات نماز تراویح میں قرآن مجید جلد مکمل کر کے ماہ رمضان کی باقی راتوں میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر مختصر سا قیام کرتے ہیں، حالانکہ یہ راتیں جہنم سے آزادی حاصل کرنے کی راتیں ہیں۔ یہ لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ تراویح اور تہجد کا مقصد محض قرآن مجید مکمل کرنا ہے نہ کہ حکم الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے قیام کرنا اور ان راتوں کے فضائل حاصل کرنا تو یہ ان کی لاعلمی ہے اور عبادت کو ایک مشغلہ اور کھیل بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان لوگوں کو راہ راست پر لائے۔ (مؤلف)

اور بعد میں دو رکعتیں، مغرب کے بعد گھر میں دو رکعتیں، عشاء کے بعد گھر میں دو رکعتیں اور نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں اور یہ ایسا وقت ہوتا تھا کہ آپ کے پاس کوئی نہیں آتا تھا۔[1]

«حَدَّثَتْنِي حَفْصَةُ أَنَّهُ كَانَ إِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ وَطَلَعَ الْفَجْرُ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ»

مجھے (ابن عمر رضی اللہ عنہما کو) سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے بتایا: ''جب فجر طلوع ہو جاتی اور مؤذن اذان دے دیتا تو آپ دو رکعتیں ادا کرتے۔''[2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«كَانَ يُصَلِّي فِي بَيْتِي قَبْلَ الظُّهْرِ أَرْبَعًا، ثُمَّ يَخْرُجُ فَيُصَلِّي بِالنَّاسِ ثُمَّ يَدْخُلُ فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ»

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعات پڑھتے، پھر لوگوں کو نماز پڑھانے کے لیے نکل جاتے۔ پھر میرے گھر واپس آتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔''[3]

اس روایت سے یہ استدلال بھی کیا جاتا ہے کہ ''سنت نماز'' مسجد کی نسبت گھر میں ادا کرنا افضل ہے۔ نیز اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ چند ایک یہ ہیں:

① گھر میں نماز ادا کرنے سے نیک عمل ریاکاری اور نمائش سے محفوظ رہتا ہے۔ اور لوگوں کی نظر سے مخفی رہتا ہے۔

② گھر میں نفل نماز ادا کرنے کے سبب خشوع وخضوع زیادہ ہوتا ہے۔

③ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے گھر کی آبادی ہوتی ہے جس کی وجہ سے گھر میں رحمت کا نزول ہوتا ہے اور شیطان دور ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«اِجْعَلُوا مِنْ صَلَاتِكُمْ فِي بُيُوتِكُمْ، وَلَا تَتَّخِذُوهَا قُبُورًا»

''تم اپنی نماز کا ایک حصہ گھروں میں ادا کرو، انھیں قبرستان (کی طرح) نہ بناؤ۔''[4]

سنن مؤکدہ میں سے فجر کی دو رکعتوں کی تاکید سب سے بڑھ کر ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى شَيْءٍ مِّنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ مِنْهُ تَعَاهُدًا عَلٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ»

① صحيح البخاري، التهجد، باب الركعتين قبل الظهر، حديث: 1180، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل السنن الراتبة قبل الفرائض......، حديث: 729. ② صحيح البخاري، التهجد، باب الركعتين قبل الظهر، حديث: 1181. ③ صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب جواز النافلة قائماً وقاعداً ......، حديث: 730. ④ صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة النافلة في بيته......، حديث: 777.

''نبی ﷺ فجر کی دو رکعتوں (نماز سنت) سے بڑھ کر اور کسی نفل کا خیال نہ رکھتے تھے۔''[1]

ایک اور روایت میں یوں ہے:

«رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا»

''فجر کی دو رکعتیں دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہیں۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ ان دو رکعتوں کی اور نماز وتر کی اس قدر محافظت فرماتے تھے کہ سفر ہو یا حضر انھیں چھوڑتے نہ تھے۔

▲ فجر کی دو رکعتیں اور نماز وتر کی ادائیگی کے علاوہ اور کسی نفل نماز کے سفر میں ادا کرنے کا اہتمام کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ ایک مرتبہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے لوگوں کو سفر میں ظہر کی سنتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''اگر مجھے سنتیں پڑھنا ہوتیں تو میں فرض نماز بھی پوری پڑھتا (قصر نہ کرتا)۔''[3]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سفر میں رسول اللہ ﷺ کا طریقہ فرض نماز میں قصر کرنا ہے، وتر اور فجر کی سنتوں کے علاوہ اور کسی نفل یا سنتوں کا اہتمام سے پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔''[4]

▲ فجر کی سنتوں میں مختصر قیام کرنا مسنون ہے۔ اس بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ فجر کی سنتوں میں مختصر قیام کرتے تھے۔ پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد ''سورۂ کافرون'' جب کہ دوسری رکعت میں ''سورۂ اخلاص'' کی قراءت کرتے تھے۔[5] اور کبھی پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ اور دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران کی آیت: ﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا﴾ پڑھتے تھے۔[6] اسی طرح مغرب کے بعد کی سنتوں میں ''سورۂ کافرون'' اور ''سورۂ اخلاص'' پڑھتے تھے۔[7] جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«مَا أُحْصِي مَا سَمِعْتُ مِنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ وَفِي

① صحيح البخاري، التهجد، باب تعاهد ركعتي الفجر ومن سماهما تطوعًا، حديث: 1169، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب ركعتي سنة الفجر ...... ، حديث: 724. ② صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب ركعتي سنة الفجر...... ، حديث: 725. ③ سنن أبي داود، صلاة السفر، باب التطوع في السفر، حديث: 1223. ④ زاد المعاد: 473/1. ⑤ صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب ركعتي سنة الفجر...... ،حديث: 726، وسنن النسائي، الافتتاح، باب القراءة في ركعتي الفجر......، حديث: 946. ⑥ صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب ركعتي سنة الفجر......، حديث: 727. ⑦ سنن النسائي، الافتتاح، باب القراءة في الركعتين بعد المغرب، حديث: 993، ومسند أحمد: 24/2.

الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْفَجْرِ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○﴾ وَ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○﴾»

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو مغرب کے بعد اور فجر سے پہلے کی سنتوں میں سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص پڑھتے ہوئے اتنی بار سنا کہ میں گنتی اور شمار میں نہیں لا سکتا۔''[1]

▲ سنن مؤکدہ میں سے جب کوئی نماز فوت ہو جائے تو اس کی قضا مسنون ہے۔ اسی طرح اگر رات کو وتر نہ پڑھے جا سکیں تو دن کے وقت ان کی قضا دی جائے کیونکہ ایک مرتبہ جب رسول اللہ ﷺ پر نیند کا غلبہ ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فجر کے ساتھ سنتوں کی قضا بھی دی تھی۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ کی ظہر کی سنتیں رہ گئی تھیں تو آپ ﷺ نے عصر کے بعد ان کی قضا دی، دیگر سنتوں کی قضا کی مشروعیت اس نص پر قیاس کر لو۔ علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ نَّامَ عَنِ الْوِتْرِ أَوْ نَسِيَهُ، فَلْيُصَلِّ إِذَا أَصْبَحَ أَوْ ذَكَرَهُ»

''جو شخص سو جانے یا بھول جانے کی وجہ سے وتر نہ پڑھ سکا تو وہ صبح کو پڑھ لے یا جب یاد آئے تب پڑھ لے۔''[2]

▲ اگر وتر کی قضا دے تو جفت رکعات پڑھے، چنانچہ سیدہ عائشہ ؓ سے مروی ہے:

«وَكَانَ إِذَا غَلَبَهُ نَوْمٌ أَوْ وَجَعٌ عَنْ قِيَامِ اللَّيْلِ صَلّٰى مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً»

''رسول اللہ ﷺ جب بھی نیند یا تکلیف کی بنا پر رات کا قیام نہ کر سکتے تو دن کے وقت بارہ رکعات ادا کر لیتے تھے۔''[3]

میرے بھائی! ان سنن مؤکدہ پر محافظت کیجیے کیونکہ اس میں نبی ﷺ کی اقتدا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ○﴾

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے۔''[4]

---

① جامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في الركعتين بعد المغرب والقراءة فيهما، حديث :431. ② جامع الترمذي، الوتر، باب ما جاء في الرجل ينام عن الوتر أو ينسى، حديث :465، وسنن أبي داود، الوتر، باب في الدعاء بعد الوتر، حديث :1431، و سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب من نام عن وتر أو نسيه، حديث: 1188 واللفظ له. ③ صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب جامع صلاة الليل ومن نام عنه أو مرض، حديث:746، وجامع الترمذي، الصلاة، باب إذا نام عن صلاته بالليل صلى بالنهار، حديث :445. ④ الأحزاب 33:21.

ان سنن کی محافظت سے فرض نمازوں میں پیدا ہونے والی کمی اور نقصان پورا ہو جاتا ہے جبکہ انسان سے کمی ونقصان کا احتمال عموماً رہتا ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کی اشد ضرورت ہے، لہٰذا اس میں کوتاہی نہ کیجیے۔ یہ چیز خیر وبرکت کی کثرت کا باعث ہے جو تم اپنے رب کے ہاں ضرور حاصل کرو گے۔ (ان شاء اللہ)

ہر فرض عبادت کے ساتھ نفل عبادت ہے، مثلاً: فرض نماز، فرض روزے اور فرض حج، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کی جنس کی نفل عبادت موجود ہے، تاکہ اس فرض عبادت میں پیدا ہونے والا نقصان پورا ہو جائے اور خلا پر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر خاص فضل وعنایت ہے کہ اس نے اطاعت وفرمانبرداری کے لیے مختلف انواع کی عبادات مقرر فرما دی ہیں تاکہ ان کے درجات بلند ہوں اور خطائیں معاف ہوں۔

ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور سب کے لیے ایسے اعمال کی توفیق مانگتے ہیں جو اسے محبوب اور پسند ہوں، بے شک وہی سننے والا قبول کرنے والا ہے۔

نماز چاشت

نماز چاشت سے متعلق کئی ایک روایات ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَوْصَانِي خَلِيلِي ﷺ بِثَلَاثٍ: صِيَامِ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ مِّنْ كُلِّ شَهْرٍ، وَرَكْعَتَيِ الضُّحٰی، وَأَنْ أُوتِرَ قَبْلَ أَنْ أَنَامَ»

"مجھے میرے خلیل رسول اللہ ﷺ نے تین باتوں کی نصیحت فرمائی: ہر ماہ تین روزے رکھنا، ضحیٰ، یعنی چاشت کی دو رکعتیں پڑھنا اور سونے سے پہلے وتر پڑھ لینا۔"[1]

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي الضُّحٰی حَتّٰی نَقُولَ: لَا يَدَعُ، وَيَدَعُهَا حَتّٰی نَقُولَ: لَا يُصَلِّي»

"نبی ﷺ چاشت کی نماز پڑھتے حتیٰ کہ ہم کہتے آپ ﷺ کبھی نہ چھوڑیں گے۔ اگر چھوڑ دیتے تو ہم کہتے اب آپ ﷺ کبھی نہ پڑھیں گے۔"[2]

---

① صحيح البخاري، الصوم، باب صيام البيض......، حديث: 1981، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة الضحى...... ، حديث: 721. ② [ضعيف] جامع الترمذي، الوتر، باب ماجاء في صلاة الضحى، حديث: 477، و مسند أحمد: 21/3.

▲ چاشت کی نماز کی کم از کم دو رکعات ہیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی درج بالا روایت میں بیان ہو چکا ہے۔سیدنا معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''جو شخص صبح کی نماز ادا کر کے اسی جگہ پر (جہاں اس نے فرض نماز ادا کی تھی) بیٹھا رہا اور کلمہ خیر و ذکر کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے چاشت کی دو رکعتیں ادا کیں تو اس کی تمام خطائیں معاف کر دی جائیں گی اگر چہ وہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں۔''[1]

▲ نماز چاشت کی زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات مسنون ہیں، چنانچہ سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال میرے گھر میں نماز چاشت کی آٹھ رکعات ادا کیں۔''[2] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کے وقت چار رکعات پڑھتے تھے اور کبھی زیادہ بھی پڑھ لیتے تھے۔[3]

▲ نماز چاشت کا وقت تب شروع ہوتا ہے جب سورج ایک نیزے کے برابر اونچا ہو جائے اور زوال آفتاب سے کچھ پہلے تک ہے۔ البتہ اس کا افضل وقت وہ ہے جب سورج کی تپش میں قدرے شدت آ جائے، چنانچہ ایک روایت میں ہے:

«صَلَاةُ الْأَوَّابِينَ حِينَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ»

''نماز ''اوابین'' (نماز ضحیٰ) کا مناسب وقت وہ ہے جب اونٹ کے بچے (ریت کی) گرمی محسوس کرنے لگیں۔''[4]

سجدۂ تلاوت

سجدۂ تلاوت مسنون ہے، اس سجدے کا سبب تلاوت قرآن ہے، اس لیے اسے ''سجدۂ تلاوت'' کہتے ہیں۔ یہ سجدہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص آیات کی تلاوت یا ان کی سماعت کے موقع پر بطور عبادت مقرر فرمایا ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبودیت، اس کے تقرب کا حصول اور اس کی عظمت کے سامنے خشوع وخضوع

[1] [ضعیف] سنن أبي داود، التطوع، باب صلاة الضحى، حديث : 1287. [2] صحيح البخاري، الصلاة، باب الصلاة في الثوب الواحد ملتحفًا به، حديث: 357، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة الضحى...... ، حديث : 336 بعد حديث: 719. [3] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة الضحى...... ، حديث : 719. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے ابن آدم! دن کے ابتدائی حصے میں میرے لیے چار رکعات پڑھ، اس کے آخر میں، میں تیرے لیے کفایت کروں گا۔'' مسند أحمد: 153/4، وسنن أبي داود، التطوع، باب صلاة الضحى، حديث :1289، وجامع الترمذي، الوتر، باب ماجاء في صلاة الضحى، حديث : 475 (صارم) [4] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الأوابين حين ترمض الفصال، حديث :748.

اور تذلل و عاجزی کا اظہار کرنا ہے۔

سجدۂ تلاوت قاری اور سامع دونوں کے لیے مسنون ہے اور اس کی مشروعیت پر علماء کا اتفاق ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ عَلَيْنَا السُّورَةَ فِيهَا السَّجْدَةُ فَيَسْجُدُ وَنَسْجُدُ حَتَّى مَا يَجِدُ أَحَدُنَا مَوْضِعَ جَبْهَتِهِ»

نبی ﷺ جب ہمیں کوئی ایسی سورت سناتے جس میں ''سجدہ'' ہوتا تو آپ ﷺ خود سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ سجدہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم میں سے بعض کو زمین پر پیشانی رکھنے کے لیے جگہ نہ ملتی تھی۔[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''قرآن مجید میں سجدہ کے جس قدر مقامات ہیں، ان میں سجدہ کرنے کا ذکر ہے یا حکم ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے عام یا خاص سجدہ کی خبر دی ہے وہاں قاری اور سامع دونوں کے لیے واجبی طور پر یا استحباباً سجدہ مقرر کیا گیا ہے تاکہ سجدہ کرنے والی مخلوق سے ان کی مشابہت ہو جائے۔ باقی رہیں اوامر والی آیات (جن آیات میں سجدہ کرنے کا حکم ہے) تو وہاں سجدہ کرنا بطریق اولیٰ ضروری ہے۔''[2]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا قَرَأَ ابْنُ آدَمَ السَّجْدَةَ فَسَجَدَ، اِعْتَزَلَ الشَّيْطَانُ يَبْكِي، يَقُولُ: يَاوَيْلَهُ! أُمِرَ ابْنُ آدَمَ بِالسُّجُودِ فَسَجَدَ فَلَهُ الْجَنَّةُ، وَأُمِرْتُ بِالسُّجُودِ فَأَبَيْتُ فَلِيَ النَّارُ»

''جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان الگ ہو کر روتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس! ابن آدم کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو وہ سجدے میں گر گیا، اس کے لیے جنت ہے۔ مجھے سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو میں نے انکار کر دیا، میرے لیے آگ ہے۔''[3]

سجدۂ تلاوت قاری اور سامع دونوں کے لیے مشروع ہے۔ واضح رہے سامع سے مراد وہ شخص ہے جو قصداً اور ارادۃً قرآن مجید کی تلاوت سنتا ہے، اس مجلس میں شریک ہے، چنانچہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت مذکورہ سے یہ بات وضاحت سے معلوم ہوتی ہے۔ باقی رہا وہ سامع جو قصداً تلاوت نہیں سن رہا بلکہ سجدہ والی آیت کے

[1] صحيح البخاري، سجود القرآن، باب من سجد لسجود القارئ، حديث : 1075، وصحيح مسلم، المساجد، باب سجود التلاوة، حديث : 575. [2] أعلام الموقعين: 2/370. [3] صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة، حديث :81، وسنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب سجود القرآن، حديث :1052.

الفاظ اس کے کان میں پڑ رہے ہیں اس کے لیے سجدۂ تلاوت کرنا لازم نہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو آیت سجدہ تلاوت کر رہا تھا تو امیر المومنین نے سجدہ نہ کیا اور فرمایا:

«إِنَّمَا السَّجْدَةُ عَلٰى مَنِ اسْتَمَعَهَا» ''سجدہ اس پر لازم ہے جو توجہ سے آیت سجدہ سنتا ہے۔''[1]

اس مضمون کی متعدد روایات دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

قرآن مجید میں سجدۂ تلاوت ذیل کی سورتوں میں ہے: "الأعْرَاف، الرَّعْد، النَّحل، بني إسراء يل، مَرْيم، الحَج، الفُرقَان، النَمل، السجدة، حٰمٓ السَّجده، النَجم، الإنْشِقَاق، العَلَق" اور سورۂ ص" کے سجدہ میں علماء کے مابین اختلاف ہے کہ یہ سجدہ شکر ہے یا سجدۂ تلاوت۔[2] (واللہ اعلم)

▲ تلاوت کا سجدہ کرتے وقت تکبیر کہی جائے کیونکہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقْرَأُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ، فَإِذَا مَرَّ بِالسَّجْدَةِ كَبَّرَ وَسَجَدَ وَسَجَدْنَا مَعَهُ»

''رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ جب آیت سجدہ آجاتی تو آپ ﷺ تکبیر کہتے اور سجدہ میں چلے جاتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ سجدہ کرتے۔''[3]

▲ سجدۂ تلاوت کرنے والا حالت سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الأَعلى کہے جیسا کہ نماز کے سجدے میں یہ تسبیح کہی جاتی ہے۔ البتہ درج ذیل دعا بھی درست ہے:

«سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ»

''میرے چہرے نے اس ذات کے لیے سجدہ کیا جس نے اپنی قوت وقدرت سے اس کو پیدا کیا، اس کی صورت بنائی اور اس کے کان و آنکھیں بنائیں۔''[4]

---

[1] صحيح البخاري، سجود القرآن، باب من رأى أن الله عزوجل لم يوجب السجود، قبل حديث:1077 معلقًا.

[2] رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ''سورۂ حج'' کو دوسری سورتوں پر فضیلت دی گئی کہ اس میں دو (2) سجدے ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' (جامع الترمذي، الجمعة، باب ماجاء في السجدة في الحج، حديث:578)، لہٰذا ثابت ہوا کہ سورۂ حج میں ایک نہیں دو (2) سجدے ہیں۔ (صارم)

[3] سنن أبي داود، سجود القرآن، باب في الرجل يسمع السجدة وهو راكب أو في غير صلاة، حديث: 1413. [4] سنن أبي داود، سجود القرآن، باب ما يقول إذا سجد؟ حديث: 1414، وجامع الترمذي، الجمعة، باب ما جاء ما يقول في سجود القرآن؟ حديث:580، ولفظه "وَصَوَّرَهُ" في الدعوات، باب منه دعاء: وجهت وجهي......، حديث:3421.

اس کے علاوہ یہ دعا بھی پڑھ سکتا ہے:

«اَللّٰهُمَّ! اكْتُبْ لِي بِهَا عِنْدَكَ أَجْرًا ، وَضَعْ عَنِّي بِهَا وِزْرًا ، وَاجْعَلْهَا لِي عِنْدَكَ ذُخْرًا ، وَتَقَبَّلْهَا مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ»

''اے اللہ! میرے لیے اپنے ہاں اس کے بدلے اجر وثواب لکھ لے اور اس کے ذریعے مجھ سے بوجھ دور فرما دے اور اس (سجدے) کو اپنے ہاں میرے لیے ذخیرہ بنا لے اور میرے اس (سجدے) کو قبول فرما لے جس طرح تو نے اپنے بندے داود کا سجدہ قبول کیا تھا۔''[1]

▲ کھڑے ہو کر سجدے میں جانا، بیٹھے بیٹھے سجدے میں جانے سے افضل ہے۔[2]

اے مسلمان! خیر و بھلائی کے بہت سے راستے ہیں، کوشش کر کے انھیں اختیار کیجیے اپنے قول وعمل میں اخلاص پیدا کیجیے تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں سعادت مند اور خوش نصیب لوگوں میں شامل فرمائے۔ آمین!

نوافل

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ فرض نماز کے علاوہ کون سی نماز افضل ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصَّلَاةُ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ» ''رات کی نماز۔''[3]

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ فِي اللَّيْلِ لَسَاعَةً لَّا يُوَافِقُهَا رَجُلٌ مُّسْلِمٌ يَّسْأَلُ اللهَ خَيْرًا مِّنْ أَمْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ ، وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ»

''رات میں ایک ایسا وقت ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسے اس حال میں حاصل کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی بھلائی طلب کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عطا فرماتا ہے۔ اور یہ ہر رات ہوتا ہے۔''[4]

[1] جامع الترمذي، الدعوات، باب ما يقول في سجود القرآن؟ حديث :3424.

[2] اس کے بارے میں فاضل مصنف نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

[3] مسند أحمد :303/2، وسنن أبي داود، الصيام، باب في صوم المحرم، حديث :2429، وسنن النسائي، قيام الليل، باب فضل صلاة الليل، حديث: 1615,1614. [4] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب في الليل ساعة مستجاب فيها الدعاء، حديث :757.

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

«عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَإِنَّهُ دَأْبُ الصَّالِحِينَ قَبْلَكُمْ، وَهُوَ قُرْبَةٌ لَّكُمْ إِلٰى رَبِّكُمْ وَمُكَفِّرٌ لِّلسَّيِّئَاتِ وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْإِثْمِ»

''رات کے وقت قیام کرو، تم سے پہلے نیک لوگوں کی یہی عادت تھی۔ یہ تمھارے لیے اپنے رب کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، برائیوں کا کفارہ ہے اور گناہوں کے لیے رکاوٹ ہے۔''[1]

▲ رات کو قیام کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے مدح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِينَ ۞ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۞ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۞﴾

''وہ تو اس سے پہلے ہی نیکوکار تھے۔ وہ رات کو بہت کم سویا کرتے تھے۔ اور وقت سحر استغفار کیا کرتے تھے۔''[2]

اور فرمایا:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۞ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۞﴾

''ان کی کروٹیں اپنے بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے وہ خرچ کرتے ہیں۔ کوئی نفس نہیں جانتا جو کچھ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے پوشیدہ رکھی گئی ہے جو کچھ وہ کرتے تھے یہ اس کا بدلہ ہے۔''[3]

رات کے قیام سے متعلق قرآن و حدیث میں بہت تاکید ہے کیونکہ نوافل میں سب سے زیادہ فضیلت رات کے قیام کی ہے۔ رات کے قیام کی فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں حد درجہ کا اخفا اور اخلاص ہے، نیز یہ لوگوں کی غفلت کا وقت ہے اس میں قیام کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو نیند اور آرام پر ترجیح دینا ہے۔

▲ منع کردہ اوقات کے سوا نفلی نماز کے لیے تمام اوقات مستحب ہیں۔ جبکہ مذکورہ دلائل کی روشنی میں رات کی نماز، دن کی نماز سے افضل ہے۔ اور رات کی نماز میں سے افضل نماز وہ ہے جو نصف رات کے بعد آخری تہائی حصے میں پڑھی جائے کیونکہ صحیح بخاری میں مرفوعاً روایت ہے:

[1] المستدرك للحاكم: 308/1، حديث: 1156. [2] الذّٰريٰت 51:16-18. [3] السجدة 32:16,17.

«أَحَبُّ الصَّلَاةِ إِلَى اللهِ صَلَاةُ دَاوُدَ . . . وَكَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ، وَيَقُومُ ثُلُثَهُ، وَيَنَامُ سُدُسَهُ»

''اللہ کے نزدیک (رات کی) پسندیدہ نماز، داود علیہ السلام کی نماز ہے۔ وہ نصف رات تک سوئے رہتے، پھر تہائی رات قیام کرتے اور باقی چھٹا حصہ سو جاتے تھے۔''[1]

(اللہ کے نبی داود علیہ السلام) رات کے ابتدائی حصہ میں سو کر آرام فرماتے تھے، پھر قیام کے لیے اس وقت اٹھتے جب اللہ تعالیٰ منادی دیتا اور اعلان کرتا ہے: ''کیا کوئی سائل ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اسے وہ چیز دوں؟''[2] پھر آپ بقیہ رات کے آخری حصہ میں آرام کی خاطر سو جاتے تاکہ فجر کی نماز ہشاش بشاش طبیعت کے ساتھ ادا کر سکیں۔ یہ قیام اللیل کی افضل صورت ہے، وگرنہ رات کے کسی بھی حصے میں قیام ہو سکتا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے: ''رات کے قیام کا وقت نماز مغرب سے لے کر طلوع فجر تک ہے۔ اس قول کی روشنی میں مغرب اور عشاء کے درمیان کے نفل رات ہی کے قیام میں شمار ہوں گے۔ البتہ رات کے آخری نصف حصے میں قیام کرنا سب سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا﴾

''بے شک رات کا اٹھنا دل جمعی کے لیے انتہائی مناسب ہے اور بات کو بہت درست کر دیتا ہے۔''[3]

آیت مذکورہ میں کلمہ ﴿نَاشِئَةَ﴾ کا مطلب سونے کے بعد اٹھنا ہے۔ اور تہجد بھی سو کر اٹھنے کے بعد ہی ادا ہوتی ہے''۔[4]

مسلمان کے لائق اور زیبا ہے کہ وہ رات کو قیام کرے، اس پر مداومت کرے اگرچہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ قیام اللیل کا مسنون طریقہ یہ ہے: ① قیام اللیل کی نیت کرے (واضح رہے کہ نیت دل سے ہوتی ہے زبان سے نہیں۔)

② جب بیدار ہو تو مسواک کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور یہ کلمات کہے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ، لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَسُبْحَانَ اللهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَاللهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ»

① صحيح البخاري، التهجد، باب من نام عندالسحر، حديث : 1131. ② صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في الدعاء والذكر في آخر الليل......، حديث : 758، ومسند أحمد :388/1. ③ المزّمّل 73:6. ④ حاشية الروض المربع شرح زاد المستقنع : 221/2، بتغيير يسير.

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود (حقیقی) نہیں وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا ملک ہے، اسی کی تعریف ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ تعریف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ اللہ پاک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود (حقیقی) نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ گناہ سے بچنے اور نیکی کرنے کی طاقت صرف اللہ تعالیٰ (کی توفیق) سے ہے۔''[1]

اور کہے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ»

''اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور اس کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔''[2]

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي عَافَانِي فِي جَسَدِي، وَرَدَّ عَلَيَّ رُوحِي، وَأَذِنَ لِي بِذِكْرِهِ»

اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے جسمانی عافیت دی اور میری روح لوٹا دی اور اپنے ذکر کی توفیق دی۔''[3]

③ مستحب یہ ہے کہ نماز تہجد کی ابتدا ہلکی پھلکی دو رکعتوں سے کرے کیونکہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ مِّنَ اللَّيْلِ فَلْيَفْتَتِحْ صَلَاتَهُ بِرَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ»

''جب کوئی شخص رات کو (قیام کے لیے) اٹھے تو اپنی نماز ہلکی پھلکی دو رکعتوں سے شروع کرے۔''[4]

④ ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: [صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى] ''رات کی نماز دو، دو رکعتیں ہیں۔''[5]

⑤ قیام، رکوع اور سجدے کو لمبا کرنا نہایت مناسب ہے۔

⑥ نماز تہجد گھر میں ادا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے۔ خود نبی ﷺ رات کا قیام گھر ہی میں کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«فَعَلَيْكُمْ بِالصَّلَاةِ فِي بُيُوتِكُمْ فَإِنَّ خَيْرَ صَلَاةِ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا الصَّلَاةَ

① صحيح البخاري، التهجد، باب فضل من تعار من الليل فصلّى، حديث: 1154. ② صحيح البخاري، الدعوات، باب ما يقول إذا نام؟ حديث: 6312، وباب وضع اليد تحت الخد اليمنىٰ، حديث: 6314، وصحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب الدعاء عندالنوم، حديث: 2711. ③ جامع الترمذي، الدعوات، باب منه دعاء: باسمك ربي وضعت جنبي......، حديث: 3401. ④ صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة النبي ﷺ ودعائه بالليل، حديث: 768. ⑤ صحيح البخاري، الوتر، باب ماجاء في الوتر، حديث: 990.

الْمَكْتُوبَةَ»

''لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو، بے شک آدمی کی بہترین نماز وہ ہے جو گھر میں ادا ہو، سوائے فرض نماز کے (وہ مسجد میں افضل ہے۔)''[1]

علاوہ ازیں گھر میں قیام کرنا اخلاص کے قریب تر ہے۔

⑦ کھڑے ہو کر نفل نماز ادا کرنا بلا عذر بیٹھ کر نماز ادا کرنے سے افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ صَلّٰى قَائِمًا فَهُوَ أَفْضَلُ ، وَمَنْ صَلّٰى قَاعِدًا فَلَهُ نِصْفُ أَجْرِ الْقَائِمِ»

''کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا افضل ہے۔ جس نے (بلا عذر) بیٹھ کر نماز ادا کی اس کے لیے کھڑے ہو کر قیام کرنے والے کی نسبت نصف اجر ہے۔''[2]

جس نے کسی شرعی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نفل نماز ادا کی اسے کھڑا ہو کر قیام کرنے والے کے برابر ہی اجر ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ أَوْ سَافَرَ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ مَا كَانَ يَعْمَلُ مُقِيمًا صَحِيحًا»

''جب کوئی بندہ بیمار ہو یا سفر پر ہو تو اس کا ہر وہ عمل (اللہ کے ہاں) لکھا جائے گا جو حالت صحت میں یا مقیم ہو کر کیا کرتا تھا۔''[3]

علاوہ ازیں کھڑے ہونے کی استطاعت کے باوجود بیٹھ کر نفل نماز ادا کرنے کے جواز میں علماء کا اتفاق ہے۔

- رات کا قیام نماز وتر پر ختم کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ رات کے قیام میں سب سے آخر میں وتر ادا کرتے تھے۔[4] نیز متعدد روایات میں رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم بھی ہے۔[5]
- جو شخص رات کو (کسی وجہ سے) تہجد کی نماز ادا نہ کر سکا تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ ظہر سے پہلے پہلے اس کی قضا دے دے کیونکہ حدیث میں ہے:

«مَنْ نَّامَ عَنْ حِزْبِهِ أَوْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ ، فَقَرَأَهُ فِيمَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الظُّهْرِ

---

① صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة النافلة في بيته...... ، حديث :781. ② صحيح البخاري، التقصير، باب صلاة القاعد بالإيماء، حديث : 1116. ③ صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب يكتب للمسافر مثل ما كان يعمل في الإقامة، حديث :2996. ④ صحيح البخاري، الوتر، باب ساعات الوتر، حديث :996، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل......، حديث :749. ⑤ صحيح البخاري، الوتر، باب ليجعل آخر صلاته وتراً، حديث :998، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الليل......، حديث :751.

كُتِبَ لَهُ كَأَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ اللَّيْلِ»

''جو شخص رات کی نماز یا کوئی وظیفہ ادا نہ کر سکا اور اس نے نماز فجر اور نماز ظہر کے درمیان ادا کر دیا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا یہ عمل ایسے لکھا جائے گا جیسے اس نے رات ہی کو ادا کیا ہے۔''①

اے مسلمان! خود کو رات کے قیام سے محروم نہ رکھ، اس پر ہمیشگی کر، اگرچہ کم مقدار ہی میں کیوں نہ ہو تاکہ تجھے سحری کے وقت قیام کرنے والوں اور استغفار کرنے والوں کا اجر عظیم حاصل ہو۔ بسا اوقات قلیل عمل کثیر کا باعث بن جاتا ہے۔ یاد رکھ! اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

نماز کے ممنوعہ اوقات

پچھلے صفحات پر ہم نے نفل نماز کا تذکرہ کیا تھا۔ اب ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کچھ اوقات ایسے بھی ہیں جن میں نفل نماز ادا کرنا منع ہے۔ سوائے اس نماز کے جسے شریعت نے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ممنوعہ اوقات پانچ ہیں:

پہلا وقت: صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«فَإِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الرَّكْعَتَيْنِ»

''جب صبح صادق طلوع ہو جائے تو (فجر کی) دو رکعتوں کے علاوہ کوئی نماز نہیں۔''②

اس روایت سے واضح ہوا کہ صبح صادق طلوع ہو جانے کے بعد نماز فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کوئی اور نفلی نماز ادا نہ کی جائے۔

دوسرا وقت: سورج طلوع ہونے سے لے کر ایک نیزے کے برابر بلند ہونے تک۔ جب آفتاب طلوع ہو رہا ہو اور اس کا کچھ حصہ اندر اور کچھ حصہ باہر ہو تو اس وقت بھی کوئی نماز نہ پڑھی جائے جب تک سورج ایک نیزے کے برابر بلند نہ ہو جائے۔

تیسرا وقت: جب سورج سیدھا سر پر ہو، یعنی اس کا زوال ہو رہا ہو تو اس وقت نماز ادا کرنا منع ہے حتیٰ کہ اس کا زوال مکمل ہو جائے۔ اس کا علم تب ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ رک جائے اور اس میں کمی بیشی نہ ہو۔ جب سورج مغرب کی جانب جھک جائے تب نماز ادا کرنا درست ہے۔ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

① صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب جامع صلاة الليل......، حديث: 747. ② مسند أحمد: 4/385و6/49.

«ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنْهَانَا أَنْ نُّصَلِّيَ فِيهِنَّ أَوْ أَنْ نَّقْبُرَ فِيهِنَّ مَوْتَانَا : حِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حَتَّى تَرْتَفِعَ ، وَحِينَ يَقُومُ قَائِمُ الظَّهِيرَةِ حَتَّى تَمِيلَ الشَّمْسُ ، وَحِينَ تَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوبِ حَتَّى تَغْرُبَ»

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تین اوقات میں نماز ادا کرنے اور مردوں کو دفن کرنے سے منع کیا، جب سورج طلوع ہو رہا ہو حتیٰ کہ بلند ہو جائے۔ جب سورج سر پر ہو حتیٰ کہ ڈھل جائے اور جب غروب ہو رہا ہو حتیٰ کہ مکمل غروب ہو جائے۔''[1]

چوتھا وقت نماز عصر سے لے کر غروب آفتاب تک۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغِيبَ الشَّمْسُ»

''نماز فجر کے بعد کوئی نماز نہیں حتی کہ آفتاب بلند ہو جائے اور نماز عصر کے بعد کوئی نماز نہیں حتیٰ کہ آفتاب غروب ہو جائے۔''[2]

[1] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها، حديث :831. [2] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب لا تتحرى الصلاة قبل غروب الشمس، حديث :586، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها، حديث: 827.

نماز عصر کے بعد کوئی نماز ادا کرنا سلف صالحین کے ہاں مختلف فیہ امر رہا ہے۔ عصر کے بعد نماز پڑھنے کی صورتیں درج ذیل ہیں: ❶ فوت شدہ فرائض کی قضا ادا کرنا۔ ❷ سنن مؤکدہ کی قضا ادا کرنا، مستقل دو رکعت نماز، نماز جنازہ اور سببی نماز ادا کرنا۔ ❸ مطلق نوافل ادا کرنا۔

پہلی صورت میں نماز ادا کرنا بالاتفاق جائز ہے۔ دوسری صورت میں تین چیزیں ہیں: ❶ فی نفسہ سنن مؤکدہ کی قضا ادا کرنا مختلف فیہ ہے، اس لیے کہ ان کی فضیلت ان کے اوقات ہی میں ادا کرنے پر موقوف ہے، مثلاً: ظہر سے پہلے چار رکعتوں کی فضیلت وغیرہ۔ یہ فضیلت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب انھیں ان کے وقت پر ادا کیا جائے۔ اگر کوئی شخص ان پر مواظبت و مداومت کرتا ہے اور کبھی کسی وجہ سے اس کی یہ سنتیں رہ جاتی ہیں تو بعد میں ادا کرنا جائز ہے۔ ❷ اور عصر کے بعد دو رکعتیں مستقل ادا کرنا اور ان پر مواظبت کرنا رسول اللہ ﷺ ہی کا خاصا ہے۔ (عون المعبود: 4/107) ❸ نماز جنازہ اور سببی نمازوں کے بارے میں اختلاف ہے لیکن زیادہ قابل ترجیح بات یہی ہے کہ یہ نمازیں ادا کرنا جائز ہیں۔

تیسری صورت مطلق نوافل کی ہے اور یہی صورت بالعموم مختلف فیہ ہے۔ ذیل میں ان احادیث کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس کے جواز یا عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

مطلق نہی کی روایات جن میں عصر کے بعد نماز پڑھنا مطلقاً ممنوع ہے، چاہے وہ نفلی، فرض یا سببی نماز ہو، جیسا کہ ◄◄

پانچواں وقت: جب سورج غروب ہونا شروع ہو جائے حتیٰ کہ غروب ہو جائے۔* جان لیجیے! ان اوقات میں فوت شدہ فرض نماز ادا ہو سکتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے درج ذیل فرمان میں عموم ہے کہ:

«مَنْ نَّسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا ، فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُّصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»

''جو شخص نماز بھول گیا یا سو گیا تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ جب یاد آئے تب پڑھ لے۔''[1]

[1] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب من نسي صلاة فليصل إذا ذكر ولا يعيد إلا تلك الصلاة، حديث : 597، وصحيح مسلم، المساجد، باب قضاء الصلاة الفائتة واستحباب تعجيل قضائها، حديث : 684 واللفظ له.

* رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [لَا صَلَاةَ بَعْدَ صَلَاةِ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ] ''عصر کے بعد سورج غروب ہونے تک کوئی نماز نہیں ہے۔'' (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها، حديث : 827. اسی طرح یہ روایت باقی کتب حدیث میں بھی موجود ہے)۔

اس موضوع پر اگر صرف یہی روایت ہوتی تو بجائے فیصلہ کن تھی لیکن جب اس حدیث کے باقی طرق یا اس موضوع کی دوسری روایات کو دیکھا جائے تو مسئلے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

یہ حدیث عام ہے اور بہت سی صورتوں میں اس کی تخصیص کی گئی ہے، مثلاً: فوت شدہ فرائض کی قضا ادا کرنا، جنازہ اور سببی نمازیں ادا کرنا وغیرہ، انھیں پڑھنے کے دلائل طویل ہیں اور بخوفِ طوالت قلم انداز کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح عصر کے بعد نوافل کے لیے بھی یہ نہی مطلق نہیں ہے بلکہ بعض دلائل اسے مقید کرتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عصر کے بعد سورج غروب ہونے کے قریب نماز پڑھنا ممنوع ہے مطلقاً منع نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: [أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْعَصْرِ إِلَّا وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ] ''بے شک نبی ﷺ عصر کے بعد نماز سے روکتے تھے الا یہ کہ سورج ابھی بلند ہو۔'' (سنن أبي داود، التطوع، باب من رخص فيهما إذا كانت الشمس مرتفعة، حديث : 1274.)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت کا تعلق غروبِ آفتاب کے قریب نماز پڑھنے سے ہے، اس سے قبل جائز ہے۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [لَا يَتَحَرّٰى أَحَدُكُمْ فَيُصَلِّي عِنْدَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَلَا عِنْدَ غُرُوبِهَا] ''کوئی شخص طلوع شمس اور اس کے غروب کے وقت نماز پڑھنے کی کوشش نہ کرے۔'' (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهى...... حديث: 828.) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ منع کا حکم غروب آفتاب کے قریب نماز پڑھنے کے ساتھ مقید ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [وإِذَا غَابَ حَاجِبُ الشَّمْسِ، فَأَخِّرُوا الصَّلَاةَ حَتّٰى تَغِيبَ] ''جب سورج کا کنارہ غائب ہو جائے تو پھر نماز کو غروب آفتاب تک مؤخر کر دو۔'' (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها، حديث :829.)

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: [وَحِينَ تَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوبِ حَتّٰى تَغْرُبَ] ''اور جب سورج غروب کے لیے جھک جائے تو غروب ہونے تک (نماز نہ پڑھو)۔ (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها، حديث :831.)

اسی طرح سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، جسے شیخ البانی رحمہ اللہ نے سلسلۂ احادیث صحیحہ، رقم:200 میں ابن حزم رحمہ اللہ کے حوالے

اسی طرح طواف کی دو رکعتیں بھی مذکورہ ممنوعہ اوقات میں ادا کرنا جائز ہیں کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تَمْنَعُوا أَحَدًا طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ وَصَلّٰى أَيَّةَ سَاعَةٍ شَاءَ مِنْ لَّيْلٍ أَوْ نَهَارٍ»

''جو شخص کسی بھی وقت بیت اللہ کا طواف کرنا چاہے اور نماز ادا کرنا چاہے، اسے مت روکو۔''[1]

جس طرح طواف کرنا ہر وقت جائز ہے اسی طرح طواف کی دو رکعتیں بھی ہر وقت جائز ہیں۔

◄ علمائے کرام کے صحیح تر قول کے مطابق اسباب والی نمازوں کو بھی ممنوعہ اوقات میں ادا کرنا جائز ہے، مثلاً: نماز جنازہ، تحیۃ المسجد اور نماز کسوف، بہت سے دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں۔ نیز اوقات ممنوعہ میں نماز کی نہی میں جو عموم ہے یہ دلائل اس کے لیے مخصص ہیں، لہٰذا نہی کا اطلاق ان نفلی نمازوں پر ہوگا جن کا کوئی سبب نہیں۔ الغرض جس نماز کا کوئی سبب نہیں اسے ان مکروہ اوقات میں شروع نہ کیا جائے۔

فجر کی سنتوں کی قضا نماز فجر کے بعد جائز ہے۔ اسی طرح ظہر کی سنتوں کی قضا نماز عصر کے بعد جائز ہے۔ بالخصوص جب ظہر اور عصر کو جمع کر لیا گیا ہو۔ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی سنتوں کی قضا عصر کے بعد دی تھی۔[2]

نماز باجماعت کی فرضیت اور فضیلت

اسلام میں مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کی بہت اہمیت ہے۔ تمام مسلمانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مساجد میں باجماعت پانچوں نمازیں ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی عبادات وقربات میں سب سے زیادہ عظیم اور مؤکد امر ہے بلکہ شعائر اسلام میں اس کی سب سے بڑی اور نمایاں حیثیت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے ایک جگہ میں جمع ہونے کے لیے مختلف اوقات وایام مقرر فرمائے ہیں، ان میں

[1] جامع الترمذي، الحج، باب ماجاء في الصلاة بعد العصر وبعد الصبح لمن يطوف، حديث: 868. [2] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، باب ما يصلى بعد العصر من الفوائت ونحوها، حديث: 590-593، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب معرفة الركعتين......، حديث: 834.

◄◄ سے نقل کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح کہا ہے، وہ فرماتے ہیں: [لَمْ يَنْهَ عَنِ الصَّلَاةِ إِلَّا عِنْدَ غُرُوبِ الشَّمْسِ] ''آپ ﷺ نے غروب آفتاب کے قریب ہی نماز پڑھنے سے روکا تھا۔'' اسی طرح کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی عصر کے بعد نوافل پڑھنا ثابت ہیں جس کی تفصیل ذیل میں دیے گئے مراجع سے دیکھی جا سکتی ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شرح مسلم للنووي: 160/6، وعون المعبود: 4/106-109، وسلسلة الأحاديث الصحيحة: 387/1، حديث: 220، والمحلى لابن حزم: 3/23-31. هذا ما عندنا والله أعلم بالصواب. (عثمان منیب)

سے بعض وہ اجتماع ہیں جو روزانہ ہوتے ہیں جیسا کہ مسلمان مساجد میں نمازوں کی ادائیگی کے لیے دن رات میں پانچ دفعہ رب کے حضور جمع ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں سے ہفتہ وار جمعہ کا اجتماع بھی ہے جو پانچ نمازوں کے اجتماع سے زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دو اجتماع سالانہ ہوتے ہیں جو عیدین کے اجتماع ہیں جو جمعہ کے اجتماع سے کہیں زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ یہ اجتماعات ہر شہر میں ایک مقام پر منعقد ہوتے ہیں۔ ایک اجتماع ایسا بھی ہے جو سال میں ایک مرتبہ منعقد ہوتا ہے وہ وقوف عرفہ کا اجتماع ہے یہ تعداد میں عیدین کے اجتماع سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ مسلمانوں کا عظیم اسلامی اور عالمی اجتماع ہوتا ہے۔

ان عظیم اسلامی اجتماعات کے انعقاد میں مسلمانوں کی بہت سی مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔ ان کے ذریعے سے مسلمانوں کے درمیان احسان، محبت اور باہمی ہمدردی کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے رابطہ قائم رہتا ہے۔ ایک دوسرے کے دل میں پیار اور یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت رہتی ہے۔ مریض کی بیمار پرسی ممکن ہو جاتی ہے۔ فوت شدہ کی خبر مل جاتی ہے۔ مصیبت زدہ کی فریاد رسی ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ باہمی تعارف اور گہرا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ان عظیم اجتماعات سے کفار اور منافقین دشمنوں پر مسلمانوں کا رعب طاری ہوتا ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے شیطان لوگ مسلمانوں کے لیے عداوت و دشمنی اور کینہ وبغض کا جو جال بنتے ہیں اجتماعی قوت سے اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ نیکی وتقویٰ کی بنیاد پر اتفاق واتحاد پیدا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَخْتَلِفُوا ، فَتَخْتَلِفَ قُلُوبُكُمْ»

''نماز میں ایک دوسرے سے ہٹ کر (یا آگے پیچھے ہوکر) کھڑے نہ ہوا کرو، ورنہ تمھارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔''[1]

نماز باجماعت کے فوائد میں سے ناواقف کو تعلیم دینا اور اس کے ثواب میں اضافہ کرنا ہے، نیز جب کوئی مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو مسجد میں اعمال صالحہ کرتا دیکھے گا تو اس میں مسابقت کا جذبہ بیدار ہوگا۔ عمل صالح میں تیز اور اس پر متوجہ ہوگا، یا ان کی پیروی کر کے اپنی کمی کو دور کر سکے گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلَاةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِينَ دَرَجَةً - وَفِي رِوَايَةٍ : بِخَمْسٍ وَّعِشْرِينَ دَرَجَةً»

[1] صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها......، حديث :432، و سنن أبي داود، الصلاة، باب تسوية الصفوف، حديث :664.

''باجماعت نماز منفرد کی نماز سے ستائیس درجے فضیلت رکھتی ہے۔''[1] ایک روایت میں ''پچیس درجے'' ہے۔''[2]

سفر ہو یا حضر، حالت امن ہو یا خوف باجماعت نماز ادا کرنا مردوں پر واجب ہے۔ کتاب وسنت میں اس کے دلائل موجود ہیں۔ علاوہ ازیں نسل درنسل مسلمانوں کا اس پر عمل ہے۔ اسی وجہ سے مساجد کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان میں مؤذن اور امام مقرر کیے جاتے ہیں۔ مساجد میں حاضر ہونے کے لیے بلند آواز سے اذان میں حَيَّ عَلَى الصَّلاةِ ''نماز کی طرف آؤ۔'' اور حَيَّ عَلَى الْفَلاحِ ''کامیابی کی طرف آؤ۔'' کہا جاتا ہے۔ حالت خوف میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے:

﴿وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَن تَضَعُوٓا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا﴾

''جب تم ان میں ہو اور ان کے لیے نماز کھڑی کرو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمھارے ساتھ اپنے ہتھیار لیے کھڑی ہو، پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو یہ ہٹ کر تمھارے پیچھے آ جائیں اور وہ دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آ جائے اور تمھارے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لیے رہیں۔ کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے بے خبر ہو جاؤ تو وہ تم پر اچانک دھاوا بول دیں۔ ہاں، اپنے ہتھیار اتار رکھنے میں اس وقت تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تمھیں تکلیف ہو یا بوجہ بارش کے یا بسبب بیمار ہو جانے کے اور اپنے بچاؤ کی چیزیں ساتھ لیے رہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے منکروں کے لیے ذلت کی مار تیار کر رکھی ہے۔''[3]

یہ آیت کریمہ وضاحت کرتی ہے کہ باجماعت نماز کی نہایت تاکید ہے یہاں تک کہ حالت خوف میں بھی

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، حديث :645، وصحيح مسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة وبيان التشديد في التخلف عنها...... ، حديث: 650. [2] صحيح البخاري، الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، حديث:646، وصحيح مسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة وبيان التشديد في التخلف عنها ......، حديث :649. [3] النسآء4:102.

ترک جماعت کی رخصت نہیں ہے۔ اگر نماز باجماعت واجب نہ ہوتی تو خوف کے عذر کے وقت بطریق اولیٰ ساقط ہو جاتی، حالانکہ نماز خوف میں بہت سے واجبات ترک کر دیے جاتے ہیں۔ اور نماز باجماعت کی خاطر ہی بہت سے احکام معاف کر دیے گئے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أَثْقَلَ صَلَاةٍ عَلَى الْمُنَافِقِينَ صَلَاةُ الْعِشَاءِ وَصَلَاةُ الْفَجْرِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِيهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا، وَلَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِالصَّلَاةِ فَتُقَامَ، ثُمَّ آمُرَ رَجُلاً فَيُصَلِّيَ بِالنَّاسِ، ثُمَّ أَنْطَلِقَ مَعِيَ بِرِجَالٍ مَّعَهُمْ حُزَمٌ مِّنْ حَطَبٍ إِلٰى قَوْمٍ لَّا يَشْهَدُونَ الصَّلَاةَ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ بِالنَّارِ»

''یقیناً منافقین پر عشاء اور فجر کی نمازیں بہت بھاری ہیں۔ اگر انھیں ان کا اجر معلوم ہو جائے تو اگر انھیں چوتڑوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑے تب بھی ضرور آ جائیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ نماز کی اقامت کا حکم دوں، پھر ایک شخص کو کہوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے اور میں خود ایسے آدمیوں کو لے کر چلوں جن کے پاس ایندھن کے گٹھے ہوں اور جو افراد جماعت میں شریک نہ ہوں ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔''[1]

اس حدیث سے نماز باجماعت کا وجوب دو طرح ثابت ہوتا ہے۔ **اولاً**: باجماعت نماز سے پیچھے رہنے والوں کو منافقین میں شمار کیا گیا ہے۔ سنت سے پیچھے رہنے والا منافق شمار نہیں ہوتا، لہٰذا معلوم ہوا کہ نماز باجماعت کا تارک ''واجب'' کا تارک ہے۔ **ثانیاً**: باجماعت نماز سے پیچھے رہ جانے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سزا دینے کا ارادہ کیا تھا اور سزا ترک واجب ہی پر ہوتی ہے۔ البتہ اس سزا کو اس لیے نافذ نہیں کیا گیا کہ گھروں میں عورتیں اور بچے موجود ہوتے ہیں جن پر جماعت میں شریک ہونا واجب نہیں۔ صحیح مسلم میں ہے:

«أَتَى النَّبِيَّ ﷺ رَجُلٌ أَعْمٰى فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّهُ لَيْسَ لِي قَائِدٌ يَقُودُنِي إِلَى الْمَسْجِدِ، فَسَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَنْ يُّرَخِّصَ لَهُ فَيُصَلِّي فِي بَيْتِهِ، فَرَخَّصَ لَهُ، فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ فَقَالَ: هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلَاةِ؟ فَقَالَ: نَعَمْ! قَالَ: فَأَجِبْ»

''ایک نابینا شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے مسجد کی طرف لانے والا کوئی نہیں، لہٰذا گھر میں نماز ادا کرنے کی رخصت عنایت فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رخصت دے دی۔ جب وہ واپس پلٹا تو اسے دوبارہ بلوایا اور فرمایا: ''کیا تم اذان سنتے ہو؟'' اس نے کہا: ہاں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب فضل صلاة العشاء في الجماعة، حديث: 657، و صحيح مسلم، المساجد، باب فضل صلاة الجماعة وبيان التشديد في التخلف عنها ......، حديث: 651 واللفظ له.

نے فرمایا: ''تم مسجد میں ضرور آؤ۔''[1]

اس روایت میں آپ ﷺ نے نابینا شخص کو اذان پر لبیک کہنے اور نماز باجماعت میں شریک ہونے کا حکم دیا ہے، حالانکہ اس کے لیے اس میں مشقت اور تکلیف تھی۔ یہ حدیث بھی نماز باجماعت کے وجوب پر دلیل ہے۔

▲ باجماعت نماز کا وجوب اہل ایمان کے ہاں دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آج تک مسلم چلا آرہا ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''ہم نے دیکھا جماعت سے وہی پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق واضح اور نمایاں تھا، جبکہ مومن شخص کو دو آدمیوں کا سہارا دے کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔''[2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ نماز باجماعت کا وجوب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل و دماغ میں راسخ تھا اور یہ بات انھیں رسول اللہ ﷺ ہی سے معلوم ہوئی تھی۔ یہ امر واضح ہے کہ جس عمل کے بارے میں کہا جائے کہ ''اس سے صرف منافق ہی پیچھے رہتا ہے۔'' وہ ہر شخص پر واجب ہوتا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے:

«اَلْجَفَاءُ كُلُّ الْجَفَاءِ، وَالْكُفْرُ وَالنِّفَاقُ مَنْ سَمِعَ مُنَادِيَ اللهِ يُنَادِي بِالصَّلَاةِ يَدْعُو إِلَى الْفَلَاحِ وَلَا يُجِيبُهُ»

''یہ حد درجہ کا ظلم، کفر اور نفاق ہے کہ کوئی شخص مؤذن کی اذان سنے جو کہ نماز اور کامیابی کی طرف بلاتا ہے اور وہ اس پر لبیک نہ کہے۔''[3]

ایک روایت میں ہے:

«يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شُذَّ إِلَى النَّارِ»

''جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے جو الگ ہوا وہ جہنم میں ڈال دیا گیا۔''[4]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو رات کو قیام کرتا ہے، دن کو روزہ رکھتا ہے لیکن نماز کے لیے وہ جماعت کے ساتھ شریک نہیں ہوتا تو انھوں نے فرمایا ''وہ جہنمی ہے۔''[5]

[1] صحيح مسلم، المساجد، باب يجب إتيان المسجد على من سمع النداء، حديث : 653. [2] سنن أبي داود، الصلاة، باب التشديد في ترك الجماعة، حديث : 550، وسنن ابن ماجه، المساجد والجماعات، باب المشي إلى الصلاة، حديث : 777. [3] [ضعيف] مسند أحمد : 439/3. [4] جامع الترمذي، الفتن، باب ماجاء في لزوم الجماعة، حديث : 2167، وقال الألباني رحمه الله: صحيح دون وَمَنْ شَذَّ...... [5] [ضعيف] جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في من سمع النداء فلا يجيب، حديث : 218.

ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت اور معرفتِ حق کی توفیق اور اس کا اتباع کرنے کی دعا کرتے ہیں۔ بے شک وہی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

جماعت سے پیچھے رہ جانے والے کا حکم

جماعت سے پیچھے رہ جانے والا شخص جب اکیلا نماز ادا کرے تو اس کی دو حالتیں ہیں: ① کوئی شخص کسی مرض یا خوف کی وجہ سے معذور ہو، بغیر عذر کے ترک جماعت اس کی عادت نہ ہو، ایسے شخص کو نماز باجماعت کا ثواب مل جائے گا (إن شاء اللّٰہ) کیونکہ صحیح حدیث میں ہے:

«إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ أَوْ سَافَرَ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ مَا كَانَ يَعْمَلُ مُقِيمًا صَحِيحًا»

''جب کوئی بندہ بیمار ہو یا سفر میں ہو تو جو اعمال تندرستی اور اقامت کی حالت میں کرتا تھا وہ سارے اعمال اس کے ''اعمال نامہ'' میں درج ہوں گے۔''[1]

اسی طرح کسی شخص کا باجماعت نماز ادا کرنے کا پختہ ارادہ تھا لیکن کوئی شرعی عذر حائل ہو گیا تو اسے وہ پورا اجر اور مرتبہ مل جائے گا جو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے والوں کو حاصل ہوا کیونکہ اس کی نیت درست اور اچھی تھی۔

② کوئی شخص بلا عذر شرعی باجماعت نماز سے پیچھے رہا، جب وہ شخص اکیلا نماز ادا کرے گا تو جمہور کے نزدیک اس کی نماز صحیح ہوگی البتہ وہ بہت بڑے اجر و ثواب سے محروم ہو گا کیونکہ باجماعت نماز کی انفرادی نماز کی نسبت ستائیس درجے فضیلت ہے۔ نیز اسے مسجد کی طرف ایک ایک قدم بڑھانے کا جو ثواب تھا وہ حاصل نہ ہو سکا۔ اس عظیم اجر و ثواب کے خسارے کے علاوہ وہ گناہ گار بھی ہے کیونکہ اس نے بلا عذر واجب کو ترک کیا ہے۔ وہ صاحب اختیار (ولی الأمر) کی طرف سے تادیباً سزا کا حق دار ہے جب تک کہ وہ خیر و بھلائی کی طرف واپس نہ پلٹ آئے۔

▲ باجماعت نماز کا مقام مسجد ہے۔ وہ اسلامی شعار کے اظہار کا مقام ہے۔ مساجد کی تعمیر کا یہی مقصد ہے، اگر کسی اور جگہ پر جماعت کی اقامت ہو تو یہ مساجد کی ویرانی کا باعث ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ

[1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب يكتب للمسافر مثل ما كان يعمل في الإقامة، حديث: 2996.

الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴾

''ان گھروں میں، جن کے ادب واحترام کا اور اللہ کا نام وہاں لیے جانے کا حکم ہے، وہاں صبح وشام اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جنھیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز کے قائم کرنے اور زکاۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴾

''اللہ کی مسجدوں کی رونق وآبادی تو ان کے حصے میں ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نمازوں کے پابند ہوں، زکاۃ دیتے ہوں، اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، توقع ہے کہ یہی لوگ یقیناً ہدایت یافتہ ہیں۔''[2]

ان دو آیتوں میں مساجد اور انھیں آباد کرنے کی اہمیت واضح کی گئی ہے، انھیں آباد کرنے والوں کے لیے اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اور ضمناً نماز میں حاضر نہ ہونے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا صَلَاةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ»

''مسجد کے پڑوسی کی نماز مسجد کے علاوہ نہیں ہوتی۔''[3]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی روایت مروی ہے مگر اس میں یہ اضافہ ہے:

«مَنْ أَسْمَعَهُ الْمُنَادِي» ''(مسجد کا پڑوسی وہ ہے) جسے مؤذن کی اذان سنائی دے۔''[4]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس شخص نے سنت میں کماحقہ غور کیا اسے معلوم ہو جائے گا کہ نماز کے لیے مسجد میں حاضر ہونا ہر مرد پر فرض ہے الا یہ کہ کوئی ایسا عارضہ لاحق ہو جس سے ترک جماعت کی رخصت ہو۔ بلاعذر مسجد میں غیر حاضری، بلاعذر ترک جماعت کے مترادف ہے۔ اس نقطۂ نظر پر احادیث وآثار متفق ہیں۔''[5]

---

[1] النور 37,36:24. [2] التوبة 18:9. [3] [ضعيف] السنن الكبرى للبيهقي، أبواب فضل الجماعة والعذر بتركها، باب ما جاء من التشديد في ترك الجماعة من غير عذر : 57/3. [4] [ضعيف] السنن الكبرى للبيهقي، أبواب فضل الجماعة والعذر بتركها، باب ما جاء من التشديد في ترك الجماعة من غير عذر : 57/3. [5] الصلاة وأحكام تاركها لابن القيم، ص: 118.

جو شخص مسجد کی ویرانی کا سبب بنے اور اس میں اقامت نماز سے روکے، اللہ تعالیٰ نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

''اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر کیے جانے کو روکے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے، ایسے لوگوں کو خوف کھاتے ہوئے ہی ان میں جانا چاہیے، ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی بڑے بڑے عذاب ہیں۔''[1]

اگر باجماعت نماز کا اہتمام مسجد سے باہر ہونے لگے تو مساجد خالی ہو جائیں گی یا مساجد میں نمازیوں کی تعداد میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اس کے نتیجے میں دلوں میں نماز کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ﴾

''ان گھروں میں جن کے ادب و احترام کا اور اللہ کا نام وہاں لیے جانے کا حکم ہے۔''[2]

آیت کریمہ میں ''رفع ذکر'' حقیقی اور معنوی دونوں اعتبار سے مطلوب ہے، البتہ اگر مسجد سے باہر باجماعت نماز کی کوئی خاص ضرورت پیش آ جائے، مثلاً: کچھ نمازی اپنے دفتر میں کام کی جگہ پر ہوں اور اپنی ڈیوٹی پر مامور ہوں، اگر وہ اپنی جگہ نماز ادا کر لیں تو یہ ان کے کام کی وجہ سے زیادہ مناسب ہوگا۔ اس حالت میں وہاں کام کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ حاضر ہوں۔ ان کے اس عمل سے ان کی قریبی مسجد کا تعطل لازم نہیں آئے گا کیونکہ وہاں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والے موجود ہیں۔ شاید ان حالات میں اس قسم کے جواز کے پیش نظر ان کے لیے اپنے دفتر وغیرہ میں نماز پڑھ لینے میں کوئی حرج نہ ہوگا۔

▲ نماز باجماعت کی ادائیگی کے لیے کم از کم دو فرد ہونے چاہئیں کیونکہ ''جماعت'' کا لفظ اجتماع سے ماخوذ ہے اور جمع کا اطلاق کم از کم دو افراد پر ہوتا ہے، چنانچہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«اِثْنَانِ فَمَا فَوْقَهُمَا جَمَاعَةٌ» ''دو اور دو سے اوپر جماعت ہے۔''[3]

ایک اور روایت میں ہے (ایک مرتبہ جماعت ہو جانے کے بعد ایک شخص آیا) تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس پر

---

[1] البقرة 2:114. [2] النور 24:36. [3] [ضعيف] سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب الاثنان جماعة، حديث: 972.

کون صدقہ کرے گا؟ تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے اس کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: هٰذَانِ جَمَاعَةٌ ''یہ دو افراد جماعت ہیں۔''[1] ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے کہا: لِيَؤُمَّكُمَا أَكْبَرُكُمَا ''تم دونوں میں سے (عمر میں) بڑا آدمی امامت کرائے۔''[2] الغرض دو افراد ہوں تو نماز باجماعت ادا کرنے پر اہلِ علم کا اجماع اور اتفاق ہے۔

عورتوں کے لیے بھی مباح ہے کہ وہ اپنے خاوندوں سے اجازت لے کر مساجد میں باجماعت نماز کے لیے حاضر ہوں بشرطیکہ اس موقع پر خوشبو کا استعمال ہو نہ زینت کا اظہار بلکہ پردے کا مکمل اہتمام ہو اور مردوں کے ساتھ میل جول سے اجتناب ہو۔ وہ مردوں کی صفوں سے پیچھے رہیں کیونکہ عہد نبوی میں عورتیں ایسا ہی کیا کرتی تھیں۔

خواتین کا وعظ و نصیحت اور علم کی مجالس میں شرکت کرنا مسنون ہے، بشرطیکہ مردوں سے الگ ہوں۔

عورتیں ایک دوسری کے ساتھ مل کر مردوں سے الگ اپنی نماز باجماعت پڑھ سکتی ہیں، خواہ ان کا امام مرد ہو یا عورت کیونکہ نبی ﷺ نے حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے لیے ایک مؤذن مقرر کیا تھا اور انھیں یہ حکم دیا تھا کہ اہلِ محلّہ کی خواتین کی امامت کیا کرو۔[3]

اور دوسری صحابیات سے بھی یہ عمل منقول ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں عموم ہے کہ

«صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلَاةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِينَ دَرَجَةً»

''باجماعت نماز اکیلے کی نماز سے ستائیس گنا زیادہ درجے رکھتی ہے۔''[4]

مسلمان کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ اس مسجد میں نماز ادا کرے جہاں اس کی حاضری کے بغیر باجماعت نماز ادا نہ ہو سکے کیونکہ اس سے اسے مسجد کو آباد کرنے کا ثواب بھی حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

''اللہ کی مسجدوں کی رونق و آبادی تو ان کے حصے میں ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں۔''[5]

بعد ازیں اس مسجد میں نماز ادا کرنا افضل ہے جس میں اس کے علاوہ کثیر تعداد میں نمازی ہوں یہ صورت اجر عظیم

[1] مسند أحمد:5/269,254. [2] صحيح البخاري، الأذان، باب اثنان فما فوقهما جماعة، حديث :658. [3] مسند أحمد :6/405، وسنن أبي داود، الصلاة، باب إمامة النساء، حديث :592. [4] صحيح البخاري، الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، حديث :645. [5] التوبة 9:18.

کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ صَلَاةَ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ أَزْكٰى مِنْ صَلَاتِهِ وَحْدَهُ، وَصَلَاتَهُ مَعَ الرَّجُلَيْنِ أَزْكٰى مِنْ صَلَاتِهِ مَعَ الرَّجُلِ، وَمَا كَثُرَ فَهُوَ أَزْكٰى وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ»

''آدمی کی نماز دوسرے آدمی سے مل کر، اکیلے کی نسبت زیادہ اجر والی ہے، اسی طرح دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنا ایک آدمی کے ساتھ نماز ادا کرنے سے زیادہ اجر کا باعث ہے۔ جماعت میں افراد کی جس قدر کثرت ہوگی تو وہ نماز اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی قدر محبوب اور زیادہ اجر کا باعث ہوگی۔''[1]

اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ اجتماع میں رحمت وسکینت کا نزول ہوتا ہے، عمومی دعائیں ہوتی ہیں اور قبولیت دعا کی امید بڑھ جاتی ہے، بالخصوص جب نمازیوں میں اہل علم اور نیک لوگ موجود ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فِيهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝﴾

''اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[2]

اس آیت کریمہ سے طہارت اور مکمل وضو کا خیال رکھنے والے صالحین کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔

پھر نئی مسجد کی نسبت پرانی مسجد میں نماز ادا کرنا بہتر اور افضل ہے کیونکہ جدید مسجد کی نسبت اسے اطاعت اور عبادت میں سبقت حاصل ہے۔ پھر قریب کی مسجد کی بجائے، کسی دور کی مسجد میں نماز ادا کرنا افضل ہے کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَعْظَمُ النَّاسِ أَجْرًا فِي الصَّلَاةِ أَبْعَدُهُمْ فَأَبْعَدُهُمْ مَمْشًى»

''نماز کا اجر وثواب ان لوگوں کے لیے زیادہ ہے جو نماز کے لیے زیادہ دور سے آتے ہیں۔''[3]

«وَذٰلِكَ أَنَّهُ إِذَا تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا الصَّلَاةُ، لَمْ يَخْطُ خَطْوَةً إِلَّا رُفِعَتْ لَهُ بِهَا دَرَجَةٌ وَّحُطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةٌ وَفِي رِوَايَةٍ: حَتَّى يَدْخُلَ الْمَسْجِدَ»

① سنن أبي داود، الصلاة، باب في فضل صلاة الجماعة، حديث :554، ومسند أحمد :140/5. ② التوبة 108:9.

③ صحيح البخاري، الأذان، باب فضل صلاة الفجر في جماعة، حديث :651.

''اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے اور صرف نماز کی خاطر مسجد میں آتا ہے تو جب وہ ایک قدم اٹھاتا ہے تو اس کا ایک درجہ بلند کر دیا جاتا ہے، اس کا ایک گناہ مٹا دیا جاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں: یہاں تک کہ وہ مسجد میں داخل ہو جاتا ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا:

«يَابَنِي سَلِمَةَ! دِيَارَكُمْ تُكْتَبْ آثَارُكُمْ»

''اے بنوسلمہ! اپنے (موجودہ) گھروں میں رہائش رکھو (کیونکہ دور کی وجہ سے) تمھارے (قدموں کے) نشانات (اللہ کے ہاں) لکھے جاتے ہیں۔''[2]

بعض علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دو مسجدوں میں سے قریب تر مسجد میں نماز ادا کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ پڑوس میں ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ حق دار ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے:

«لَا صَلَاةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ»

''مسجد کے پڑوسی کی نماز مسجد ہی میں ہوتی ہے۔''[3]

نیز قریب کی مسجد کو چھوڑ کر دور کی مسجد میں نماز ادا کرنے سے پڑوسی اس کے عمل پر تعجب کریں گے۔ غالباً یہ رائے زیادہ وزن رکھتی ہے کیونکہ دور کی مسجد میں جانے سے قریب والی مسجد کو نظر انداز کرنا لازم آتا ہے اور قریب کی مسجد کے امام کے بارے میں دوسروں کو بدگمانی ہوگی۔

▲ باجماعت نماز کے احکام میں یہ بھی ہے کہ مسجد کے مقرر امام کی موجودگی میں دوسرے شخص کا امامت کروانا ناجائز ہے الاّ یہ کہ اس کی اجازت ہو یا وہ معذور ہو۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ . . . . إِلَّا بِإِذْنِهِ»

''کوئی شخص کسی شخص کے دائرہ اختیار واقتدار میں اس کی اجازت کے بغیر جماعت نہ کرائے۔''[4]

امام نووی رحمہ اللہ اس روایت کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں: ''گھر کا مالک، صاحب مجلس اور مسجد کا مقرر امام اپنی

---

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، حديث: 647، والصلاة، باب الصلاة في مسجد السوق، حديث: 477. [2] صحيح البخاري، الأذان، باب احتساب الآثار، حديث: 655، وصحيح مسلم، المساجد، باب فضل كثرة الخطا إلى المساجد، حديث: 665 واللفظ له. [3] [ضعيف] السنن الكبرى للبيهقي، أبواب فضل الجماعة والعذر بتركها، باب ماجاء من التشديد......: 57/3. [4] صحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة؟ حديث: 673.

جگہ کا دوسرے سے زیادہ حق دار ہے۔"[1] علاوہ ازیں یہ جسارت مقرر امام کو پریشان کرتی ہے، نفرت کا باعث ہے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ ہے۔

بعض علمائے کرام کا خیال ہے کہ اگر کسی نے مسجد کے مقرر امام کی اجازت یا اس کے شرعی عذر کے بغیر لوگوں کو باجماعت نماز پڑھائی تو ان کی نماز صحیح نہ ہوگی کیونکہ یہ امر خطرناک اور انتہائی برے نتائج کا سبب ہے، لہٰذا اس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

جماعت کو چاہیے کہ اپنے امام کے حقوق کا خیال رکھے، اس کے کام میں دخل اندازی نہ کرے۔ امام کو بھی اپنے مقتدیوں کے احترام کا خیال رکھنا چاہیے ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور انھیں تکلیف ومشقت میں نہ ڈالے۔

ہر ایک دوسرے کا اس قدر خیال رکھے کہ امام اور مقتدیوں کے درمیان وحدت والفت، محبت اور یگانگت پیدا ہو۔ اگر امام کی آمد میں تاخیر ہو جائے اور نماز کا وقت بھی کم ہو تو تب لوگ کسی بھی شخص کو امام بنالیں اور باجماعت نماز ادا کرلیں جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھا دی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی عمرو بن عوف کے ہاں صلح کرانے کے لیے گئے تھے اور لیٹ ہو گئے تھے۔[2] اسی طرح ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں قضائے حاجت کے لیے دور نکل گئے، جب واپس آئے تو سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جماعت کروا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے ایک (آخری) رکعت ادا کی اور باقی نماز ان کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کی۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: [أَحْسَنْتُمْ] "تم نے جو کیا اچھا کیا۔"[3]

باجماعت نماز کے جملہ احکام میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی نے نماز ادا کر لی، پھر وہ مسجد میں آیا اور وہاں وہی نماز کھڑی ہے تو اس کے لیے جماعت میں شامل ہو کر دوبارہ نماز پڑھ لینا مسنون ہے۔

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صَلِّ الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا، فَإِنْ أَدْرَكَتْكَ الصَّلَاةُ مَعَهُمْ فَصَلِّ، وَلَا تَقُلْ: إِنِّي قَدْ صَلَّيْتُ فَلَا أُصَلِّي»

"وقت پر نماز ادا کر لو، پھر مسجد میں (تمھاری موجودگی میں) وہی نماز تمھیں باجماعت مل جائے تو دوبارہ نماز پڑھ لو، اور یہ نہ کہنا کہ میں نماز پڑھ چکا ہوں، لہٰذا دوبارہ نہیں پڑھتا۔"[4]

[1] شرح مسلم للنووي :243/5. [2] صحيح مسلم، الصلاة، باب تقديم الجماعة من يصلي بهم إذا تأخر الإمام......، حديث :421. [3] صحيح مسلم، الصلاة، باب تقديم الجماعة من يصلي بهم إذا تأخر الإمام ......، حديث : 274.
[4] صحيح مسلم، المساجد، باب كراهة تأخير الصلاة عن وقتها المختار......، حديث :648.

واضح رہے کہ اس کی بعد والی نماز نفل ہو جائے گی جیسا کہ آپ ﷺ نے دو آدمیوں کو فرمایا تھا: ''جب تم اپنے گھروں میں نماز پڑھ چکو، پھر تم مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پا لو تو ان کے ساتھ بھی پڑھ لو تو بعد والی نماز تمھارے لیے نفل ہو جائے گی۔''[1]

ویسے بھی جب لوگ باجماعت نماز ادا کر رہے ہوں اور کوئی شخص الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائے تو اس کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے کہ شاید یہ نمازی نہیں۔

◣ نماز باجماعت کے احکام میں یہ بھی ہے کہ جب مؤذن فرض نماز کی اقامت شروع کر دے تو پھر کسی کے لیے کوئی دوسری نماز الگ طور پر شروع کرنا جائز نہیں، وہ نماز نفل ہو یا کوئی فرض، تحیۃ المسجد ہو یا کوئی اور نماز کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ»

''جب نماز کی اقامت کہی جائے تو فرض نماز کے سوا کوئی نماز نہیں ہوتی۔''[2]

ایک روایت میں ہے:

«فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الَّتِي أُقِيمَتْ»

''پھر کوئی نماز نہیں سوائے اس نماز کے جس کی اقامت کہی گئی ہے۔''[3]

لہٰذا فرض نماز کی اقامت سن کر کوئی اور نماز شروع نہ کی جائے بلکہ اگر کوئی کسی نماز میں مشغول ہو تو اسے توڑ کر اس نماز میں شامل ہو جائے جس کی اقامت کہی گئی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اقامت کے بعد نفل نماز کو چھوڑ کر امام کے ساتھ شامل ہونے میں یہ حکمت ہے کہ انسان شروع ہی سے فرض نماز کے لیے فارغ ہو کر امام کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے، فرض نماز کی محافظت کرنا نفل نماز میں مشغول ہونے سے بہتر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے امام سے اختلاف کرنے سے منع کیا ہے۔ ایک حکمت یہ بھی ہے کہ تکبیر تحریمہ حاصل ہو جاتی ہے اور امام کے ساتھ ہی تکبیر تحریمہ میں شامل ہونے سے تکبیر تحریمہ کا مخصوص اجر وثواب ملتا ہے۔''[4]

◣ اگر نماز کی اقامت ہو جائے اور کوئی شخص نفلی نماز میں مصروف ہو تو اسے توڑنے کی بجائے مختصر کر کے مکمل کرے۔

---

[1] جامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في الرجل يصلي وحده ثم يدرك الجماعة، حديث: 219. [2] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن في إقامة الصلاة......، حديث: 710. [3] [ضعيف] مسند أحمد: 352/2. [4] شرح مسلم للنووي: 312/5.

البتہ اگر جماعت کے نکل جانے کا اندیشہ ہوتو پھر نفل نماز توڑ دے [1] کیونکہ فرض نماز کی اہمیت زیادہ ہے۔

جماعت کے دوران میں شامل ہونے والے کے احکام

اہل علم کے صحیح قول کے مطابق جو شخص نماز با جماعت کی ایک رکعت حاصل کر لے اس نے گویا مکمل نماز کا اجر وثواب حاصل کر لیا۔ اگر اس نے ایک رکعت سے کم حصہ حاصل کیا تو اسے با جماعت نماز پڑھنے والا شمار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اسے رکعت کا جتنا حصہ ملے اسے امام کے ساتھ شامل ہونا چاہیے اور اسے اس کی اچھی نیت کی وجہ سے جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ جس طرح جماعت ختم ہونے کے بعد پہنچنے والے کو نیت کا ثواب مل جاتا ہے جیسا کہ مختلف احادیث کا مفہوم ہے: ''جس نے نیکی کی نیت کر لی لیکن کسی وجہ سے اسے ادا نہ کر سکا تو اسے نیکی کا اجر مل جائے گا۔''

رکوع میں شامل ہو جانے سے رکعت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ الرُّكُوعَ فَقَدْ أَدْرَكَ الرَّكْعَةَ» ''جس نے رکوع پا لیا اس نے رکعت پا لی۔'' [2]

نیز صحیح بخاری میں سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ جب رکوع کی حالت میں جماعت کے ساتھ شامل ہوئے تو آپ ﷺ نے اسے وہ رکعت دہرانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ [3] اس سے واضح ہوا کہ اس کی رکعت ہو گئی۔

---

[1] فاضل مؤلف ﷾ کا یہ موقف صحیح نہیں۔ حدیثِ رسول ﷺ: [إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةُ] (صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب كراهة الشروع في نافلة......، حديث:710) کا تقاضا تو یہی ہے کہ اقامت (تکبیر) کے شروع ہوتے ہی سنت یا نفل پڑھنے والا اپنی نماز ختم کر دے اور جماعت میں شامل ہو جائے۔ اور بعد میں سنتیں ادا کرے کیونکہ اقامت کے بعد پڑھی جانے والی نماز کا شرعاً وجود منفی ہے۔

[2] المغني والشرح الكبير:580/1. شیخ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ الإرواء:266/2.

[3] صحيح البخاري، الأذان، باب إذا ركع دون الصف، حديث: 783. اس حدیث ابوبکرہ رضی اللہ عنہ میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: [وَلَا تَعُدْ] ''دوبارہ ایسا نہ کرنا'' بنابریں اگر بالفرض اس نے اعادہ نہ بھی کیا ہو (جس کا ذکر نہیں) تو آپ کے روک دینے کی وجہ سے آئندہ نہ اس کی رکعت ہوگی اور نہ کسی اور شخص کی۔ اگر مذکورہ کلمے کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ثابت ہوگا کہ نماز باجماعت کے دوران میں شامل ہونے کا وہ ایک طریقہ ہے جو سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا تھا۔ حالانکہ یہ حضرات اس کے قائل اور فاعل نہیں۔ باقی رہی ابوداود والی مذکورہ روایت تو وہاں رکعت کا اجر وثواب مراد ہے جیسا کہ اس باب کے شروع میں بیان ہو چکا ہے۔ (صارم)

اگر امام رکوع کی حالت میں ہو تو شامل ہونے والا شخص پہلے کھڑا کھڑا تکبیر تحریمہ کہے اور پھر دوسری تکبیر کہہ کر رکوع میں چلا جائے۔ یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ اگر اس نے صرف تکبیر تحریمہ پر اکتفا کیا تو بھی درست ہے۔ بہر حال تکبیر تحریمہ کھڑے کھڑے کہنا ضروری ہے۔ جب کہ رکوع والی تکبیر اس کے بعد کہنا افضل ہے۔

▲ جماعت میں شامل ہونے والا امام کو جس حال میں پائے وہ تکبیر تحریمہ کہہ کر اسی حالت میں چلا جائے کیونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا جِئْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ وَنَحْنُ سُجُودٌ فَاسْجُدُوا وَلَا تَعُدُّوهَا شَيْئًا»

''جب تم نماز کے لیے آؤ اور ہم سجدے کی حالت میں ہوں تو تم بھی سجدے کی حالت اختیار کرو اور اسے رکعت شمار نہ کرو۔''[1]

جب امام دونوں جانب سلام پھیرے تب بعد میں شامل ہونے والا کھڑا ہو اور بقیہ نماز مکمل کرے، دونوں طرف سلام پھیرنے سے پہلے اسے ہرگز کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔[2]

▲ امام کے ساتھ جو رکعات مل جائیں صحیح قول کے مطابق مقتدی کی وہ ابتدائی رکعات ہوں گی۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جو رکعات ادا کرے گا وہ اس کی پچھلی رکعات ہوں گی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا» ''نماز کا جو حصہ تم سے فوت ہو جائے اسے بعد میں مکمل کر لو۔''[3]

بعد والی نماز کے لیے ''مکمل کرنے'' کے الفاظ سے واضح ہوا کہ پہلے، پہلا حصہ پڑھا گیا ہے۔ ایک اور روایت میں یوں ہے:

«وَمَا فَاتَكُمْ فَاقْضُوا» ''نماز کا جو حصہ تم سے فوت ہو جائے اس کی قضا ادا کرو۔''[4]

یہ الفاظ پہلی روایت کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ ''فاقضوا'' کا معنی قضا اصطلاحی نہیں ہے بلکہ اس کا معنی پورا کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ﴾ ''جب نماز پوری کر لی جائے۔''[5] میں قضا کے معنی پورا کرنے کے ہیں۔

① سنن أبي داود، الصلاة، باب الرجل يدرك الإمام ساجداً كيف يصنع؟ حديث :893.

② عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب امام ایک جانب سلام پھیرتا ہے تو لوگ باقی نماز ادا کرنے کے لیے اسی وقت کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ امام کے دوسری جانب سلام پھیرنے کا انتظار نہیں کرتے جو کہ غلط ہے۔ (صارم)

③ صحيح البخاري، الأذان، باب لا يسعى إلى الصلاة وليأتها بالسكينة والوقار، حديث :636. ④ سنن أبي داود، الصلاة، باب السعي إلى الصلاة، حديث:573،وسنن النسائي، الإمامة، باب السعي إلى الصلاة،حديث: 862 واللفظ له. ⑤ الجمعة 10:62.

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ﴾ ''پھر جب تم ارکان حج ادا (پورے) کر چکو۔''①

ان دو قرآنی آیات میں ''قضا'' کا کلمہ اصطلاحی قضا کے لیے نہیں آیا بلکہ ادا کرنے اور پورا کرنے کے معنی میں ہے۔

جب نماز میں جہری قراءت ہو تو مقتدی کے لیے ضروری ہے کہ وہ امام کی قراءت سنے۔ یہ جائز نہیں کہ امام اور مقتدی دونوں بیک وقت قراءت کریں، لہٰذا مقتدی امام کے پیچھے سورت فاتحہ اور قرآن کا کوئی حصہ نہ پڑھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○﴾

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحمت ہو۔''②

امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس پر اجماع ہے۔''③

اگر مقتدی پر قراءت واجب ہوتی تو استماع کی خاطر اسے قراءت چھوڑنے کا حکم نہ ہوتا۔ نیز اگر مقتدی نے قراءت کرنی ہی ہوتی تو امام کا اونچی قراءت کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں امام کی قراءت کے بعد مقتدی کا آمین کہنا قراءت ہی کے قائم مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ اور سیدنا ہارون علیہما السلام کو کہا:

﴿قَدْ أُجِيبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ ''تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے۔''③

حالانکہ دعا صرف موسیٰ علیہ السلام نے کی:

﴿رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ

---

① البقرة 2:200. ② الأعراف 7:204.

③ مجموع الفتاوی لشیخ الإسلام ابن تیمیة 22/295، فاضل مولف حفظہ اللہ کے کلام میں تعارض ہے کیونکہ گزشتہ صفحات پر ارکان و واجبات کی تفصیل میں سورۂ فاتحہ کو نماز کا رکن کہا ہے اور جہری نماز میں امام کے پیچھے مقتدی کا سورۂ فاتحہ پڑھنا افضل اور بہتر قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں حدیث میں ہے: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قراءت کرتے رہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں فرمایا: [لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِأُمِّ الْقُرْآنِ] ''سورۂ فاتحہ کے سوا امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھو۔'' (جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في القراءة خلف الإمام، حديث: 311) یہ واقعہ مدنی ہے جب کہ مذکورہ بالا آیت مکی ہے، لہٰذا سورۂ فاتحہ کی قراءت آیت کی مخصص ہے۔ نیز کلمہ ﴿وَأَنْصِتُوا﴾ اونچی قراءت کرنے سے مانع ہے کیونکہ آیت کے اگلے الفاظ: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ﴾ ''اپنے رب کا ذکر دل میں کرو'' میں بغیر آواز کے پڑھنے کا حکم ہے۔ (صارم)

④ یونس 10:89.

سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ﴾

''اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان زینت اور طرح طرح کے مال دنیاوی زندگی میں دیے۔ اے ہمارے رب! (اسی واسطے دیے ہیں کہ) وہ تیری راہ سے گمراہ کریں۔ اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے، سو یہ ایمان نہ لانے پائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔''[1]

اور جناب ہارون علیہ السلام نے آمین کہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہارون علیہ السلام کی آمین کو دعائیہ کلمات کہنے کے قائم مقام قرار دیا اور فرمایا: ﴿قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ حاصل بحث یہ ہوا کہ کلمات پر آمین کہنے والا ایسے ہی ہے جیسے اس نے دعائیہ کلمات زبان سے ادا کیے۔[2]

▲ اگر سری نماز ہو یا مقتدی تک امام کی قراءت کی آواز پہنچ نہ رہی ہو تو اس حال میں مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لے، یہ تطبیق کی بہترین صورت ہے، یعنی مقتدی پر سورۂ فاتحہ سری نمازوں میں واجب ہوگی، جہری نمازوں میں نہیں۔[3] واللہ أعلم

▲ باجماعت نماز کے احکام میں سے ایک اہم حکم یہ ہے کہ مقتدی کو امام کی مکمل طور پر اقتدا کرنی چاہیے۔ امام سے آگے بڑھنا حرام ہے کیونکہ امام کے پیچھے کھڑا شخص مقتدی اور متبع ہے، اس لیے اسے پیچھے پیچھے رہنا چاہیے، اپنے امام سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَمَا يَخْشٰى أَحَدُكُمْ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ وَالْإِمَامُ سَاجِدٌ أَنْ يَّجْعَلَ اللهُ رَأْسَهُ رَأْسَ حِمَارٍ أَوْ صُورَتَهُ صُورَةَ حِمَارٍ؟»

''کیا تمھیں ڈر نہیں لگتا کہ امام سے پہلے سر اٹھانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمھارا سر گدھے کا سر یا تمھاری صورت گدھے کی صورت بنا دے؟''[4]

---

[1] یونس 10:88.

[2] فاضل مصنف حفظہ اللہ کا استدلال کمزور ہے کیونکہ امام کے پیچھے فاتحہ کی قراءت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی واضح صحیح نص موجود ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، لہٰذا نص صریح صحیح کے مقابلے میں اجتہاد و قیاس کی کوئی حیثیت نہیں۔ (صارم)

[3] سورۂ فاتحہ مقتدی کے لیے بھی ہر رکعت اور ہر حال میں پڑھنا لازمی ہے، نماز سری ہو یا جہری، امام کی آواز پہنچ رہی ہو یا نہ پہنچ رہی ہو۔ (ابوزید) إرشاد الساري:2/402، تحت الحديث:756.

[4] صحيح البخاري، الأذان، باب إثم من رفع رأسه قبل الإمام، حديث :691، وصحيح مسلم، الصلاة، باب ◄◄

جو شخص امام سے آگے بڑھتا ہے وہ گدھے کی طرح ہے جسے اپنے کام کے مقصد کا فہم نہیں ہوتا، ایسا کرنے والا شخص درحقیقت سزا کا حق دار ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے کہ امام صرف اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے جب تک وہ رکوع نہ کرے تم بھی رکوع نہ کرو اور جب تک وہ سجدہ نہ کرے تم بھی سجدہ نہ کرو جیسا کہ مسند احمد اور سنن ابوداود میں ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ . . . وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا وَلَا تَرْكَعُوا حَتَّى يَرْكَعَ . . . وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا وَلَا تَسْجُدُوا حَتَّى يَسْجُدَ»

''امام بنانے کا مقصد اس کی اقتدا کرنا ہے...... جب وہ رکوع میں جائے تب تم رکوع میں جاؤ، اس کے رکوع سے پہلے تم رکوع نہ کرو۔ جب وہ سجدے میں جائے تب تم سجدے میں جاؤ اور اس کے سجدے سے قبل تم سجدہ نہ کرو۔''[1]

حدیث میں ہے، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز میں کھڑے ہوتے تو ہر شخص اس وقت تک اپنی کمر نہ جھکاتا جب تک رسول اللہ ﷺ سجدہ میں نہ چلے جاتے، پھر وہ آپ کے بعد سجدہ میں جاتے۔[2]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو امام سے سبقت کرتے دیکھا تو اسے مارا اور فرمایا: ''تم نے اکیلے نماز پڑھی نہ اپنے امام کی اقتدا کی۔''[3]

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں عام طور پر نمازی حضرات سستی کر جاتے ہیں یا وہ مسئلہ کا علم نہ ہونے کی وجہ سے امام سے سبقت کر جاتے ہیں اور وعید شدید کے سزاوار ہوتے ہیں بلکہ اندیشہ ہے کہ ان کی نماز ہی صحیح نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«فَلَا تَسْبِقُونِي بِالرُّكُوعِ وَلَا بِالسُّجُودِ وَلَا بِالْقِيَامِ وَلَا بِالِانْصِرَافِ»

''رکوع، سجدہ، قیام اور سلام پھیرنے میں مجھ سے آگے نہ بڑھو۔''[4]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام سے مسابقت ائمہ کے ہاں بالاتفاق حرام ہے، کسی کے لائق نہیں کہ وہ اپنے امام سے پہلے رکوع کرے اور امام سے پہلے سر اٹھائے یا امام سے پہلے سجدہ کرے۔ اس

◀◀ تحريم سبق الإمام بركوع أو سجود ونحوهما، حديث: 427، ومسند أحمد: 504/2 واللفظ له. [1] سنن أبي داود، الصلاة، باب الإمام يصلي من قعود، حديث: 603، ومسند أحمد: 341/2. [2] صحيح البخاري، الأذان، باب متى يسجد من خلف الإمام؟ حديث: 690. [3] مجموع الفتاوى لابن تيمية: 337/3. [4] صحيح مسلم، الصلاة، باب تحريم سبق الإمام بركوع أو سجود ونحوهما، حديث 426.

بارے میں رسول اللہ ﷺ سے ممانعت کی بہت سی روایات ہیں۔''[1]

امام سے مسابقت ایک شیطانی کھیل تماشا ہے جس کے ذریعے سے شیطان نماز میں خلل پیدا کرتا ہے، ورنہ اس کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟ مقتدی امام کے سلام پھیرنے سے پہلے نماز سے فارغ تو ہو نہیں سکتا؟

ہر مسلمان کو اس بارے میں خبردار رہنا چاہیے اور اپنے امام کی اقتدا کا التزام کرنا چاہیے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ سب کو دین کا فہم اور اس کے احکام سے واقفیت وبصیرت دے۔ یقیناً وہی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ وہ جسے خیر و بھلائی دینے کا ارادہ فرمالے اسے دین کا فہم عطا کرتا ہے۔

مساجد میں عورتوں کے حاضر ہونے کا حکم

ہمارا دین اسلام ایک کامل دین ہے جو دنیوی اور اخروی مصلحتوں کا جامع ہے۔ اس میں مسلمان مردوں اور خواتین کے لیے بھلائی اور خیر خواہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

''جو شخص نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے۔ اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انھیں ضرور بہ ضرور دیں گے۔''[2]

دین اسلام نے عورت کے امور پر بھی بہت توجہ دی ہے حتیٰ کہ اسے عزت واحترام کی بلند چوٹی پر کھڑا کر دیا ہے، بشرطیکہ وہ دین کی ہدایت اور راہنمائی کو مضبوطی سے تھامے رکھے اور اس کے بتائے ہوئے فضائل و خصائل سے آراستہ ہو۔

عورت کی تربیت کی ایک صورت یہ ہے کہ دین اسلام نے اسے باجماعت نماز کی برکات میں شریک ہونے اور مجالس ذکر میں شامل ہونے کے لیے مساجد میں جانے کی اجازت دی ہے اور اس کے ساتھ اسے ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنے کی تلقین وتاکید کی ہے جو اسے دنیاوی فتنوں سے محفوظ و مامون رکھیں بلکہ اس کی عزت واحترام کی محافظ ثابت ہوں، جس کی قدرے تفصیل یوں ہے:

جب عورت مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو اسے روکنا درست نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے

---

① مجموع الفتاویٰ لشیخ الإسلام ابن تیمیة: 336/23. ② النحل 97:16.

فرمایا ہے:

«لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللهِ مَسَاجِدَ اللهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: لَا تَمْنَعُوا نِسَاءَكُمُ الْمَسَاجِدَ، وَبُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ: وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرٰی لِيَخْرُجْنَ وَهُنَّ تَفِلَاتٌ»

''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد سے نہ روکو۔''[1] ایک روایت میں ہے: ''تم اپنی عورتوں کو مساجد سے نہ روکو[2] جبکہ ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔''[3] ایک اور روایت میں ہے ''البتہ وہ سادگی سے نکلیں۔''[4]

اس حدیث میں عدم ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ باجماعت فرض نماز کی ادائیگی میں مرد وعورت ہر دو کے لیے بہت بڑی فضیلت اور اجر ہے، اسی طرح مسجد کی طرف چلنے کا مزید ثواب ہے۔ صحیحین میں روایت ہے:

«إِذَا اسْتَأْذَنَكُمْ نِسَاءُكُمْ بِاللَّيْلِ إِلَى الْمَسْجِدِ فَأْذَنُوا لَهُنَّ»

''جب تمھاری عورتیں رات کے وقت مسجد میں جانے کی اجازت طلب کریں تو انھیں اجازت دے دو۔''[5]

خاوند سے اجازت مانگنے کی وجہ یہ ہے کہ عورت کا گھر میں رہنا اس کے خاوند کا حق ہے، جب کہ مسجد میں جانا مباح ہے۔ مباح کی خاطر واجب کا ترک درست نہیں، البتہ جب خاوند نے بیوی کو اجازت دے دی تو خاوند نے اپنا حق ختم کرلیا۔ حدیث میں ہے: ''ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مساجد میں نماز ادا کرنے سے ان کا گھروں میں نماز ادا کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ گھر میں رہنے سے وہ کئی فتنوں سے محفوظ رہیں گی۔ اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ''وہ سادگی سے نکلیں۔'' یعنی وہ زینت اور خوشبو لگا کر نہ نکلیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ سادگی میں ہوں گی تب مرد ان کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اور حرص بھری نگاہوں سے نہ دیکھیں گے جو فتنے کی بنیاد ہے۔ اسی طرح وہ چمکیلا اور بھڑکیلا لباس نہ پہنیں، زیور کی نمائش نہ کریں۔ اس صورت میں عورت کے لیے اس کا گھر سے نکلنا حرام ہے اور خاوند کے لیے اسے روکنا ضروری ہے کیونکہ صحیح مسلم میں روایت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ أَصَابَتْ بَخُورًا فَلَا تَشْهَدْ مَعَنَا الْعِشَاءَ الْآخِرَةَ»

''جو عورت خوشبو لگائے وہ عشاء کی نماز میں ہمارے ساتھ شامل نہ ہو۔''[6]

---

① صحيح البخاري، الجمعة، باب :13، حديث :900، ومسند أحمد :16/2 و36 و151. ② صحيح مسلم، الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد......، حديث :442. ③ سنن أبي داود، الصلاة، باب ماجاء في خروج النساء إلى المسجد، حديث :567. ④ سنن أبي داود، الصلاة، باب ماجاء في خروج النساء إلى المسجد، حديث:565. ⑤ صحيح البخاري، الأذان، باب خروج النساء إلى المساجد بالليل والغلس، حديث:865، وصحيح مسلم، الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد...... ، حديث :442. ⑥ صحيح مسلم، الصلاة، باب خروج النساء ◄◄

جب کوئی عورت مسجد کی طرف جائے تو وہ مردوں کے رش سے دور رہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اسلامی حکومت کے افسران کو چاہیے کہ وہ بازاروں یا مردوں کے جمع ہونے کی جگہوں پر مردوں اور عورتوں کا اختلاط نہ ہونے دیں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے کیونکہ یہ چیز ایک بڑے فتنے کا موجب ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''میں نے اپنے پیچھے مردوں کے لیے عورت سے بڑا فتنہ کوئی نہیں چھوڑا۔''[1]

آگے چل کر امام موصوف لکھتے ہیں: عورتوں کو زیب و زینت اختیار کر کے باہر نکلنے سے روکنا چاہیے اور انھیں باریک کپڑے پہننے سے منع کرنا چاہیے، جن میں ان کے اعضاء یوں نمایاں ہوں جیسے وہ ننگی ہیں، انھیں راستوں میں غیر مردوں کے ساتھ بات چیت سے روکنا چاہیے، اسی طرح مردوں کو بھی ایسی حرکات سے روکا جائے۔''

گھر سے نکلتے وقت جب کوئی عورت اسلامی آداب پر عمل پیرا ہوتے ہوئے حیا کو اختیار کرے، پردے کا اہتمام کرے، زیب و زینت اور خوشبو کے استعمال سے احتراز کرے، مردوں کے اختلاط سے دور رہے تو اس کے لیے نماز اور وعظ و نصیحت سننے کے لیے مسجد میں جانا جائز ہے۔ لیکن اس صورت حال کے باوجود بھی اس کا گھر میں رہنا افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ ''ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔''[2]

- اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت کا گھر میں نماز ادا کرنا مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں فتنے سے بچاؤ ہے اور خیر و سلامتی یقینی ہے اور شر کی بیخ کنی ہے۔
- اگر عورت اسلامی آداب کا لحاظ نہ رکھے، ممنوعہ چیزوں، مثلاً: زینت اور خوشبو سے اجتناب نہ کرے تو اس حال میں اس کا گھر سے نکلنا حرام ہے۔ اس کے سرپرست اور صاحب اختیار پر اسے بہر صورت روکنا فرض ہے۔

صحیحین میں روایت ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اس وقت ہم نے عورتوں کی جو صورت حال دیکھی ہے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ لیتے تو آپ عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا۔''[3]

مسجد میں جاتے وقت جب اس حد تک احتیاط ہے تو مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ جانا ہو تو اسے اس سے کہیں زیادہ محتاط رہنا چاہیے اور فتنوں کی جگہوں سے بچنا چاہیے۔

◄◄ إلى المساجد......، حديث:444. [1] صحيح البخاري، النكاح، باب ما يُتّقى من شؤم المرأة......، حديث:5096، وصحيح مسلم، الرقاق، باب أكثر أهل الجنة الفقراء وأكثر أهل النّار النساء......، حديث:2740. [2] سنن أبي داود، الصلاة، باب ما جاء في خروج النساء إلى المسجد، حديث:567. [3] صحيح البخاري، الأذان، باب انتظار الناس قيام الإمام العالم، حديث:869، وصحيح مسلم، الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد......، حديث:445.

آج کل بعض لوگ یہ نعرہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ عورت کو گھر سے نکل کر معاشرے کے ہر شعبے میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے جیسا کہ مغربی ممالک میں یا مغربی تہذیب سے متاثرہ ممالک میں عورتوں کی صورت حال ہے۔ درحقیقت یہ لوگ فتنے کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور عورت کو تباہی وشقاوت کے گہرے گڑھے کی طرف گھسیٹ رہے ہیں اور اس سے اس کی عزت و ناموس کی چادر چھین رہے ہیں، چنانچہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان لوگوں کے آگے ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دیں حتیٰ کہ وہ آگے نہ بڑھ سکیں اور اس دعوتِ جاہلیت میں استعمال ہونے والی زبانیں اور قلمیں روک دیں۔

یہ نہایت واضح اور نمایاں حقیقت ہے کہ آج مغرب یا مغرب کی تقلید کرنے والے ممالک میں عورت تباہی و بربادی کے جس گڑھے میں گر چکی ہے اور جس خوفناک دلدل میں پھنس چکی ہے اب اس پر اس کا سارا معاشرہ پریشانی و پشیمانی کے عالم میں سسک رہا ہے۔ ہمیں ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، عقل مند وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

ان لوگوں کے پاس اپنے دعوے کے حق میں کوئی دلیل نہیں، ہاں! ان کا کہنا ہے کہ عورت کے کام نہ کرنے سے معاشرے کا نصف حصہ بیکار ہو جاتا ہے، لہٰذا عورت کو مرد کے ساتھ میدان عمل میں برابر شریک ہونا چاہیے اور اس کو مرد کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے۔ درحقیقت یہ لوگ کسی بھول میں ہیں یا بھولے پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور نادان بنے ہوئے ہیں کیونکہ عورت اپنے گھر میں رہ کر جو اہم کام سرانجام دے رہی ہے اور اپنے دائرہ میں رہ کر معاشرہ میں جو عظیم خدمت سرانجام دے رہی ہے وہ کام اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ نیز وہ کام اس کی خلقت سے مناسبت رکھتا ہے اور اس کی فطرت کے لیے موزوں ہے۔ وہ ایک بیوی ہے جو اپنے خاوند کے لیے باعث سکون ہے۔ وہ ایک ماں ہے جس کا کام بچے جننا، انھیں دودھ پلانا اور بچوں کی تربیت کرنا ہے۔ اس نے گھر کے ہر کام کو ٹھیک طریقے سے سرانجام دینا ہے۔ اگر اسے گھر سے نکال دیا جائے اور وہ مردوں کے ساتھ ان کے کاموں میں شریک ہو جائے تو عورت کے کام کون کرے گا؟ یقیناً وہ کام دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور اس طرح معاشرہ اپنے دوسرے آدھے حصے سے بھی محروم ہو جائے گا تو پہلے نصف حصے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکے گا؟ اس طرح تو معاشرے کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہو جائیں گی۔

ہم آزادی کے ان دعویداروں کو کہتے ہیں کہ تم خیر و بھلائی کی طرف پلٹ آؤ، ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اللہ کی نعمت کی ناقدری کی حتیٰ کہ انھوں نے اپنی قوم کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دیا۔ تم تعمیر کی دعوت دینے والے بنو، تخریب کی طرف بلانے والے نہ بنو۔

اے مسلمان عورت! اپنے دین کی تعلیم کو مضبوطی سے تھام لے، ان گمراہ کن لوگوں کے دھوکے میں نہ آنا جو تجھے عزت و کرامت کے اس اعلیٰ مقام و مرتبہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں جو دین اسلام نے تجھے عطا کیا ہے۔ اسلام کے علاوہ اور کسی دین نے یہ مقام و مرتبہ عطا نہیں کیا۔ اور جو شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے اعمال کی توفیق دے جن میں دنیا اور آخرت کی خیر و فلاح ہو۔

امامت کے احکام

نماز کی امامت ایک اہم دینی ذمہ داری ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا اور پھر خلفائے راشدین نے بھی اس بار امامت کو اٹھایا اور خوش اسلوبی سے نبھایا۔

امامت کی فضیلت میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''روز قیامت تین قسم کے آدمی کستوری کے ٹیلوں پر ہوں گے ان میں سے ایک وہ شخص ہوگا جس نے قوم کی امامت کی اور وہ اس (امام) سے خوش تھے۔''[1]

ایک دوسری روایت میں ہے:

«لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ صَلَّى مَعَهُ»

''امام کو اس قدر اجر ملے گا جس قدر اس کے پیچھے نماز ادا کرنے والوں کو ملے گا۔''[2]

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ سے درخواست کیا کرتے تھے کہ اِجْعَلْنِي إِمَامَ قَوْمِي ''مجھے میری قوم کا امام بنا دیجیے۔''[3]

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ امامت کی فضیلت اور اجر سے واقف تھے۔ انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم اس دور میں بہت سے طلباء کو دیکھتے ہیں کہ وہ امامت کی ذمہ داری قبول کرنے میں رغبت اور شوق نہیں رکھتے بلکہ گریز اور کنارہ کشی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ محض سستی اور خیر میں رغبت کی کمی ہے جو شیطان کی طرف سے نیکی

[1] [ضعيف] جامع الترمذي، البر والصلة، باب ما جاء في فضل المملوك الصالح، حديث: 1986. [2] سنن النسائي، الأذان، باب رفع الصوت بالأذان، حديث: 647 ومسند أحمد: 4/284. [3] سنن أبي داود، الصلاة، باب أخذ الأجر على التأذين، حديث: 531.

سے محروم رکھنے کی کوشش ہے۔ ان طلباء کو چاہیے کہ وہ کوشش سے اور خوشی کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول کریں اور اللہ تعالیٰ سے اجر عظیم حاصل کریں۔ دینی طلباء دوسرے لوگوں کی نسبت امامت اور دیگر اعمال صالحہ کے زیادہ لائق ہیں۔

جب ایک شخص میں امامت کی اہلیت کی تمام خوبیاں موجود ہیں تو وہ دوسروں کی نسبت امامت کے زیادہ لائق ہے بلکہ دوسرا اہل شخص موجود نہ ہونے کی صورت میں اس کے لیے یہ فرض انجام دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

امامت کی اہلیت اور ترتیب: ① امامت کا حق دار وہ ہے جو دوسروں سے بہتر انداز میں قرآن مجید کی قراءت کر سکتا ہو، مخارج حروف سے واقف ہو، حروف کی ادائیگی میں فاش غلطیاں نہ کرتا ہو۔ تلاوت قرآن میں کسی تکلف و تصنع کے بغیر قواعد قراءت کو ملحوظ رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں نماز کے مسائل، شرائط، ارکان واجبات اور نواقض نماز کا علم رکھتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللهِ»

''لوگوں کی امامت وہ کرائے جو سب سے زیادہ قرآن مجید پڑھا ہو۔''[1]

امامت کے بارے میں جو احادیث آتی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ امامت میں مقدم وہ ہو گا جو قرآن مجید اچھے اور بہتر انداز میں پڑھتا ہو اور نماز کے مسائل سے واقف ہو۔ واضح رہے عہد نبوی میں جو شخص قرآن مجید زیادہ پڑھا ہوتا وہ دینی مسائل میں فقیہ بھی زیادہ ہوتا تھا۔

② اگر قرآن مجید کی قراءت میں سب برابر ہوں تو اس شخص کو آگے کیا جائے جو دینی مسائل سے زیادہ واقف ہو کیونکہ ایسے شخص میں قراءت قرآن اور فقہ دین دو خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ»

''اگر قراءت قرآن میں برابر ہوں تو جو سنت، یعنی علم دین کا زیادہ عالم ہے وہ امامت کا مستحق ہے۔''[2]

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نمازی کو قراءت کی نسبت دینی مسائل کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ نیز نماز سے قراءت کا تعلق محدود ہے جب کہ نماز میں پیش آنے والے عوارض غیر محدود ہیں۔

③ اگر وہ سب قراءت و فقہ میں برابر ہوں تو ہجرت جس کی قدیم ہو گی اس کو امامت کے لیے مقدم کیا جائے گا۔

---

① صحيح مسلم، الصلاة، باب من أحق بالإمامة؟ حديث:673، وصحيح البخاري، الأذان، باب إمامة العبد والمولى، قبل حديث :692. ② صحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة؟ حديث :673.

جیسا کہ حدیث میں ہے۔

«فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً»

''جب قراءت وفقہ میں برابر ہوں تو اس شخص کو امام بنایا جائے جس کی ہجرت زیادہ قدیم ہے۔''[1]

ہجرت کا مطلب کفر وشرک کے ملک کو چھوڑ کر اسلامی ملک میں منتقل ہونا ہے۔

④ اگر قراءت قرآن، فقہ دین اور ہجرت میں سب برابر ہوں تو سب سے زیادہ عمر والا امامت کے لائق ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: [وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ] ''تم میں سے بڑا شخص تمھارا امام ہے۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ عمر میں بڑا ہونا اسلام میں باعث فضیلت ہے، نیز بڑی عمر میں خشوع وخضوع زیادہ ہوتا ہے اور اس کی دعا بھی زیادہ قبول ہوتی ہے۔

مذکورہ ترتیب کی دلیل سیدنا ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ کی درج ذیل حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللهِ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِلْمًا (وَفِي رِوَايَةٍ: سِنًّا (مَكَانَ) سِلْمًا»

''(اولاً) وہ شخص قوم کی امامت کرائے جو سب سے زیادہ قرآن مجید پڑھا ہوا ہے۔ اگر وہ قراءت قرآن میں برابر ہوں تو پھر جو شخص سنت، یعنی دین کا فہم زیادہ رکھتا ہو۔ اگر وہ دینی فہم میں برابر ہوں تو جس کی ہجرت سب سے قدیم ہے، اگر ہجرت میں برابر ہوں تو جس کا ایمان مقدم ہو۔''[3] ایک روایت میں ''ایمان'' کے بجائے ''عمر'' کا ذکر ہے یعنی ''جس کی عمر زیادہ ہو۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے کتاب وسنت کا علم رکھنے والے کو سب پر فضیلت دی ہے اگر علم میں برابر ہوں تو عمل صالح میں جو سب سے بڑھ کر ہے وہ مقدم ہوگا اور اپنے اختیار کے ساتھ عمل صالح میں آگے بڑھنے والا ''مہاجر'' ہے جسے عمر رسیدہ پر ترجیح دی جائے گی۔''[4]

▲ یہاں کچھ اور بھی اعتبارات وصفات ہیں جن کے حاملین کو امامت میں حاضرین پر بہر صورت ترجیح ہوگی،

---

① صحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة؟ حديث: 673. ② صحيح البخاري، الأذان، باب من قال: ليؤذن في السفر مؤذن واحد، حديث: 628، وصحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة؟ حديث: 674. ③ صحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة؟ حديث: 673. ④ مجموع الفتاوی لشيخ الإسلام ابن تيمية: 386/23.

اگرچہ ان حاضرین میں افضل شخص بھی کیوں نہ ہو اور وہ یہ ہیں:

① مسجد کا مقرر امام (بشرطیکہ وہ امامت کی اہلیت رکھتا ہو) موجود ہو تو کسی دوسرے شخص کے لیے لائق نہیں کہ وہ مصلیٰ امامت پر کھڑا ہو اگرچہ وہ امام سے افضل ہی کیوں نہ ہو، الا یہ کہ وہ اسے اجازت دے دے۔

② گھر کا مالک اگر اہلیت رکھتا ہو تو امامت کے مصلے پر کھڑے ہونا اسی کا حق ہے، مگر یہ کہ وہ کسی دوسرے کو اجازت دے دے۔

③ سلطان، یعنی ملک کا سربراہ یا اس کا نائب موجود ہو تو امامت کے موقع پر وہی مقدم ہوگا بشرطیکہ اس میں امامت کی اہلیت ہو، مگر یہ کہ وہ کسی اور کو امامت کرنے کی اجازت دے دے۔

ان حضرات کی امامت کے استحقاق میں دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«لَا تَؤُمَّـنَّ الرَّجُلَ فِي أَهْلِهِ وَلَا فِي سُلْطَانِهِ وَلَا تَجْلِسْ عَلٰى تَكْرِمَتِهِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ»

''تو کسی شخص کا اس کے گھر میں امام نہ بن اور نہ کسی سلطان کی سلطنت میں امامت کرا، اور نہ اس کے گھر میں اس کی عزت کی جگہ پر بیٹھ، مگر اس کی اجازت کے ساتھ۔''[1]

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حدیث رسول ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ مالک مکان امامت کا زیادہ حق دار ہے اگر وہ قراءت قرآن اور دینی علم رکھتا ہے۔''[2]

اسی طرح سلطان کا مقرر کردہ امام یا اس کا نائب یا اہل مسجد جس کی امامت پر متفق ہوں تو امامت میں اس کا زیادہ حق ہے کیونکہ یہ خاص عہدہ ہے۔ ان حضرات کی موجودگی میں کسی دوسرے کا امامت کے مصلیٰ پر کھڑا ہونا بدگمانی اور نفرت کا باعث ہے۔

▲ گزشتہ بحث سے نماز کی امامت کا شرف وفضیلت اور اسلام میں اس کا مقام و مرتبہ واضح ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں نماز کا امام (دو رکعت کا امام نہیں بلکہ وہ) دینی قائد ہوتا ہے۔ امامت ایک بلند مرتبہ ہے، خیر و نیکی کی جانب مسابقت کا ذریعہ ہے۔ امام امیر کی اطاعت کرنے اور جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے کے لیے معاون ہے۔ امامت کی بدولت اللہ تعالیٰ کی مساجد آباد ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے عموم میں (جس میں اللہ کے بندوں کی دعا کا ذکر ہے) یہ مضمون بھی موجود ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

① صحيح مسلم، المساجد، باب من أحق بالإمامة؟حديث :673، وسنن أبي داود، الصلاة، باب من أحق بالإمامة؟ حديث :582. ② معالم السنن شرح سنن أبي داود للإمام الخطابي :145/1، تحت حديث: 190.

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○ ﴾

''اور وہ لوگ جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔''[1]

درحقیقت نماز کی امامت دین کی امامت ہے، بالخصوص جب کوئی امام مسجد میں حاضرین کو وعظ و نصیحت کرنے میں اپنی قوتیں کھپاتا ہو تو اس کا شمار ان خوش نصیب لوگوں میں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے ہیں جو اپنے دامنوں میں اعمال صالحہ اور اقوال طیبہ کے ذریعے سے نیکیوں کے حسین پھول سمیٹ رہے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○ ﴾

''اور اس سے زیادہ اچھی بات والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور کہے کہ میں یقیناً مسلمانوں میں سے ہوں۔''[2]

چنانچہ امامت کا عہدہ قبول کرنے سے وہی شخص اعراض و گریز کرتا ہے جو بے نصیب ہے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ.

جو شخص امامت کا مستحق نہیں

نماز کی امامت بہت بڑی دینی ذمہ داری ہے۔ جس طرح امامت کی اہلیت کے لیے مذکورہ تمام اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ امام ان عیوب اور نقائص سے مبرا ہو جو اس کے منصب کے لائق نہیں اور اس کے شایان شان نہیں۔

- فاسق شخص کو نماز کی امامت کا منصب دینا قطعاً جائز نہیں۔ واضح رہے فاسق وہ شخص ہے جو شرک کے سوا دیگر کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے دائرۂ تقویٰ واستقامت سے نکل جائے۔

فسق دو قسم کا ہوتا ہے: فسق عملی اور فسق اعتقادی۔ فسق عملی زنا، چوری کرنے، شراب پینے وغیرہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کا نام ہے، جب کہ فسق اعتقادی، عقائد میں خرابی سے لاحق ہوتا ہے جیسا کہ رافضہ، معتزلہ اور جہمیہ کے عقائد میں بگاڑ پیدا ہوا اور وہ فسق اعتقادی کے مرض کا شکار ہو گئے۔ الغرض کسی فاسق شخص پر نماز کی امامت کی ذمہ داری ڈالنا قطعاً درست نہیں کیونکہ وہ تو اس لائق بھی نہیں کہ اس کی کوئی خبر قبول کی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا

[1] الفرقان 25:74. [2] حٰمٓ السجدة 41:33.

ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾

''اے مسلمانو! اگر تمھیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو۔''[1]

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں نماز کی شرائط اور اس کے احکام میں فاسق شخص پر قطعاً اعتماد و یقین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ دوسروں کے لیے بری مثال بن جائے گا، لہٰذا دینی امور میں اسے ذمہ داری دینے میں بہت سی قباحتیں اور خرابیاں پنہاں ہیں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تَؤُمَّنَّ امْرَأَةٌ رَّجُلاً ، وَلَا يَؤُمَّ أَعْرَابِيٌّ مُّهَاجِرًا ، وَلَا يَؤُمَّ فَاجِرٌ مُّؤْمِنًا ، إِلَّا أَنْ يَّقْهَرَهُ بِسُلْطَانٍ ، يَخَافُ سَيْفَهُ وَسَوْطَهُ»

''کوئی عورت مرد کی، اعرابی مہاجر کی اور فاجر شخص مومن کی امامت نہ کرائے، سوائے اس کے کہ وہ اسے اپنے قوت وغلبہ سے مجبور کردے اور اس کی طرف سے ظلم وزیادتی کا خوف ہو۔''[2]

حدیث کے الفاظ ''فاجر شخص مومن کی امامت نہ کرائے۔'' محل شاہد ہے اور حق سے کنارہ کشی کرنے کا نام فُجور ہے۔

فاسق کے پیچھے نماز ادا کرنا ممنوع ہے، لہٰذا قوت وقدرت کے ہوتے ہوئے اسے امام بنانا قطعاً جائز نہیں، اسلامی حکومت کے ذمہ داران اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ کسی فاسق شخص کو نمازوں کا امام مقرر نہ کریں کیونکہ انھیں حکم ہے کہ وہ لوگوں کی مصلحتوں پر توجہ دیں اور عوام کو اس غلطی کے ارتکاب پر مجبور نہ کریں کہ وہ فاسق کے پیچھے کھڑے ہو کر ایسی نماز ادا کریں جو انھیں خود ناپسند ہو۔ فاسق کے پیچھے پڑھی گئی نماز کی صحت میں بھی علماء کا اختلاف ہے، جس کا یہ حال ہو اس سے بہر حال لوگوں کو بچانا چاہیے۔

▲ جو شخص رکوع، سجدہ کرنے یا بیٹھنے سے عاجز ہو اس کو امام بنانا درست نہیں الا یہ کہ مقتدی بھی رکن و شرط ادا کرنے سے (امام کی طرح) عاجز ہوں۔ اسی طرح کھڑا ہونے سے عاجز شخص کا تندرست شخص کی امامت کرانا صحیح نہیں الا یہ کہ وہ اہل مسجد کا مقرر کردہ امام ہو اور اس کی اس بیماری کے بارے میں تندرستی اور صحت کی امید ہو تو اس کی اقتدا میں نماز جائز ہے۔ اس صورت حال میں تمام مقتدی بیٹھ کر ہی نماز ادا کریں گے۔ اس بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

[1] الحجرات 49:6. [2] [ضعيف] سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب في فرض الجمعة، حديث :1081.

«صَلّٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي بَيْتِهِ وَهُوَ شَاكٍ، فَصَلّٰى جَالِسًا وَّصَلّٰى وَرَاءَهُ قَوْمٌ قِيَامًا، فَأَشَارَ إِلَيْهِمْ: أَنِ اجْلِسُوا، فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ: إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا وَإِذَا رَفَعَ فَارْفَعُوا ... وَإِذَا صَلّٰى جَالِسًا فَصَلُّوا جُلُوسًا»

''ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے تکلیف کی حالت میں گھر میں بیٹھ کر نماز شروع کی جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے پیچھے نماز میں کھڑے تھے تو آپ نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: امام اقتدا کی خاطر بنایا جاتا ہے، جب وہ رکوع کرے تب تم رکوع کرو......اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم سب اس کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھو۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ مقرر کردہ امام کو آگے کرنا یہ اس کا حق ہے جو اسے ملنا چاہیے۔ اگر مقتدی اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کریں یا کچھ کھڑے ہوں اور کچھ بیٹھے ہوئے ہوں تو صحیح قول کے مطابق ان کی نماز درست ہو گی، البتہ اگر امام کسی کو اپنا نائب بنا لے جو انھیں کھڑا ہو کر نماز پڑھائے تو یہ زیادہ بہتر ہے اور اس سے فقہاء کے اختلاف سے بھی نکل جائیں گے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کی امامت کے لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔[2]

الغرض رسول اللہ ﷺ سے دونوں صورتوں کا جواز ثابت ہے۔

- جو شخص ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس کے ساتھ اس کا وضو قائم نہیں رہتا، مثلاً: اسے سلسل البول (پیشاب کے قطرے نکلنے) یا ہوا کے خارج ہونے کا مرض لاحق ہو تو اس کی امامت درست نہیں کیونکہ اس کی نماز میں تندرست کی نسبت خلل ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں ہے۔ ایسا شخص طہارت کے منافی نجاست کے باوجود نماز ادا کر رہا ہے اس کی نماز اس کی مجبوری کی وجہ سے درست ہے، البتہ اگر اس کے مقتدی بھی ایسے ہی کسی مرض میں مبتلا ہوں تب کوئی حرج نہیں کیونکہ بیماری کی وجہ سے عذر میں سب برابر ہیں۔[3]

- اگر کسی نے ایسے شخص کے پیچھے نماز ادا کی جو بے وضو تھا یا اس کے بدن یا کپڑے یا جائے نماز پر نجاست تھی اور دونوں کو نماز سے فارغ ہونے تک اس کی خبر نہ ہوئی تو مقتدی کی نماز درست ہو گی جب کہ امام کی نہیں کیونکہ

---

① صحيح البخاري، الأذان، باب إنما جعل الإمام ليؤتم به، حديث: 688، وصحيح مسلم، الصلاة، باب ائتمام المأموم بالإمام، حديث: 412. ② صحيح البخاري، الأذان، باب حد المريض أن يشهد الجماعة، حديث: 664.

③ اس سلسلے میں دوسرا موقف یہ ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے تندرست شخص کی نماز درست ہے کیونکہ جب اس کی اپنی نماز درست ہے تو مقتدی کی نماز بھی درست ہے، دیکھیے تمام المنة للألباني، ص: 280، والسيل الجرار للشوكاني: 1/247-255. (ع۔و)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جب کوئی جنبی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ دوبارہ نماز پڑھے جبکہ مقتدی کی نماز مکمل اور صحیح ہے۔''[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''خلفائے راشدین کا یہ طریقہ تھا کہ وہ لوگوں کو نمازیں پڑھاتے، نماز کے بعد کبھی جنابت کے اثرات دیکھتے تو خود نماز کا اعادہ کر لیتے۔ باقی لوگوں کو نماز کے اعادے کا حکم نہ دیتے۔''[2]

اگر امام یا مقتدی کو دوران نماز میں عدم طہارت یا نجاست کی موجودگی کا علم ہو جائے تو ہر ایک کی نماز باطل ہوگی۔[3]

▲ ایسے ان پڑھ شخص کی امامت بھی درست نہیں جسے سورۂ فاتحہ بھی اچھی طرح حفظ نہ ہو یا حفظ تو ہو لیکن بڑی فاش غلطیاں کرتا ہو، مثلاً: ﴿إِيَّاكَ﴾ کے کاف پر زیر پڑھے یا ﴿أَنْعَمْتَ﴾ کی تا پر پیش پڑھے۔ ﴿اِهْدِنَا﴾ کے ہمزہ پر زبر پڑھتا ہو۔ یا کسی حرف کو دوسرے حرف سے بدل دے، مثلاً: ''را'' کو ''غین'' یا ''لام'' پڑھے۔ یا سین کو تا یا (شین) پڑھتا ہو۔ ان پڑھ امام کی امامت اس جیسے ان پڑھ لوگوں کے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں جبکہ وہ اس کی اصلاح نہ کر سکتے ہوں کیونکہ دونوں فریق مساوی ہیں۔ اگر ایسا ان پڑھ شخص الفاظ (قراءت) کی اصلاح کر سکتا ہو لیکن وہ کوشش ہی نہ کرے تو نہ اس کی نماز درست ہے اور نہ اس کے پیچھے ادا کرنے والے کی نماز صحیح ہے کیونکہ وہ قدرت کے باوجود ایک رکن (قراءت) کا تارک ہے۔

▲ جس شخص سے اکثر لوگوں کی ناراضی درست ہو اس کی امامت مکروہ ہے، یعنی اگر لوگ کسی کی امامت کو کسی معقول وجہ کی بنیاد پر ناپسند کرتے ہوں، مثلاً: اس میں دینی کمزوریاں ہوں تو ایسے شخص کا امامت کرانا مکروہ عمل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«ثَلَاثَةٌ لَّا تُجَاوِزُ صَلَاتُهُمْ آذَانَهُمْ: اَلْعَبْدُ الْآبِقُ حَتَّى يَرْجِعَ، وَامْرَأَةٌ بَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَلَيْهَا سَاخِطٌ، وَإِمَامُ قَوْمٍ وَّهُمْ لَهُ كَارِهُونَ»

''تین شخص ایسے ہیں کہ ان کی نماز ان کے کانوں سے اوپر نہیں جاتی: بھاگنے والا غلام جب تک وہ واپس نہ لوٹ آئے اور وہ عورت جو اس حال میں رات گزارے کہ اس کا خاوند اس پر ناراض ہو اور کسی قوم کا امام جسے وہ ناپسند کرتے ہوں۔''[4]

[1] (ضعيف جداً) سنن الدارقطني: 1/363,362، حديث: 1353,1352. [2] سنن الدارقطني: 1/363، حديث: 1357,1356، مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 23/369.

[3] بعض علماء کی رائے کے مطابق مقتدیوں کی نماز باطل نہ ہوگی، باقی رہا امام تو وہ کسی کو اپنا نائب بنا دے جو نماز مکمل کرائے اور خود الگ ہو جائے۔

[4] جامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في من أم قوما وهم له كارهون، حديث: 360.

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس امام کی نماز قبول نہیں ہوتی جسے لوگ اس کی دینی کمزوریوں کی وجہ سے ناپسند کرتے ہوں، مثلاً: اس کا جھوٹ بولنا یا کسی پر ظلم کرنا یا اس کا جاہل ہونا، یا اس کا بدعتی ہونا۔ اگر وہاں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو دینی اعتبار سے مقرر امام سے بہتر اور اچھا ہو، مثلاً: سچا ہو، عادل ہو یا عالم ہو یا دین کے علم وعمل میں زیادہ پختہ ہو تو پہلے کو امامت سے معزول کر کے پسندیدہ شخص کو امام مقرر کرنا ضروری ہے بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہ خود ہی عہدۂ امامت سے الگ ہو جائے ورنہ اس کی اپنی نماز قبول نہ ہوگی جیسا کہ حدیث میں ہے: ''تین شخص ایسے ہیں کہ ان کی نماز ان کے کانوں سے اوپر نہیں جاتی، ایک وہ امام جس کے مقتدی اسے ناپسند کرتے ہوں، دوسرا وہ شخص جو نماز کا وقت گزار کر پڑھے اور تیسرا وہ جس نے کسی آزاد آدمی کو غلام بنالیا۔''[1]

آگے چل کر شیخ الاسلام رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اگر کسی امام اور اس کے مقتدیوں کے درمیان شدید مسلکی اختلاف موجود ہو تو وہ ان کی امامت نہ کرائے کیونکہ نماز باجماعت کا مقصد لوگوں میں پیار ومحبت پیدا کر کے انھیں جوڑنا ہے توڑنا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«لَا تَخْتَلِفُوا ، فَتَخْتَلِفَ قُلُوبُكُمْ»

''نماز میں ایک دوسرے سے ہٹ کر (یا آگے پیچھے) کھڑے نہ ہوا کرو، ورنہ تمھارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔''[2]

البتہ اگر امام متدین ہو، یعنی کتاب وسنت کا حامل و عامل ہو اور لوگ اسی وجہ سے اسے ناپسند کرتے ہوں تو اس امام کے حق میں امامت مکروہ نہیں ہے، غلطی اس کی ہے جو اسے ناپسند کرے۔

بہر حال امام اور مقتدیوں کے درمیان محبت و پیار کی فضا ضروری ہے تاکہ نیکی وتقویٰ میں باہم تعاون ہو، خواہش پرستی اور شیطانی اغراض کے اتباع میں اگر کینہ وبغض پیدا ہو گیا ہو تو اسے ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ امام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں کے حقوق کا خیال رکھے، ان کو مشکل میں نہ ڈالے، ان کے جائز مطالبات کا احترام کرے۔ اسی طرح مقتدیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ امام کے حقوق کا خیال رکھیں اور اس کا نہایت احترام اور عزت کریں۔

ہر انسان سے بھول چوک اور کمی وکوتاہی ہو ہی جاتی ہے، اس لیے ایک دوسرے کو برداشت کرنا چاہیے اور ایسی معمولی کمزوری سے صرف نظر کرنا چاہیے جس سے دین ومروت میں خلل پیدا نہ ہوتا ہو۔

[1] سنن أبي داود، الصلاة، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون، حديث: 593، ومجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 373/23. [2] صحيح مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها......، حديث: 432.

وَمَنْ ذَالَّذِي تُرْضٰى سَجَايَاهُ كُلُّهَا كَفٰى الْمَرْءَ نُبْلًا أَنْ تُعَدَّ مَعَايِبُه

''بھلا ایسا کوئی شخص ہے جس کی تمام عادات واطوار سے ہر شخص خوش ہو، کسی شخص کے بڑا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس کے عیوب شمار کر لیے جائیں۔''

ہم اللہ تعالیٰ سے ہدایت اور توفیق خیر کی دعا کرتے ہیں۔

امام کی ذمہ داریاں

امام ضامن ہے، لہٰذا نماز سے متعلق اس پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھاتا ہے تو اس کے نصیب میں بہت بڑی بھلائی ہے۔

امامت کی فضیلت وعظمت لوگوں کے ہاں مشہور ومعروف امر ہے، جسے رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نے قبول کیا اور اس کے لیے بہترین افراد کو منتخب کیا۔ حدیث نبوی میں ہے:

«ثَلَاثَةٌ عَلٰى كُثْبَانِ الْمِسْكِ . . . وَرَجُلٌ أَمَّ قَوْمًا وَّهُمْ بِهِ رَاضُونَ»

''روز قیامت تین آدمی کستوری کے ٹیلوں پر ہوں گے...... ایک وہ شخص جو قوم کا امام رہا اور وہ اس پر خوش تھے۔''[1]

ایک اور روایت میں ہے:

«لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ صَلّٰى مَعَهُ»

''امام کو اس قدر اجر ملے گا جس قدر اس کے پیچھے نماز ادا کرنے والے سب مقتدیوں کو ملے گا۔''[2]

☜ جو شخص اپنے آپ کو امامت کے لائق سمجھتا ہو تو وہ اس ذمہ داری کو خود طلب کر سکتا ہے، چنانچہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی:

«اِجْعَلْنِي إِمَامَ قَوْمِي، قَالَ: أَنْتَ إِمَامُهُمْ، وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ»

''مجھے میری قوم کا امام مقرر کر دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا آج سے تو ان کا امام ہے، کمزوروں کا خیال رکھنا۔''[3]

① [ضعيف] جامع الترمذي، البر والصلة، باب ما جاء في فضل المملوك الصالح، حديث: 1986. ② سنن النسائي، الأذان، باب رفع الصوت بالأذان، حديث: 647، ومسند أحمد: 284/4. ③ سنن أبي داود، الصلاة، باب أخذ الأجر عَلَى التَّأْذِين، حديث: 531.

اس مسئلہ کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴾ ''اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔''[1]

▲ جس شخص پر امامت کی ذمہ داری عائد ہو اسے چاہیے کہ اسے پوری اہمیت دے۔ حسب استطاعت اس کا حق ادا کرے تو یقیناً اس کے لیے اس میں اجر عظیم ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے درج ذیل فرمان پر عمل کرتے ہوئے مقتدیوں کے انفرادی اور اجتماعی حالات کا خیال رکھے، انھیں پریشانی اور مشکل میں نہ ڈالے، انھیں اپنی طرف راغب کرے متنفر نہ کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الضَّعِيفَ وَالسَّقِيمَ وَالْكَبِيرَ، وَإِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهِ فَلْيُطَوِّلْ مَا شَاءَ»

''جب کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ نماز میں تخفیف کرے کیونکہ ان میں بیمار، ضعیف اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں اور جب وہ اکیلا نماز پڑھے تو حسب منشا نماز لمبی کرے۔''[2]

صحیحین میں سیدنا ابومسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان یوں ہے:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ، فَمَنْ أَمَّ النَّاسَ فَلْيَتَجَوَّزْ، فَإِنَّ خَلْفَهُ الضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ وَذَا الْحَاجَةِ»

''اے لوگو! تم میں سے بعض لوگ نفرت پیدا کرتے ہیں جو شخص لوگوں کی امامت کرائے وہ اختصار سے کام لے کیونکہ ان میں ضعیف، بوڑھے اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔''[3]

ایک صحابی کا بیان ہے:

«مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ إِمَامٍ قَطُّ أَخَفَّ صَلَاةً وَّلَا أَتَمَّ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ»

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے جس قدر مختصر اور مکمل نماز پڑھی ایسی نماز کسی اور کے پیچھے نہیں پڑھی۔''[4]

جبکہ آپ ﷺ ہی ہمارے لیے نماز وغیرہ میں نمونہ ہیں۔

---

[1] الفرقان 25:74. [2] صحيح البخاري، الأذان، باب إذا صلى لنفسه فليطول ما شاء، حديث: 703، وصحيح مسلم، الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، حديث: 467، وسنن أبي داود، حديث: 795,794. [3] صحيح البخاري، الأذان، باب من شكا إمامه إذا طول، حديث: 704، وصحيح مسلم، الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، حديث: 466. [4] صحيح البخاري، الأذان، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي، حديث: 708، وصحيح مسلم، الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، حديث: 469.

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص نماز میں رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اپنائے گا وہ اپنے مقتدیوں کو نماز لمبی ہونے کی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔''[1] نماز میں تخفیف سے مراد ایسی نماز ہے جو مختصر بھی ہو اور اس کے ارکان، واجبات اور سنن مکمل بھی ہوں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز تھی جس پر آپ ﷺ نے ہمیشگی فرمائی۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ نماز مقتدیوں کی خواہش کے مطابق ہو۔

بعض علماء کے ہاں تخفیف کا مطلب یہ ہے کہ کمال کے ادنیٰ درجے پر اکتفا ہو، مثلاً: رکوع اور سجدے میں تین تسبیحات کہی جائیں، البتہ جب کبھی مقتدیوں کی متفقہ رائے یہ ہو کہ امام انھیں لمبی نماز پڑھائے تب قیام لمبا کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اب مقتدیوں کے متنفر ہونے کا اندیشہ نہیں رہا۔

امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فقہاء کی یہ رائے کہ امام کو رکوع اور سجدے میں تین تسبیحات سے زیادہ نہیں کہنی چاہئیں، یہ رسول اللہ ﷺ کے اس عمل کے خلاف نہیں ہے کہ آپ ﷺ تین تسبیحات سے زیادہ پڑھا کرتے تھے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجر و ثواب کے حصول میں جو جذبہ تھا اس اعتبار سے یہ تعداد زیادہ نہ تھی۔''[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام نماز کی قراءت و تسبیحات کو مسنون مقدار سے زیادہ نہ کرے، البتہ موقع محل کی مناسبت سے کبھی کبھار زیادہ وقت بھی لگایا جا سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی ایسا کیا کرتے تھے۔''[3]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''علماء نے کہا ہے کہ احادیث شریفہ میں قراءت کی مقدار میں روایات کا جو اختلاف ہے ان کا تعلق مختلف احوال کی مناسبت سے ہے، یعنی آپ ﷺ مقتدیوں کی صورت حال دیکھ لیتے، نفسیات پڑھ لیتے، اگر وہ لمبا قیام چاہتے تو لمبا قیام کر لیتے اور اگر کسی عذر کی وجہ سے اختصار چاہتے تو آپ ﷺ مختصر نماز پڑھا دیتے تھے۔ کبھی لمبی نماز پڑھانے کا ارادہ ہوتا لیکن کسی بچے کے رونے کی آواز سن کر نماز مختصر کر دیتے تھے جیسا کہ روایات میں موجود ہے۔''

- امام اتنی جلدی نماز نہ پڑھائے کہ مقتدی امام کے ساتھ مسنون ارکان، مثلاً: سورۂ فاتحہ، تین تین بار تسبیحات، رکوع و سجود ادا نہ کر سکے بلکہ قراءت ٹھہر ٹھہر کر کرے اور رکوع و سجود کی تسبیحات کا موقع دے۔
- یہ بھی عمل مسنون ہے کہ امام پہلی رکعت لمبی کرے، چنانچہ سیدنا ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت کو لمبا کرتے تھے۔[4]

---

[1] فتح الباري شرح صحيح البخاري :2/260. [2] فتح الباري: 2/199، تحت الحديث: 702. [3] الفتاوى الكبرى لابن تيمية، الاختيارات العلمية، باب صلاة الجماعة: 5/347. [4] صحيح البخاري، الأذان، باب القراءة في الظهر، حديث: 759، وصحيح مسلم، الصلاة، باب القراءة في الظهر، حديث :451، 452.

▲ جب امام حالت رکوع میں ہو اور اسے محسوس ہو کہ کوئی شخص جماعت میں داخل ہو رہا ہے تو مستحب یہ ہے کہ امام رکوع کو قدرے لمبا کر دے تا کہ وہ رکوع میں شامل ہو جائے اور رکعت مل جائے یہ مقتدی کے ساتھ تعاون کی ایک صورت ہے، چنانچہ سیدنا ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُومُ فِي الرَّكْعَةِ الْأُولٰى مِنْ صَلَاةِ الظُّهْرِ حَتَّى لَا يَسْمَعَ وَقْعَ قَدَمٍ»

''رسول اللہ ﷺ ظہر کی پہلی رکعت میں تادیر کھڑے رہتے حتیٰ کہ جماعت میں داخل ہونے والوں کے قدموں کی آہٹ ختم ہو جاتی۔''[1]

لیکن یہ تب ہے جب مقتدیوں کی طبیعتوں پر انتظار گراں نہ گزرے اور زیادہ لمبا نہ ہو ورنہ انھیں نظر انداز کر دے کیونکہ جماعت میں شامل ہونے والوں کا احترام ولحاظ شامل نہ ہونے والوں سے بڑھ کر ہے۔

الغرض! امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقتدیوں کے احوال وطبائع کا خیال رکھے، مکمل اور صحیح نماز پڑھائے اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات پر عمل کرے۔ آپ ﷺ کی نصیحتوں اور اوامر کی اطاعت کرے، اس میں سب کی خیر اور بھلائی ہے۔

بعض ائمۂ مساجد امامت کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں کوتاہی برتتے ہیں، اکثر مسجد سے غیر حاضر رہتے ہیں یا حاضری میں تاخیر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے نمازیوں کو پریشانی ہوتی ہے، ان میں نفرت اور مخالفت جنم لیتی ہے حتیٰ کہ امام کی شخصیت ست اور غیر ذمہ دار لوگوں کے لیے ایک دلیل بن جاتی ہے۔ ایسے شخص کو اس غلطی سے روکیے اور سمجھائیے تا کہ وہ اپنے کام کو با قاعدگی اور بہتر انداز سے سرانجام دے، مسجد کی امامت میں بے قاعدگی چھوڑ دے۔ یا پھر راہ راست پر نہ آنے کی صورت میں اسے عہدہ امامت سے معزول کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان اعمال کی توفیق دے جو اسے محبوب اور پسند ہوں۔ آمین!

معذور افراد کی نماز کا بیان

معذور افراد سے یہاں مراد: بیمار، مسافر اور وہ شخص ہے جسے دشمن کا خوف لاحق ہو جو غیر معذور کی طرح صحیح طور

[1] [ضعيف] سنن أبي داود، الصلاة، باب القراءة في الظهر، حديث :802، ومسند أحمد:4/356. فاضل مصنف رحمہ اللہ نے جو دلیل پیش کی ہے اس سے ان کا رکوع لمبا کرنے کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا بلکہ قیام لمبا کرنا ثابت ہوتا ہے۔

پر نماز ادا نہ کر سکتا ہو۔ شارع نے ایسے افراد کو خصوصی رعایت دی ہے اور ان سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ حسب استطاعت نماز ادا کریں۔ یہ شریعت کی طرف سے ان کے لیے آسانی اور سہولت ہے تاکہ انھیں تنگی و تکلیف نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾

''اور اس نے تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں کی۔''[1]

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ ''اللہ کا ارادہ تمھارے ساتھ آسانی کا ہے، سختی کا نہیں۔''[2]

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ ''اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''[3]

نیز فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''چنانچہ جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔''[4]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

''جب میں تمھیں کوئی حکم دوں تو تم حسب استطاعت اس پر عمل کرو۔''[5]

مذکورہ نصوص شرعیہ کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں جن میں بندوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور ان پر شریعت میں آسانی و سہولت کا تذکرہ ہے۔

شریعت میں جو آسانیاں اور سہولتیں ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق ہمارے زیر بحث عنوان سے بھی ہے، اگر کسی شخص کو مرض، سفر یا خوف کا عذر لاحق ہو تو وہ کیسے نماز ادا کرے؟ لیجیے اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

① مریض کی نماز: نماز کبھی نہ چھوڑی جائے، اگر مریض ہے اور وہ کھڑا ہونے کی طاقت رکھتا ہے تو کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا اس پر لازم ہے، اگر وہ کھڑا ہونے کے لیے لاٹھی وغیرہ کا سہارا لے لے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اگر واجب کی ادائیگی کسی سہارے کے ساتھ ممکن ہو تو اس کا استعمال واجب ہے۔

* اگر مریض شخص نماز میں کھڑا ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو یا اسے کھڑا ہونے سے تکلیف اور مشکل پیش آتی ہو، یا

① الحج 78:22. ② البقرة 185:2. ③ البقرة 286:2. ④ التغابن 16:64. ⑤ صحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، حديث :1337.

کھڑا ہونے سے بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو تو وہ ان حالات میں بیٹھ کر نماز ادا کرے۔ بیٹھ کر نماز پڑھنے کے لیے صرف یہ شرط نہیں کہ اس کے لیے کھڑا ہونا ناممکن ہو (بلکہ مذکورہ حالات میں سے کوئی بھی حالت ہو تو وہ بیٹھ کر نماز ادا کر سکتا ہے)، البتہ معمولی سی تکلیف کی بنا پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا درست نہیں بلکہ اسے زیادہ اور واضح تکلیف و مشقت ہو، تب بیٹھ کر نماز ادا کرنے کی اجازت ہے۔

اہل علم کا اس امر پر اجماع ہے کہ جو شخص فرض نماز میں کھڑا ہونے سے عاجز ہے وہ جس طرح بھی سہولت کے ساتھ بیٹھ سکتا ہے اسی طرح بیٹھ کر نماز ادا کرے کیونکہ شارع علیہ السلام نے بیٹھنے میں اسے خاص صورت کے ساتھ پابند نہیں کیا وہ جس شکل میں بھی بیٹھ کر نماز ادا کرلے درست ہے۔

▲ اگر کوئی مریض بیٹھ کر بھی نماز ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا یا اسے مشکل اور تکلیف ہوتی ہو تو وہ پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھ لے۔ اس صورت میں اس کا چہرہ قبلہ کی جانب ہونا چاہیے، البتہ دائیں جانب لیٹنا افضل ہے۔ اگر وہ خود قبلہ کی طرف رخ نہ کر سکے اور کوئی دوسرا شخص بھی اس کے پاس نہ ہو جو اس کا چہرہ قبلہ کی جانب کر دے تو جس سمت کی طرف اسے سہولت ہو نماز پڑھ لے۔

▲ اگر کسی مریض کو پہلو کے بل بھی نماز ادا کرنے پر قدرت نہ ہو تو وہ پشت کے بل چت لیٹ کر نماز پڑھ لے۔ ممکن ہو تو اس کے پاؤں قبلے کی جانب ہونے چاہئیں۔

▲ اگر کوئی مریض بیٹھ کر نماز ادا کرے اور وہ زمین پر سجدہ کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو یا پہلو کے بل لیٹ کر یا پشت کے بل چت لیٹ کر نماز ادا کرے تو وہ تینوں صورتوں میں سر کے اشارے کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرے، البتہ سجدے کا اشارہ رکوع کے اشارے سے زیادہ نیچے ہونا چاہیے۔ اگر وہ زمین پر سجدہ کر سکتا ہو تو اس کا رکوع اور سجدے کے لیے جھکنا ضروری ہے، صرف اشارہ کافی نہیں۔

مذکورہ ترتیب کے ساتھ مریض کی نماز کا جواز صحیح بخاری وغیرہ کی درج ذیل حدیث سے ثابت ہوتا ہے:

«كَانَتْ بِي بَوَاسِيرُ فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الصَّلَاةِ؟ فَقَالَ: صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ»

”(سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:) مجھے بواسیر تھی، چنانچہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کی بابت سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کھڑے ہو کر نماز ادا کرو، اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھو، اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر ادا کرلو۔“[1]

[1] صحيح البخاري، التقصير، باب إذا لم يطق قاعِدًا صَلَّى على جنب، حديث: 1117 وسنن أبي داود، الصلاة، ◀◀

امام ترمذی رحمہ اللہ بعض علماء کا قول ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اگر نماز کے لیے پہلو کے بل لیٹنے کی طاقت نہ ہو تو پشت کے بل چت لیٹ کر پڑھ لو، چاہے اس کے پیر قبلے کی طرف ہوں۔'' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ ''اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''[1]

تنبیہ: بعض حضرات بیماری یا اپریشن کی وجہ سے نماز چھوڑ دیتے ہیں اور وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ وہ مکمل طور پر نماز ادا نہیں کر سکتے یا وہ وضو نہیں کر سکتے یا ان کے کپڑے ناپاک ہیں یا کوئی اور عذر پیش کرتے ہیں۔ اس بارے میں ہم کہیں گے کہ یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ کسی صورت نماز کو چھوڑنا قطعاً جائز نہیں اگرچہ وہ نماز کی بعض شرائط یا ارکان و واجبات ادا کرنے سے عاجز ہوں۔ وہ حسب حال، یعنی جیسے بھی ممکن ہو نماز ادا کر لیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''چنانچہ جہاں تک تم سے ہو سکے تم اللہ سے ڈرتے رہو۔''[2]

کوئی مریض یہ کہتا ہے کہ جب تندرست ہوں گا تو جس قدر نمازیں چھوڑوں گا ان کی قضا دے دوں گا۔ اس مسئلے میں یہ اس کی لاعلمی یا سستی کا مظہر ہے۔ جس طرح ممکن ہو نماز وقت پر پڑھی جائے، اس میں تاخیر جائز نہیں ہے۔ ہر مسلمان کو اس بارے میں باخبر رہنا چاہیے۔

ہسپتالوں میں بھی دینی مسائل و احکام بتانے اور سمجھانے کا بندوبست ضرور ہونا چاہیے تاکہ مریضوں کو ان کے احوال کے مطابق نماز اور دیگر مسائل شرعیہ کا علم ہو سکے جن کی انھیں ضرورت ہے۔

اوپر ہم نے جو مسئلہ بیان کیا ہے وہ حکم اس شخص کے حق میں ہے جس کا عذر شروع نماز سے لے کر فارغ ہونے تک قائم رہا ہو، البتہ جس شخص نے کھڑے ہو کر نماز شروع کی، پھر نماز کے دوران کھڑا ہونے سے عاجز آ گیا یا وہ آغاز نماز میں کھڑا ہونے سے عاجز تھا، پھر اس میں اثنائے نماز میں کھڑا ہونے کی قوت آ گئی یا اس نے بیٹھ کر نماز شروع کی لیکن نماز کے دوران میں بیٹھنے کی قوت بھی نہ رہی یا اس نے پہلو کے بل لیٹ کر نماز کی ابتدا کی پھر دوران نماز میں بیٹھنے کی طاقت آ گئی تو وہ شخص ان تمام حالات میں دوران نماز میں بعد والی مناسب صورت حال کو اختیار کر لے۔ شرعاً اس کے لیے یہی زیادہ مناسب اور بہتر ہے اور اسی حالت پر نماز پوری کر لے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''چنانچہ جہاں تک تم سے ہو سکے تم اللہ سے ڈرتے رہو۔'' چنانچہ جس میں کھڑے ہونے کی قوت آ گئی ہے تو بیٹھا ہوا کھڑا ہو جائے اور اگر کھڑے ہونے کی قوت نہیں رہی تو کھڑا ہوا بیٹھ

[1] جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء أن صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم، تحت حديث:372. [2] التغابن 64:16.

◀◀ باب في صلاة القاعد، حديث:952.

جائے۔اس طرح طبیعت کے مطابق نئی صورت اپنا لے۔

▲ اگر مریض میں کھڑا ہونے اور بیٹھنے کی طاقت ہے لیکن وہ رکوع یا سجدہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تو وہ کھڑا کھڑا سر جھکا کر اشارے سے رکوع کرے اور پھر بیٹھ کر سر کے اشارے سے سجدہ کرے، تاکہ حسب امکان دونوں اشاروں میں فرق ہو جائے۔

▲ اگر کوئی مریض کھڑا ہو کر نماز ادا کر سکتا ہے لیکن کسی قابل اعتماد مسلمان ڈاکٹر کا اسے مشورہ یہ ہے کہ وہ لیٹ کر نماز پڑھے ورنہ اس کا علاج یا افاقہ ممکن نہیں تو وہ شخص لیٹ کر نماز ادا کرے کیونکہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں خراش آ گئی تھی تو آپ نے بیٹھ کر ہی نماز ادا کی تھی۔[1]

اسی طرح سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے زمین پر سجدہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔[2]

اسلام میں نماز کا ایک بہت بڑا مقام ہے، ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ حالت صحت اور حالت مرض میں حسب طاقت نماز قائم کرے۔مریض کو نماز معاف نہیں لیکن وہ حسب حال اسے ادا کرے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ نماز کی اسی طرح حفاظت کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے اعمال کی توفیق دے جس میں اس کی محبت اور رضا ہو۔آمین

② سوار شخص کی نماز: وہ شخص بھی اہل عذر میں شامل ہے جو حالت سفر میں کسی چیز یا جانور پر سوار ہو اور زمین پر کیچڑ یا بارش ہونے کی وجہ سے سواری سے اتر کر نماز پڑھنے میں اسے مشکل اور تکلیف محسوس ہو یا سواری سے اترنے کے بعد دوبارہ سوار ہونے سے عاجز ہو یا سواری سے اترنے کی وجہ سے ساتھیوں سے بچھڑ جانے کا ڈر ہو یا اترنے کی صورت میں دشمن یا درندے کا خوف ہو تو ان حالات میں وہ سواری وغیرہ ہی پر نماز ادا کر لے، زمین پر اتر کر نماز پڑھنا ضروری نہیں۔

سیدنا یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ انْتَهٰى إِلٰى مَضِيقٍ هُوَ وَأَصْحَابُهُ، وَهُوَ عَلٰى رَاحِلَتِهِ، وَالسَّمَاءُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَالْبَلَّةُ مِنْ أَسْفَلَ مِنْهُمْ، فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَأَمَرَ الْمُؤَذِّنَ، فَأَذَّنَ وَأَقَامَ، ثُمَّ تَقَدَّمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلٰى رَاحِلَتِهِ، فَصَلّٰى بِهِمْ يُومِيءُ إِيمَاءً، يَجْعَلُ السُّجُودَ أَخْفَضَ مِنَ الرُّكُوعِ»

① صحيح البخاري، الأذان، باب إنما جعل الإمام ليؤتم به، حديث: 689. ② مطالب أولي النهي شرح غاية المنتهى، باب صلاة أهل الأعذار: 4/29.

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام ایک تنگ سی گھاٹی میں پہنچے، آپ اپنی سواری پر سوار تھے۔ اوپر بادل چھائے ہوئے تھے اور نیچے زمین گیلی تھی، نماز کا وقت ہو گیا تو آپ ﷺ نے مؤذن کو حکم دیا، اس نے اذان دی اور پھر اقامت کہی، رسول اللہ ﷺ سواری پر سوار ہونے کی حالت میں آگے بڑھے اور اشاروں سے نماز پڑھائی، آپ ﷺ سجدے میں رکوع کی نسبت زیادہ جھکتے تھے۔[1]

◣ جو شخص حالت عذر میں سواری پر فرض نماز ادا کرنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قبلہ کی طرف رخ کرے بشرطیکہ ایسا ممکن ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ ''اور آپ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔''[2]

اور جس قدر رکوع اور سجدہ ادا کر سکتا ہو کرے اور جس قدر اشاروں کے ذریعے سے رکوع، سجدہ اور اطمینان حاصل کر سکتا ہو وہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔''[3]

انسان کو جس عمل کی ادائیگی پر طاقت و قدرت نہیں اس کا وہ مکلّف بھی نہیں، مثلاً: مسافر شخص اگر قبلہ کی طرف رخ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تو استقبالِ قبلہ اس کے لیے لازم نہیں، وہ حسبِ حال نماز پڑھ لے۔ اسی طرح ہوائی جہاز میں بیٹھا شخص حسب استطاعت کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر مکمل رکوع و سجدہ کر کے یا اشاروں کے ساتھ جس طرح بھی ممکن ہو نماز ادا کرے، البتہ استقبال قبلہ کا خیال رکھے کیونکہ وہاں یہ ممکن ہے۔

③ مسافر کی نماز: مسافر شخص بھی اہل عذر میں شامل ہے، اس کے لیے قصر کرنا، یعنی چار رکعات والی نماز کی دو رکعتیں پڑھنا شرعاً درست ہے جیسا کہ کتاب و سنت اور اجماع سے اس مسئلے کی وضاحت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾

''جب تم سفر میں جا رہے ہو تو تم پر نمازوں کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔''[4]

نبی ﷺ نے سفر میں ہمیشہ قصر نماز ہی پڑھی ہے۔ بنا بریں جمہور علماء کے ہاں نماز کا قصر کرنا پوری پڑھنے سے افضل ہے۔ صحیحین میں روایت ہے:

«فُرِضَتِ الصَّلَاةُ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ فَأُقِرَّتْ صَلَاةُ السَّفَرِ وَزِيدَ

① [ضعيف الإسناد] جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في الصلاة على الدابة في الطين والمطر، حديث: 411، ومسند أحمد: 174,173/4 واللفظ له . ② البقرة 144:2 . ③ التغابن 16:64 . ④ النسآء 101:4 .

فِي صَلَاةِ الْحَضَرِ»

''حضر و سفر میں نماز دو دو رکعت فرض کی گئی تھی، پھر سفر کی نماز قائم رکھی گئی اور حضر (اقامت) کی بڑھا دی گئی۔''[1]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«صَلَاةُ السَّفَرِ رَكْعَتَانِ . . . تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ»

''سفر کی نماز دو رکعتیں ہیں...... یہ مکمل نماز ہے قصر نہیں۔''[2]

▲ نماز کی قصر تب شروع ہو گی جب مسافر اپنے شہر کی آبادی سے نکل جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قصر کی رعایت اس شخص کو دی ہے جو سفر طے کرے۔ شرعاً اور عرف عام میں اپنے شہر سے نکلنے سے پہلے وہ سفر طے کرنے والا نہیں کہلاتا، اس لیے وہ مسافر نہیں۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کے لیے باہر دور نکل جاتے، تب قصر کرتے تھے۔ علاوہ ازیں سفر کا لفظ ''اِسْفَار'' سے ہے جس کے معنی ''صحرا کی طرف نکلنا'' ہے، لہٰذا جب تک کوئی شخص بستی کے گھروں کی حد سے نکل کر صحرا یا میدان تک نہ پہنچ جائے تب تک وہ مسافر نہیں کہلاتا۔

▲ اگر کوئی شخص کسی جگہ بار بار آتا جاتا ہے تو وہ قصر نماز ہی پڑھے گا جیسا کہ ڈاکیا یا ٹیکسی ڈرائیور وغیرہ جو اکثر اوقات مختلف شہروں میں بار بار آتے جاتے ہیں۔

▲ مسافر کے لیے ظہر اور عصر اسی طرح مغرب اور عشاء دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کر کے ادا کرنا جائز ہے۔ جس طرح مسافر کے لیے قصر کرنا جائز ہے، اسی طرح جمع کرنا بھی جائز ہے، البتہ جمع کی یہ رخصت عارضی ہے اس پر عمل ضرورت کے وقت ہو گا، مثلاً: کسی مسافر کو منزل پر پہنچنے کی جلدی ہو جیسے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ أَنْ تَزِيغَ الشَّمْسُ أَخَّرَ الظُّهْرَ حَتَّى يَجْمَعَهَا إِلَى الْعَصْرِ فَيُصَلِّيهِمَا جَمِيعًا، وَإِذَا ارْتَحَلَ بَعْدَ زَيْغِ الشَّمْسِ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا ثُمَّ سَارَ، وَكَانَ إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ الْمَغْرِبِ أَخَّرَ الْمَغْرِبَ حَتَّى يُصَلِّيَهَا مَعَ الْعِشَاءِ وَإِذَا ارْتَحَلَ بَعْدَ الْمَغْرِبِ عَجَّلَ الْعِشَاءَ فَصَلَّاهَا مَعَ الْمَغْرِبِ»

[1] صحيح البخاري، التقصير، باب يقصر إذا خرج من موضعه، حديث: 1090، وصحيح مسلم، كتاب و باب صلاة المسافرين وقصرها، حديث: 685 واللفظ له. [2] مسند أحمد: 37/1.

''نبی ﷺ غزوہ تبوک کے سفر میں تھے، جب آپ ﷺ سورج ڈھلنے سے پہلے کوچ کرتے تو ظہر کو مؤخر کر لیتے حتیٰ کہ اسے عصر سے ملا کر پڑھتے۔ اگر سورج ڈھلنے کے بعد کوچ کرتے تو ظہر اور عصر دونوں نمازیں پڑھ کر روانہ ہوتے۔ اگر آپ غروب شمس سے پہلے سفر کرتے تو نماز مغرب مؤخر کر کے نماز عشاء کے ساتھ پڑھتے اور اگر آپ غروب شمس کے بعد سفر شروع کرتے تو مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں اکٹھی ادا کر لیتے۔''[1]

▲ جب کوئی مسافر دوران سفر میں آرام کرنے کی خاطر کہیں ٹھہر جائے تو اگر وہ جمع کرنے کی بجائے ہر نماز اپنے اپنے وقت پر قصر کر کے ادا کرے تو یہ اس کے حق میں افضل اور بہتر ہے۔

▲ اگر کسی مریض کو اپنے اپنے وقت پر نماز ادا کرنے سے تکلیف و مشقت پیش آتی ہو تو ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو جمع کرنا اس کے لیے بھی جائز ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''نمازوں کو جمع کرنے کی رخصت امت کی مشقت ختم کرنے کی خاطر ہے کہ انھیں جب ضرورت ہو تو جمع کر لیں۔ اس مضمون کی تمام احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ تنگی و تکلیف کے موقع پر ایک وقت میں دو نمازیں جمع کر کے پڑھی جا سکتی ہیں۔ الغرض! جب ترک جمع میں حرج ہو تب جمع بَین الصلا تین مباح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ سے تنگی و تکلیف اٹھا دی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جب مرض میں الگ الگ نماز ادا کرنے میں حرج و تکلیف ہو تو اس میں بھی دو نمازیں جمع کر کے ادا کرنا بطریق اولیٰ جائز ہے۔''[2]

نیز امام موصوف فرماتے ہیں: ''مریض حضرات نمازیں جمع کر سکتے ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے مستحاضہ عورت کے لیے دو دو نمازیں جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔''[3]

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہر نماز کے وقت طہارت حاصل کرنے سے عاجز ہے، مثلاً: پیشاب کے قطروں کا آنا، کسی زخم سے خون کا مسلسل رسنا، نکسیر کا دائمی پھوٹنا وغیرہ تو (مستحاضہ پر قیاس کرتے ہوئے) ایسا شخص نمازیں جمع کر سکتا ہے۔ چنانچہ جب سیدہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے استحاضہ کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

① سنن أبي داود، صلاة السفر، باب الجمع بين الصلاتين، حديث: 1220، وجامع الترمذي، الجمعة، باب ما جاء في الجمع بين الصلاتين، حديث: 553. ② مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 84/24. ③ مجموع الفتاوى: 26/24.

«وَإِنْ قَوِيتِ عَلَى أَنْ تُؤَخِّرِي الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِي الْعَصْرَ فَتَغْتَسِلِينَ، ثُمَّ تُصَلِّينَ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا، ثُمَّ تُؤَخِّرِينَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِينَ الْعِشَاءَ ثُمَّ تَغْتَسِلِينَ وَتَجْمَعِينَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ فَافْعَلِي»

''اگر تجھ میں طاقت ہو تو ظہر کو مؤخر کر اور عصر میں جلدی کر، پھر غسل کر کے ظہر اور عصر کو جمع کر کے پڑھ لے، اسی طرح تو مغرب کو لیٹ کر اور عشاء میں جلدی کر، پھر غسل کر کے دونوں نمازیں جمع کر کے پڑھ لے۔''[1]

جب اس قدر بارش ہو کہ کپڑے بھیگ جائیں اور مسجد میں آنے جانے میں مشقت ہو تو مغرب اور عشاء کو جمع کر کے ادا کرنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بارش کی رات مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھا تھا۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہما نے بھی کیا تھا۔[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگرچہ بارش رک چکی ہو لیکن بہت زیادہ کیچڑ ہو یا تاریک رات میں شدید ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو یا اس قسم کی کوئی اور تکلیف دہ صورت حال ہو تو نمازیں جمع کرنی جائز ہیں اور یہ گھر میں نماز ادا کرنے سے بہتر ہے کیونکہ گھروں میں نماز پڑھنے سے ترک جماعت لازم آتی ہے جو بدعت ہے اور خلاف سنت ہے۔ جبکہ سنت یہ ہے کہ نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی جائے اور یہ گھر میں نماز ادا کرنے سے بہتر ہے اور اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ لہٰذا مسجد میں نمازوں کو جمع کر لینا گھروں میں نماز ادا کرنے سے کہیں بہتر اور افضل ہے۔ اس پر ائمہ کرام کا اجماع ہے جو جمع بین الصلاتین کے قائل ہیں، ان میں امام مالک، شافعی اور احمد رحمۃ اللہ علیہم معروف ہیں۔''[3]

جس شخص کے لیے نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے اس کے حق میں افضل صورت وہ ہے جو موقع و محل کے مناسب ہو وہ جمع تاخیر کی صورت ہو یا جمع تقدیم کی۔ مقام عرفہ میں ظہر اور عصر کی نمازوں میں جمع تقدیم افضل ہے جب کہ مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازوں میں جمع تاخیر والی صورت افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عرفہ میں ظہر کے فوراً بعد وقوف کرنا تھا، اس لیے عصر کو مقدم کر لیا جب کہ غروب آفتاب کے فوراً بعد مزدلفہ کی طرف روانہ ہونا تھا، اس لیے مغرب کو مؤخر کر لیا۔ الغرض! عرفہ اور مزدلفہ میں دو دو نمازیں جمع کرنا مسنون ہے اور دیگر مقامات میں بوقت ضرورت جائز ہے۔

[1] سنن أبي داود، الطهارة، باب إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة، حديث: 287، ومسند أحمد: 439/6 واللفظ له.

[2] یہ روایات ہمیں نہیں ملیں۔ (ع۔و) [3] مجموع الفتاوی لشیخ الإسلام ابن تیمیة: 30،29/24.

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عرفہ اور مزدلفہ میں نمازیں جمع کرنا سنت ہے اور دیگر مقامات پر ضرورت کے پیش نظر مباح ہے، البتہ جب مسافر کو کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو افضل یہ ہے کہ وہ ہر نماز وقت پر ادا کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایام حج میں عرفہ اور مزدلفہ کے علاوہ کسی مقام پر نمازوں کو جمع کر کے نہیں پڑھا تھا۔ منیٰ میں بھی نمازیں جمع نہیں کیں کیونکہ وہاں آپ ﷺ آرام وسکون سے ٹھہرے ہوئے تھے اور کوئی جلدی نہ تھی۔ آپ ﷺ تب نمازیں جمع کرتے جب سفر میں جلدی ہوتی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو مفید علم کے حصول اور نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

④ نماز خوف: نماز خوف ہر جنگ میں جو کفار سے ہو یا باغیوں سے یا اسلامی حکومت کے ساتھ لڑنے والوں سے ہو، جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

''(تم پر نمازوں کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں) اگر تمھیں ڈر ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے۔''[1]

اس آیت کریمہ کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کفار کے علاوہ اور کون ہیں جن سے جنگ کرنا جائز ہے۔ واضح رہے جو جنگ شرعاً حرام ہے، اس میں نماز خوف جائز نہیں۔

نماز خوف کی مشروعیت کی دلیل کتاب وسنت اور اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَاۗىِٕكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ﴾

''اور (اے نبی!) جب آپ ان میں ہوں اور ان کے لیے نماز کھڑی کریں تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمھارے ساتھ اپنے ہتھیار لیے کھڑی ہو، پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو یہ ہٹ کر تمھارے پیچھے آ جائیں اور وہ دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آ جائے اور تیرے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لیے رہیں۔''[2]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ سے نماز خوف کی چھ یا سات صورتیں منقول ہیں جو تمام کی تمام (موقع محل کی مناسبت سے) جائز ہیں۔''[3]

نماز خوف رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مشروع ہوئی جو تا قیامت قائم رہے گی۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمۂ کرام رحمہم اللہ

① النسآء 4:101. ② النسآء 4:102. ③ المغني والشرح الكبير :2/264، ونيل الأوطار :3/360.

سب کا اجماع ہے، ماسوا ان چند افراد کے جو کسی گنتی میں نہیں ہیں۔

سفر ہو یا حضر، جس وقت بھی دشمن کے حملے کا خطرہ ہو نماز خوف درست ہے۔ چونکہ اس نماز کا سبب خوف ہے سفر نہیں، لہذا حضر و اقامت میں نماز خوف کی رکعات کی تعداد میں قصر نہ ہوگی، البتہ اس کی ہیئت اور طریقہ ادائیگی میں تبدیلی برقرار رہے گی، ہاں سفر میں جب نماز خوف ادا ہوگی تو قصر بھی ہوگی اور طریقہ بھی بدل جائے گا۔

نماز خوف کی دو شرطیں ہیں:

① دشمن ایسا ہو جس سے لڑنا شرعاً جائز ہو۔

② حالت نماز میں اس کے حملے کا خطرہ موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾

''(تم پر نمازوں کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں) اگر تمھیں ڈر ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے۔''[1]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿وَدَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِکُمْ وَ اَمْتِعَتِکُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْکُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً﴾

''کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے بے خبر ہو جاؤ تو وہ تم پر اچانک دھاوا بول دیں۔''[2]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے نماز خوف کا وہ طریقہ پسند کیا ہے جو سیدنا سہل بن ابی حثمہ انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے[3] کیونکہ وہ طریقہ قرآن مجید کے بیان کردہ طریقے کے قریب ترین ہے کیونکہ اس میں جنگ اور نماز دونوں میں احتیاط کا پہلو پیش نظر رہتا ہے، نیز اس میں دشمن پر دباؤ برقرار رہتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر اسے ہی اپنایا تھا۔ اس طریقہ کی تفصیل درج ذیل ہے:

«أَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهُ وَطَائِفَةٌ وُجَاهَ الْعَدُوِّ، فَصَلّٰى بِالَّتِي مَعَهُ رَكْعَةً، ثُمَّ ثَبَتَ قَائِمًا وَّأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ انْصَرَفُوا فَصَفُّوا وُجَاهَ الْعَدُوِّ، وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الْأُخْرٰى فَصَلّٰى بِهِمُ الرَّكْعَةَ الَّتِي بَقِيَتْ مِنْ صَلَاتِهِ، ثُمَّ ثَبَتَ جَالِسًا وَّأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ»

① النسآء 4:101. ② النسآء 4:102. ③ المغني والشرح الكبير 2:264/2.

''مسلمانوں کا ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے صف بندی کر کے کھڑا ہو گیا، جب کہ دوسرا گروہ دشمنوں کے سامنے رہا جو گروہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے تھا آپ نے انھیں ایک رکعت پڑھائی، پھر آپ ﷺ قیام میں کھڑے رہے جب کہ پیچھے والوں نے ایک اور رکعت خود پڑھ لی، یوں وہ دو رکعت مکمل کر کے دشمن کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ پھر دوسرا گروہ آیا، آپ ﷺ نے انھیں بھی ایک رکعت پڑھائی اور پھر آپ ﷺ تشہد کے لیے بیٹھ گئے (اور بیٹھے رہے)، اس دوسرے گروہ نے خود ہی ایک رکعت ادا کی اور پھر وہ بھی تشہد کے لیے بیٹھ گئے اور پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ ہی سلام پھیر دیا۔''[1]

▲ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نماز خوف کا طریقہ اس طرح مروی ہے:

«شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ صَلَاةَ الْخَوْفِ، فَصَفَّنَا صَفَّيْنِ، صَفٌّ خَلْفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَالْعَدُوُّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، فَكَبَّرَ النَّبِيُّ ﷺ وَكَبَّرْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَكَعَ وَرَكَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ وَرَفَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُودِ وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِي نَحْرِ الْعَدُوِّ، فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ ﷺ السُّجُودَ وَقَامَ الصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، انْحَدَرَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ بِالسُّجُودِ، وَقَامُوا، ثُمَّ تَقَدَّمَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ، وَتَأَخَّرَ الصَّفُّ الْمُقَدَّمُ، ثُمَّ رَكَعَ النَّبِيُّ ﷺ وَرَكَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ وَرَفَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُودِ وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ الَّذِي كَانَ مُؤَخَّرًا فِي الرَّكْعَةِ الْأُولَى، وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِي نُحُورِ الْعَدُوِّ، فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ ﷺ السُّجُودَ وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، انْحَدَرَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ بِالسُّجُودِ فَسَجَدُوا، ثُمَّ سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ وَسَلَّمْنَا جَمِيعًا»

''(وہ فرماتے ہیں:) میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، آپ ﷺ نے ہماری دو صفیں بنائیں جب کہ دشمن ہمارے اور قبلہ کے درمیان تھا، رسول اللہ ﷺ نے تکبیر کہی، ہم نے بھی تکبیر کہی۔ آپ ﷺ رکوع میں گئے اور ہم بھی رکوع میں چلے گئے، آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا تو ہم سب نے بھی رکوع سے سر اٹھایا، پھر آپ ﷺ اور آپ ﷺ سے پیچھے والی، یعنی پہلی صف سجدے میں چلی گئی جب کہ دوسری صف دشمن کی

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرقاع، حديث : 4129، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الخوف، حديث :842.

طرف رخ کیے ہوئے کھڑی رہی۔ جب رسول اللہ ﷺ اور پہلی صف والے سجدے کر کے کھڑے ہو گئے تو پھر پچھلی صف والوں نے خود ہی سجدے کیے اور وہ بھی کھڑے ہو گئے۔ پھر پچھلی صف آگے اور اگلی صف پیچھے ہو گئی۔ آپ ﷺ نے رکوع کیا تو ہم سب نے رکوع کیا۔ آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا تو ہم سب نے رکوع سے سر اٹھایا، پھر آپ ﷺ اور آپ ﷺ سے پیچھے والی صف (جو پہلی رکعت میں مؤخر تھی) نے سجدہ کیا جب کہ دوسری صف دشمن کے سامنے کھڑی رہی، جب آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ والی صف سجدے کر کے بیٹھ گئی تو پچھلی صف نے خود سجدے کر لیے، پھر آپ ﷺ نے اور ہم سب نے اکٹھے سلام پھیر دیا۔''[1]

▲ نماز خوف کا ایک طریقہ وہ بھی ہے جو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ صَلّٰی بِإِحْدَی الطَّائِفَتَيْنِ، وَالطَّائِفَةُ الْأُخْرٰی مُوَاجِهَةُ الْعَدُوِّ، ثُمَّ انْصَرَفُوا فَقَامُوا فِي مَقَامِ أَصْحَابِهِمْ، فَجَاءَ أُولٰئِكَ فَصَلّٰی بِهِمْ رَكْعَةً ثُمَّ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ، ثُمَّ قَامَ هٰؤُلَاءِ فَقَضَوْا رَكْعَتَهُمْ وَقَامَ هٰؤُلَاءِ فَقَضَوْا رَكْعَتَهُمْ»

''رسول اللہ ﷺ نے ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھائی جب کہ دوسرا گروہ دشمن کے سامنے کھڑا رہا۔ پہلا گروہ ایک رکعت پڑھ کر دوسرے گروہ کی جگہ، یعنی دشمن کے سامنے جا کھڑا ہوا، پھر دوسرا گروہ آیا، آپ ﷺ نے انھیں بھی ایک رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ ہر گروہ نے اپنے طور پر ایک ایک رکعت خود ادا کر لی۔''[2]

▲ نماز خوف کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ امام ہر گروہ کو الگ الگ کر کے دو دو رکعتیں پڑھا دے۔[3]

▲ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نماز خوف کا ایک اور طریقہ بھی منقول ہے، وہ فرماتے ہیں: ''ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ''ذات الرقاع'' میں تھے۔ نماز کے لیے اذان دی گئی تو آپ ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، پھر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ پھر آپ ﷺ نے دوسرے گروہ کو بھی دو رکعتیں پڑھائیں۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی چار رکعات ہو گئیں جب کہ لوگوں کی دو دو رکعتیں ہوئیں۔[4]

[1] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الخوف، حديث: 840. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرقاع، حديث: 4133، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الخوف، حديث: 839. [3] سنن أبي داود، صلاة السفر، باب من قال: يصلي بكل طائفة ركعتين، حديث: 1248، وسنن النسائي، صلاة الخوف، حديث: 1552، ومسند أحمد: 39/5و49. [4] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرقاع، حديث: 4136، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة الخوف، حديث: 843.

- یہ تمام صورتیں تب اختیار کی جائیں جب جنگ جاری نہ ہو۔ اگر جنگ جاری ہو، تندو تیز حملے ہو رہے ہوں، شمشیر وسناں کا عام استعمال ہو رہا ہو اور نماز خوف کی مذکورہ صورتوں میں سے کوئی بھی ممکن نہ ہو، نماز کا وقت بھی ہو چکا ہو تو حسب حال جیسے بھی ممکن ہو، کوئی سوار ہو یا پیدل، کسی کا قبلہ کی طرف رخ ہو یا نہ ہو نماز ادا کر لیں۔ رکوع اور سجدے کے لیے حسب طاقت اشاروں سے کام لیں لیکن تاخیر نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾

''پھر اگر تمھیں خوف ہو تو پیدل ہی سہی یا سوار ہی سہی۔''[1]

- بہتر یہ ہے کہ نماز خوف میں مسلمان دفاع کے لیے ضرورت کے مطابق ہلکا پھلکا اسلحہ ضرور اٹھا کر رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ﴾ ''اور وہ اپنے ہتھیار لیے رہیں۔''[2]

- اگر کوئی شخص دشمن یا سیلاب یا درندے سے جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہو یا کوئی مجاہد دشمن کے تعاقب میں ہو اور اس کے نکل جانے کا ڈر ہو تو وہ بھی سوار ہو یا پیدل، اسی حالت میں نماز ادا کر لے، قبلہ کی طرف رخ ہو یا نہ ہو، رکوع اور سجدہ کے لیے مناسب حال اشارہ کر لے۔

نماز خوف کی ان عجیب وغریب صورتوں اور اس دقیق منصوبہ بندی سے اسلام میں نماز کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ اسی طرح نماز باجماعت کی اہمیت بھی نمایاں ہوتی ہے کہ ان مشکل حالات میں بھی دونوں چیزیں معاف نہ ہوئیں۔ اس سے شریعت اسلامیہ کے کمال کا بھی ہمیں علم ہوتا ہے کہ اس کے احکام کس قدر مناسب حال ہیں کہ امت کو تنگی ومشکل میں بھی نہیں ڈالا گیا۔ یقیناً یہی شریعت ہر زمان ومکان کے لیے اپنے اندر خیر واصلاح کا ایک کامل نظام رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق دے اور اسی پر زندگی کا خاتمہ کرے۔ بے شک وہ دعا کو سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

نماز جمعہ کے احکام

جمعہ کے معنی ''اکٹھا ہونے'' کے ہیں۔ چونکہ اس روز مساجد میں بہت سے لوگ جمع اور اکٹھے ہوتے ہیں، اس لیے اس روز کو ''جمعہ'' کہتے ہیں۔ یہ دن سات دنوں میں سب سے افضل دن ہے، چنانچہ ایک روایت ہے کہ

[1] البقرۃ 239:2. [2] النسآء 102:4.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَفْضَلِ أَيَّامِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ»

''جمعۃ المبارک کا دن تمھارے دنوں میں سے افضل دن ہے۔''①

نیز فرمایا:

«نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، بَيْدَ أَنَّهُمْ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، ثُمَّ هٰذَا يَوْمُهُمُ الَّذِي فُرِضَ عَلَيْهِمْ فَاخْتَلَفُوا فِيهِ فَهَدَانَا اللّٰهُ لَهُ فَالنَّاسُ لَنَا فِيهِ تَبَعٌ»

''ہم (دنیا میں) آخر میں آئے ہیں لیکن قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے، باوجودیکہ یہود ونصاریٰ کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی۔ یہ دن (جمعہ) اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا لیکن انھوں نے اختلاف کرتے ہوئے اسے قبول نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہماری راہنمائی کی (تو ہم نے قبول کرلیا)، لہٰذا یہ لوگ اس دن کی وجہ سے ہم سے پیچھے ہیں۔''②

نیز صحیح مسلم میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَضَلَّ اللّٰهُ عَنِ الْجُمُعَةِ مَنْ كَانَ قَبْلَنَا، فَكَانَ لِلْيَهُودِ يَوْمُ السَّبْتِ وَكَانَ لِلنَّصَارٰى يَوْمُ الْأَحَدِ، فَجَاءَ اللّٰهُ بِنَا، فَهَدَانَا اللّٰهُ لِيَوْمِ الْجُمُعَةِ»

''اللہ تعالیٰ نے ہم سے پہلے لوگوں (یہود ونصاریٰ) کو جمعہ کے بارے میں (اختلاف کرنے کی وجہ سے) راہ راست پر نہ رکھا۔ تب یہود کے لیے ہفتہ کا دن مقرر ہوا اور عیسائیوں کے لیے اتوار کا دن متعین ہوا جب اللہ تعالیٰ ہمیں لایا تو ہمیں جمعہ کے دن کی راہنمائی فرمائی۔''③

اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے روز مسلمانوں پر یہ اجتماع اس لیے مقرر کیا تا کہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے جو عظیم انعامات ہیں ان سے آگاہ ہوں اور پھر اس روز ''خطبہ'' مقرر فرمایا تا کہ لوگوں کو ان انعامات کی یاد دہانی کروائی جائے اور انھیں ان انعامات کا شکریہ ادا کرنے کی رغبت دلائی جائے۔ اور اسی طرح دن کے وسط میں نماز جمعہ فرض کی تا کہ ایک شہر کے لوگ ایک جگہ عظیم اجتماع کی شکل میں اکٹھے ہوسکیں۔

① صحيح مسلم، الجمعة، باب فضل يوم الجمعة، حديث: 854، وسنن أبي داود، الصلاة، باب فضل يوم الجمعة، حديث: 1047، وسنن النسائي، الجمعة، باب إكثار الصلاة على النبي ﷺ يوم الجمعة، حديث: 1375 واللفظ له. ② صحيح البخاري، الجمعة، باب فرض الجمعة، حديث: 876، وصحيح مسلم، الجمعة، باب هداية هذه الأمة ليوم الجمعة، حديث: 855. ③ صحيح مسلم، الجمعة، باب هداية هذه الأمة ليوم الجمعة، حديث: 856.

اللہ رب العزت نے اہل ایمان کو اس اجتماع میں حاضر ہونے، خطبہ سننے اور نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔ یہ تمھارے حق میں بہت ہی بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جمعہ کے دن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ اس کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے اسے سب سے افضل دن تسلیم کیا جائے۔ اور اس دن اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ خاص عبادات (نمازِ جمعہ وغیرہ) ادا کی جائیں۔ اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا جمعہ کا دن افضل ہے یا عرفہ کا دن؟ اس میں دو قول ہیں اور وہ دونوں ہی امام شافعی کے شاگردوں کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اس روز فجر کی نماز میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی قراءت کیا کرتے تھے''۔[2]

آگے چل کر امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا کہ نبی ﷺ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کو اس لیے پڑھتے تھے کہ جمعہ کے روز جو ہوا یا ہوگا اس کا ذکر ان سورتوں میں ہے۔ یعنی اس میں تخلیق آدم، قیامت اور حشر ونشر کا بیان ہے اور یہ جمعے کے دن ہوگا، لہٰذا ان کی تلاوت سے امت کو ان عظیم واقعات پر تذکیر وتنبیہ ہو جاتی ہے۔''[3]

▲ یوم جمعہ کی درج ذیل خصوصیات ہیں:

① جمعہ کی رات اور دن میں نبی ﷺ پر کثرت سے درود شریف پڑھنا مستحب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَكْثِرُوا الصَّلَاةَ عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلَيْلَةَ الْجُمُعَةِ»

''جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو۔''[4]

② جمعہ کے دن ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس روز ایک ایسی نماز مقرر کی گئی ہے کہ فرائض اسلام میں اس کی بہت تاکید ہے اور مسلمانوں کے اسلامی اجتماعات میں اس کی بہت اہمیت ہے جو شخص سستی سے اسے چھوڑ دے گا،

① الجمعة 62:9. ② زاد المعاد :375/1. ③ زادالمعاد:375/1. ④ السنن الكبرى للبيهقي، الجمعة، باب ما يؤمر به في ليلة الجمعة ويومها من كثرة الصلاة على رسول الله ﷺ :249/3.

اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر ثبت کر دے گا۔

③ جمعہ کے روز غسل کرنا سنت مؤکدہ ہے جب کہ بعض علماء کے ہاں مطلقاً واجب ہے (اور یہی راجح ہے) اور بعض علماء کے نزدیک اس شخص پر واجب ہے جس کے کپڑوں یا بدن سے بدبو آ رہی ہو۔

④ جمعہ کے روز خوشبو کا استعمال مستحب ہے اور دوسرے دنوں میں خوشبو استعمال کرنے کی نسبت زیادہ ثواب ہے۔

⑤ یہ بھی مستحب ہے کہ جمعہ کے روز ادائیگی جمعہ کے لیے مسجد میں جلدی پہنچا جائے تاکہ خطبہ کے لیے امام کے نکلنے سے پہلے پہلے زیادہ سے زیادہ نوافل، ذکر اور تلاوت قرآن مجید کی جا سکے۔

⑥ خطبہ سننے والے شخص پر لازم ہے کہ خاموشی اختیار کرے۔ اگر اس نے خاموشی کو توڑا تو اس نے لغو کا ارتکاب کیا، ایسے شخص کا جمعہ ہی نہیں ہوتا، لہٰذا بوقت خطبہ کسی سے کلام کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ، فَهُوَ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا، وَالَّذِي يَقُولُ لَهُ: أَنْصِتْ، لَيْسَ لَهُ جُمُعَةٌ»

''امام جب خطبہ دے رہا ہو تو جو کوئی گفتگو کرے تو وہ گدھے کی مانند ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو (جس کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا) اور جس نے اس (گفتگو کرنے والے) کو خاموش رہنے کا کہا تو اس کا بھی جمعہ نہیں۔''[1]

⑦ جمعۃ المبارک کے دن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس روز ''سورۂ کہف'' پڑھنے کی تاکید ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جس شخص نے جمعہ کے دن ''سورۂ کہف'' کی تلاوت کی اس کے قدم کے نیچے سے ایک نور نکل کر آسمان کی طرف چڑھے گا جو روز قیامت اس کے لیے روشنی کا کام دے گا۔ علاوہ ازیں اس کے دو جمعوں کے درمیان گناہ معاف ہو جائیں گے۔''[2]

⑧ روزِ جمعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایک گھڑی دعا کی قبولیت کی ہوتی ہے، چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جمعۃ المبارک کا ذکر کیا تو فرمایا:

«فِيهِ سَاعَةٌ لَّا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُّسْلِمٌ وَّهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّي يَسْأَلُ اللهَ شَيْئًا إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ، وَأَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا»

''جمعہ کے دن ایک ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس میں کوئی مسلمان بندہ کھڑا نماز ادا کر رہا ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ

① [ضعيف] مسند أحمد: 230/1، ومشكاة المصابيح بتحقيق الألباني: حديث: (17) 1397. ② تفسير ابن كثير، تفسير سورة الكهف: 97/3.

سے جو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز ضرور عطا کرے گا۔ راوی بیان کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ وقت بہت کم ہے۔‘‘[1]

⑨ اس روز کی ایک خصوصیت خطبہ جمعہ بھی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی ثنا اور بزرگی و شان بیان ہوتی ہے، اس کی وحدانیت کی شہادت دی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا تذکرہ ہوتا ہے اور بندوں کو وعظ و نصیحت کی جاتی ہے۔

اس روز کی اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں، چنانچہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب زاد المعاد میں ایک سو تینتیس (133) خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔

ان فضائل و خصوصیات کے باوجود بہت سے لوگ اس دن کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کر جاتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان کے ہاں اس دن کی شان اور عظمت ہفتہ کے دوسرے تمام دنوں سے بڑھ کر ہوتی لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہے بلکہ بعض بے نصیب اس عظیم دن کو سونے اور آرام کرنے کا دن خیال کرتے ہیں۔ بعض لوگ لہو ولعب میں اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غفلت میں یہ دن ضائع کر دیتے ہیں حتیٰ کہ اس روز فجر کی نماز میں نمازیوں کی تعداد میں واضح کمی دیکھنے میں آتی ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

- جمعہ کے دن مسجد میں جلدی جانا مستحب ہے، جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو ’’تحیۃ المسجد‘‘ کی دو رکعتیں ضرور پڑھے۔
- مسجد میں جلدی آ جانے کی صورت میں جس قدر زیادہ سے زیادہ نوافل ادا کر سکتا ہو، ادا کرے۔ سلف صالحین کا یہی طریقہ تھا کہ وہ جمعہ کی ادائیگی کے لیے جلد ہی مسجد میں پہنچ جایا کرتے تھے اور امام کے منبر کی طرف نکلنے سے پہلے پہلے کثرت سے نوافل پڑھ لیا کرتے تھے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’اور بہتر یہ ہے کہ جو شخص ادائیگی جمعہ کے لیے مسجد میں جلدی آ جائے تو وہ امام کے نکلنے تک نفل نماز یا ذکر میں مشغول رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ادائیگی نوافل کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ ’’پھر وہ حتی المقدور نماز پڑھے۔‘‘[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی اسی پر عمل تھا کہ جب وہ ادائیگی جمعہ کے لیے تشریف لاتے تھے تو حسب توفیق نوافل ادا کرتے تھے۔ کوئی دس رکعات پڑھتا تو کوئی بارہ رکعات ادا کرتا، کوئی آٹھ اور کوئی اس سے کم پڑھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور علمائے کرام کا یہ مسلک ہے کہ جمعۃ المبارک کا خطبہ شروع ہونے سے قبل کوئی مقرر سنت مؤکدہ نہیں، البتہ نوافل ہیں جن کی تعداد مقرر نہیں جتنے بھی

① صحيح البخاري، الجمعة، باب الساعة التي في يوم الجمعة، حديث: 935، وصحيح مسلم، الجمعة، باب في الساعة التي في يوم الجمعة، حديث: 852. ② صحيح البخاري، الجمعة، باب الدهن للجمعة، حديث: 883.

حسب طاقت پڑھ لیے جائیں درست ہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی نہ بھی پڑھے تو کوئی حرج نہیں، یہی قول راجح ہے۔ اگر جاہل لوگ اسے سنت مؤکدہ کا درجہ دیں تو انھیں سمجھانے کے لیے کبھی کبھار یہ نوافل چھوڑ دینا افضل ہے۔[1] (البتہ تحیۃ المسجد دو رکعات ضروری ہیں کیونکہ یہ آپ ﷺ کا حکم ہے۔)''[2]

▲ یہ تو نماز جمعہ سے پہلے کے نوافل کا تذکرہ تھا جو مؤکدہ نہیں ہیں، البتہ جمعہ کی فرض نماز کے بعد مؤکدہ سنتیں ہیں، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا أَرْبَعًا»

''جب کوئی شخص نماز جمعہ پڑھے تو فرضوں کے بعد چار رکعات ادا کرے۔''[3]

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت میں ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي بَعْدَ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ»

''نبی ﷺ جمعہ کے بعد دو رکعات پڑھتے تھے۔''[4]

ان دونوں حدیثوں کو ملا کر یہ صورت سامنے آتی ہے کہ جمعہ کے بعد اگر کوئی گھر جا کر نماز پڑھے تو دو رکعتیں پڑھے اور اگر وہیں مسجد میں ادا کرنا چاہے تو چار رکعات ادا کرے۔ اگر چاہے تو چھ رکعات ادا کرے کیونکہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نماز جمعہ پڑھ لیتے تو پھر آگے بڑھ کر دو رکعتیں پڑھتے، پھر جگہ بدل کر چار رکعات پڑھتے تھے۔[5]

▲ مسجد میں کسی بھی جگہ پر بیٹھنے کا زیادہ حق دار وہ شخص ہے جو خود وہاں پہلے آجائے۔ بعض لوگ یوں کرتے ہیں کہ مسجد کی کسی خاص جگہ یا پہلی صف میں مصلی یا لاٹھی یا کپڑا یا جوتا رکھ کر اپنے لیے یا کسی کے لیے جگہ محفوظ کر لیتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا شخص وہاں نہ بیٹھ سکے، پھر وہ خود یا جس شخص کے لیے وہ جگہ مخصوص کی گئی دیر سے آتا ہے، اس طرح پہلے آنے والا وہاں بیٹھنے کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ بالکل غلط ہے جس کی قرآن و حدیث میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں بلکہ علمائے کرام نے وضاحت کی ہے کہ جو شخص مسجد میں آئے تو وہ پہلی صف میں بیٹھے، اگر کسی نے کوئی چیز رکھ کر جگہ روک لی ہو تو اسے اٹھا دے اور خود بیٹھ جائے کیونکہ پہلے آنے والا پہلی صف میں بیٹھنے کا زیادہ حق دار ہے جو شخص مسجد میں اس طرح ایک جگہ پر قبضہ کر کے بعد میں آنے والے کو وہاں بیٹھنے سے روکتا ہے وہ

[1] مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية بتصرف: 194,189/24. [2] صحيح البخاري، الصلاة، باب إذا دخل المسجد فليركع ركعتين، حديث: 444. [3] صحيح مسلم، الجمعة، باب الصلاة بعد الجمعة، حديث: 881. [4] صحيح البخاري، الجمعة، باب الصلاة بعد الجمعة وقبلها، حديث: 937، وصحيح مسلم، الجمعة، باب الصلاة بعد الجمعة، حديث: 882 واللفظ له. [5] سنن أبي داود، الصلاة، باب الصلاة بعد الجمعة، حديث: 1130.

درحقیقت اس کا حق چھینتا اور ناجائز قبضہ کرتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اکثر لوگ جو نماز جمعہ سے پہلے مسجد میں (اپنے خادموں کے ذریعے) مصلیٰ وغیرہ بچھا کر جگہ روک لیتے ہیں یہ عمل بالاتفاق ممنوع ہے بلکہ حرام ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی جگہ پر پڑھی گئی نماز صحیح اور درست ہے؟ تو اس بارے میں علماء کی دو آراء ہیں۔ ایک تو اس نے مصلیٰ بچھا کر مسجد کا ایک حصہ روک لیا اور دوسرا اس نے آنے والوں کو اس جگہ نماز پڑھنے سے روک دیا جب کہ حکم تو یہ تھا کہ نمازی خود مسجد میں پہلے آئے۔ جب اس نے مصلیٰ پہلے بھیج دیا اور خود لیٹ آیا تو اس نے دو اعتبار سے شریعت کی مخالفت کی ہے، ایک یہ کہ اسے پہلے آنے کا حکم تھا لیکن وہ دیر سے آیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے مصلیٰ وغیرہ بچھا کر پہلے آنے والے کا حق غصب کیا ہے اور اس کے لیے رکاوٹ بنا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ پہلے پہلی صف مکمل ہوتی، پھر دوسری صف لیکن جگہ پر قبضے کی وجہ سے حکم رسول اللہ ﷺ پر عمل بھی نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں جب وہ دیر سے آیا تو لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھا جو گناہ ہے بلکہ وہ سخت وعید کا مستحق قرار پایا۔''[1]

▲ احکام جمعہ میں سے یہ بھی ہے کہ جو شخص امام کے خطبے کے دوران مسجد میں آئے تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں ضرور پڑھے اور انھیں مختصر کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَقَدْ خَرَجَ الْإِمَامُ فَلْيُصَلِّ رَكْعَتَيْنِ - وَفِي رِوَايَةٍ: وَلْيَتَجَوَّزْ فِيهِمَا»

''جب کوئی شخص جمعے کے دن مسجد میں آئے اور امام خطبے کے لیے نکل چکا ہو تو وہ دو رکعتیں ادا کرے (پھر بیٹھے)۔'' اور ایک روایت میں ہے کہ ''انھیں مختصر پڑھے۔''[2]

اگر کوئی شخص لاعلمی کی وجہ سے آتے ہی بیٹھ گیا تو یاد آ جانے یا علم ہونے پر فوراً کھڑا ہو جائے اور دو رکعتیں ادا کر کے بیٹھے کیونکہ نبی ﷺ نے اس شخص کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا تھا جو مسجد میں آتے ہی بیٹھ گیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: قُمْ فَارْكَعْ رَكْعَتَيْنِ ''کھڑا ہو اور دو رکعت نماز ادا کر۔''[3]

▲ جمعۃ المبارک کے احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو اس دوران میں سامعین کا

[1] مجموع الفتاوی لشیخ الإسلام ابن تیمیة بتصرف: 190,189/22. [2] صحیح البخاري، الجمعة، باب من جاء والإمام یخطب صلی رکعتین خفیفتین، حدیث: 931، وصحیح مسلم، الجمعة، باب التحیة والإمام یخطب، حدیث: 875 واللفظ له. [3] صحیح البخاري، الجمعة، باب من جاء والإمام یخطب صلی رکعتین خفیفتین، حدیث: 931، وصحیح مسلم، الجمعة، باب التحیة والإمام یخطب، حدیث: 875 واللفظ له.

آپس میں گفتگو کرنا ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○ ﴾

''اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو، امید ہے تم پر رحمت ہو۔''[1]

بعض مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت خطبے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ خطبے کو قرآن اس لیے کہا گیا کہ خطبے میں آیات قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو پھر یہ اپنے عموم کے اعتبار سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی کو خاموش کرنے کے لیے کچھ کہا، اس نے لغو کام کیا اور جس نے لغو کام کیا اس کا جمعہ نہیں۔''[2]

ایک دوسری روایت میں ہے:

«مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ، فَهُوَ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا، وَالَّذِي يَقُولُ لَهُ: أَنْصِتْ، لَيْسَ لَهُ جُمُعَةٌ»

''جس نے جمعے کے دن دوران خطبہ میں کلام کیا وہ اس گدھے کی طرح ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ اور جو اسے خاموش کراتا ہے اس کا بھی جمعہ نہیں ہوتا۔''[3]

⑧ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مضمون کی روایت بیان ہوئی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: أَنْصِتْ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ، فَقَدْ لَغَوْتَ»

''جب تو جمعے کے دن اپنے ساتھی سے کہے: خاموش ہو جا اور خطیب خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغوبات کی۔''[4]

اور ''لغو'' گناہ ہے۔ اگر باتیں کرنے والے کو خاموش ہونے کے لیے کہنا ''لغو'' ہے جو کہ حقیقت میں امر بالمعروف ہے تو اس کے سوا دوسری قسم کی باتیں تو بالاولی منع ہوں گی۔

① الأعراف 7:204. ② [إسناده ضعيف] مسند أحمد: 1/93. ③ [ضعيف] مسند أحمد:1/230، ومشكاة المصابيح بتحقيق الألباني، حديث: (17) 1397. ④ صحيح البخاري، الجمعة، باب الإنصات يوم الجمعة، والإمام يخطب، حديث:934، وصحيح مسلم، الجمعة، باب في الإنصات يوم الجمعة في الخطبة، حديث:851.

▲ دوران خطبہ میں خطیب کا کسی مقتدی کے ساتھ بات کرنا یا اس سے مخاطب ہونا جائز ہے۔ اسی طرح مقتدی خطیب سے (کسی ضرورت کے پیش نظر) مخاطب ہو کر بات کر سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے تحیۃ المسجد پڑھے بغیر بیٹھنے والے شخص سے سوال کیا اور اس نے جواب دیا۔ ایسے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ اور سامع کا کسی مصلحت کی بنا پر بات چیت کرنا ثابت ہوتا ہے۔ اور اس سے سماع خطبہ میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

▲ خطبہ سننے والے شخص کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ وہ دوران خطبہ میں کسی سائل کو صدقہ و خیرات دے۔ سائل کا سوال کرنا بھی ناجائز ہے کیونکہ یہ حالت خطبہ میں کلام کرنا ہے، لہٰذا اس وقت تعاون کرنا بھی ناجائز ہے۔

▲ جب خطیب رسول اللہ ﷺ کا نام لے تو سامع کو چاہیے کہ آپ ﷺ پر درود بھیجے، البتہ کلماتِ درود آہستہ کہے تاکہ ساتھ والے کے لیے خلل کا باعث نہ ہو۔

▲ مسنون یہ ہے کہ خطیب کی دعا پر آواز بلند کیے بغیر آمین کہی جائے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دوران خطبہ میں خطیب کے سامنے آواز بلند کرنا بالاتفاق مکروہ یا حرام ہے۔ مؤذن ہو یا غیر مؤذن، کوئی شخص دوران خطبہ میں اونچی آواز سے درود نہ پڑھے نہ اور کوئی بات کرے۔''[1]

شیخ موصوف نے اس عبارت میں جس امر کی طرف توجہ دلائی ہے تو یہ چیز بعض ملکوں میں پائی جاتی ہے کہ لوگ دوران خطبہ میں بلند آواز سے درود پڑھتے ہیں یا دعائیں پڑھتے ہیں یا خطبے سے پہلے یا دو خطبوں کے درمیان ایسا کرتے دیکھے گئے ہیں بلکہ بعض خطباء دوران خطبہ میں حاضرین کو بلند آواز سے بولنے یا بعض کلمات دہرانے کا حکم دیتے ہیں، یہ عمل نہ صرف ناجائز ہے بلکہ جہالت و بدعت ہے۔

▲ جو شخص دوران خطبہ میں مسجد میں داخل ہو تو وہ سلام نہ کہے بلکہ آرام و سکون اور خاموشی سے صف تک پہنچے اور مختصر سی دو رکعات نماز پڑھ کر خطبہ سننے کے لیے بیٹھ جائے اور وہ دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ساتھیوں سے مصافحہ بھی نہ کرے۔

▲ دوران خطبہ میں ہاتھوں، پاؤں، ڈاڑھی یا کپڑوں وغیرہ سے کھیلنا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
«مَنْ مَسَّ الْحَصَا فَقَدْ لَغَا» ''جس نے (دوران خطبہ میں) کنکریوں کو چھوا اس نے لغو کام کیا۔''[2]

---

[1] مجموع الفتاوی لشیخ الإسلام ابن تیمیة: 218/24. [2] صحیح مسلم، الجمعة، باب فضل من استمع وأنصت في الخطبة، حدیث:857، وجامع الترمذي، الجمعة، باب ما جاء في الوضوء یوم الجمعة، حدیث:498.

اور فرمایا:

«وَمَنْ لَّغَا فَلَيْسَ لَهُ فِي جُمُعَتِهِ تِلْكَ شَيْءٌ»

''اور جس نے لغو کام کیا اس کا اس جمعے میں کوئی حصہ نہیں۔''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے شغل سے خشوع وخضوع جاتا رہتا ہے۔

- دوران خطبہ میں دائیں بائیں جھانکنا، وہاں لوگوں کو بغور دیکھنا جائز نہیں کیونکہ یہ چیز بھی سماع خطبہ سے مانع ہے بلکہ سامع کو چاہیے کہ وہ خطیب کی طرف متوجہ رہے جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم خطبہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ رہتے تھے۔
- اگر چھینک آ جائے تو خاموشی سے الحمدللہ کہہ دے۔
- خطبہ شروع ہونے سے پہلے یا خطبہ مکمل ہونے کے بعد میں گفتگو کرنا جائز ہے۔ اسی طرح جب خطیب دو خطبوں کے درمیان بیٹھ جائے تو کوئی خاص مصلحت ہو تو کلام کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ دنیاوی گفتگو سے اس وقت بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ الغرض جمعۃ المبارک کے دونوں خطبوں کی اسلام میں بہت بڑی اہمیت ہے کیونکہ ان میں قرآن مجید کی تلاوت اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہوتا ہے اور ان کے ضمن میں وعظ ونصیحت، مفید علمی مباحث اور نصیحت آموز واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ بنابریں خطیب کو سنانے اور سامع کو سننے کا پورا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ خطبہ جمعہ کی حیثیت اس عام گفتگو کی سی نہیں جو مجلسوں، جلسوں اور عام اجتماعات کی ہوتی ہے۔

بعض لوگ جب خطبہ جمعہ میں آخرت کی کوئی سزا کا بیان یا جہنم کی بات سنتے ہیں تو وہ بلند آواز سے أعوذ باللہ پڑھتے ہیں یا ثواب وجنت کا ذکر سنتے ہیں تو بآواز بلند اس کا سوال اور دعا کرتے ہیں، حالانکہ قطعاً اس کا جواز نہیں بلکہ یہ بھی خطبہ کے دوران میں ممنوع کلام میں داخل ہے۔ سابقہ دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ دوران خطبہ میں گفتگو کرنے سے ثواب ضائع ہو جاتا ہے بلکہ کلام کرنے والے کا جمعہ ہی نہیں ہوتا۔ اس حدیث کے مطابق وہ اس گدھے کی طرح ہے جو بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، لہٰذا اس نقصان دہ عمل سے خود بھی بچنا چاہیے اور دوسروں کو بھی بچانا چاہیے۔

- علمائے کرام نے بیان کیا ہے کہ نماز جمعہ ایک مستقل اور علیحدہ فرض ہے، ظہر کا بدل نہیں ہے۔ امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

[1] [ضعیف] سنن أبي داود، الصلاة، باب فضل الجمعة، حديث:1051، وضعيف الجامع الصغير، حديث:657.

«صَلَاةُ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَانِ تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ عَلٰى لِسَانِ مُحَمَّدٍ ﷺ»

”نماز جمعہ کی دو رکعتیں مکمل نماز ہے، قصر نہیں، یہ بات (تمھارے نبی) محمد ﷺ نے فرمائی ہے۔“[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز جمعہ بہت سے احکام میں نماز ظہر سے مختلف ہے۔ نماز جمعہ ظہر کی نماز سے افضل ہے، اس کی تاکید بھی زیادہ ہے، اس کے ترک پر سزا و وعید بھی زیادہ سخت وارد ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں نماز جمعہ کی کئی ایسی خصوصیات اور شرائط ہیں جو نماز ظہر کی نہیں۔ جس شخص پر جمعہ فرض ہے جب تک اس کا وقت گزر نہیں جاتا تب تک اسے نماز ظہر کفایت نہیں کرے گی، یعنی جب نماز جمعہ کا وقت گزر جائے، تب نماز ظہر اس کا بدل ہے۔

▲ نماز جمعہ ہر مسلمان مرد، آزاد، عاقل، بالغ اور مقیم پر فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَّاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةً: عَبْدٌ مَّمْلُوكٌ أَوِ امْرَأَةٌ أَوْ صَبِيٌّ أَوْ مَرِيضٌ»

”ہر مسلمان پر جمعہ فرض ہے مگر چار افراد: غلام، عورت، بچے اور بیمار پر فرض نہیں۔“[2]

اس مضمون کی ایک روایت امام دارقطنی نے بھی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، فَعَلَيْهِ الْجُمُعَةُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، إِلَّا عَلٰى مَرِيضٍ أَوْ مُسَافِرٍ أَوِ امْرَأَةٍ أَوْ صَبِيٍّ أَوْ مَمْلُوكٍ»

”جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اس پر جمعے کے دن جمعہ فرض ہے، سوائے مریض، مسافر، عورت، بچے اور غلام کے۔“[3]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جو لوگ اپنا گھر بار بنا کر ایک جگہ میں رہتے ہیں، موسم سرما یا موسم گرما میں کسی دوسری جگہ کوچ نہیں کرتے تو انھیں اپنے ہاں جمعہ کی اقامت کا اہتمام کرنا چاہیے، چاہے ان کے گھر جیسے بھی ہوں، وہ پکی اینٹ کے ہوں یا کچی کے، لکڑی کے ہوں یا جھونپڑیاں ہوں۔ الغرض! ان لوگوں کی رہائش گاہوں کی بناوٹ اور ان کا میٹریل اقامت جمعہ کے لیے رکاوٹ کا باعث نہیں۔ شرعی ضابطہ یہ ہے کہ جو لوگ ایک جگہ پر اقامت پذیر ہوں یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جو خیمے اٹھائے ہوئے سفر کرتے رہتے ہیں اور چند دن کہیں اور چند دن کسی اور جگہ چشموں کے پاس یا کہیں شاداب جگہ پر ڈیرہ لگا لیتے ہیں۔“[4]

---

[1] مسند أحمد: 37/1. [2] سنن أبي داود، الصلاة، باب الجمعة للمملوك والمرأة، حديث: 1067. [3] [ضعيف] سنن الدارقطني، الجمعة، باب من تجب عليه الجمعة، حديث: 1560، وسنن الكبرٰى للبيهقي: 184/3. لیکن جو مسئلہ بیان ہوا ہے وہ دیگر دلائل سے ثابت ہے۔ (ع۔و) [4] مجموع الفتاوٰى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 166/24.

- جس مسافر پر نماز کی قصر ہے اس پر جمعہ فرض نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جب حج وغیرہ کے لیے سفر کیا تو انھوں نے سفر میں جمعہ ادا نہیں کیا تھا۔
- اگر کوئی شخص سیر وتفریح کی خاطر کسی میدان یا بیابان کی طرف نکل گیا جہاں کوئی مسجد نہیں تو وہ نماز ظہر ادا کرے۔[1]
- عورت پر جمعہ فرض نہیں۔ امام ابن منذر وغیرہ نے کہا ہے کہ علماء کا اتفاق ہے کہ عورتوں پر جمعہ فرض نہیں، نیز اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر وہ ادائیگی جمعہ کے لیے مسجد میں آ جائیں گی تو ان کا بھی جمعہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر مسافر شخص جمعہ ادا کرنے کے لیے آ جائے تو اس کا جمعہ ہو جائے گا۔ مریض کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ ان لوگوں پر فرضیت جمعہ کا سقوط اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رعایت ہے۔ جس شخص پر جمعہ فرض ہے اسے زوال آفتاب کے فوراً بعد سفر شروع نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایسا شخص جمعہ ادا کر کے سفر پر روانہ ہو۔ اسی طرح زوال آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے بھی سفر پر روانہ ہونا مکروہ ہے، البتہ اگر راستے میں ادائیگیٔ جمعہ کی کوئی صورت ہو تو تب درست ہے۔
- جمعہ کی ادائیگی کی شرائط درج ذیل ہیں:

① دخول وقت: چونکہ نماز جمعہ فرض ہے، اس لیے دیگر نمازوں کی طرح اس کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے، جس سے پہلے اور بعد ادائیگیٔ جمعہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا ۝﴾

"یقیناً مومنوں پر مقررہ وقتوں میں نماز فرض ہے۔"[2]

ادائیگی جمعہ کا افضل وقت زوال آفتاب کے بعد ہے۔ رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات زوال آفتاب کے بعد ہی جمعۃ المبارک ادا کیا کرتے تھے۔ زوال آفتاب سے قبل جمعہ ادا کرنے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ جمعہ کا آخری وقت (بلا اختلاف) ظہر کے آخری وقت تک ہے۔

② اقامت: دوسری شرط یہ ہے کہ جمعہ ادا کرنے والے مسافر نہ ہوں بلکہ مقیم ہوں۔ خانہ بدوش اور مختلف جگہوں پر خیمے لگانے والوں پر جمعہ فرض نہیں۔ عہد نبوی میں یہ لوگ مدینہ منورہ کے ارد گرد رہا کرتے تھے، آپ ﷺ نے انھیں ادائیگیٔ جمعہ کا حکم نہیں فرمایا تھا۔

جس شخص نے امام کے ساتھ نماز جمعہ کی ایک رکعت حاصل کر لی تو وہ ایک رکعت اور پڑھ کر جمعہ کی نماز مکمل کر

① نماز جمعہ کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ جمعہ کے وقت بلا ضرورت سفر نہ کرے جیسے کہ اگلی سطور میں بیان ہوگا۔ (صارم)

② النسآء 103:4.

لے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْجُمُعَةِ فَقَدْ أَدْرَكَهَا»

''جس نے جمعہ کی ایک رکعت حاصل کر لی اسے نماز جمعہ مل گئی۔''[1]

اگر کسی نے امام کے ساتھ ایک رکعت سے کم حصہ حاصل کیا، مثلاً: جب وہ جماعت میں شامل ہوا تو امام دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھا چکا تھا تو اس کی نماز جمعہ فوت ہوگئی، لہٰذا وہ نماز ظہر کی نیت کر کے جماعت میں شامل ہو، اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد چار رکعات (نماز ظہر) ادا کرے۔

③ خطبے دو ہوں: نماز جمعہ کی درستی کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ اس سے پہلے دو خطبے ہوں کیونکہ نبی ﷺ ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کھڑے ہو کر دو خطبے دیا کرتے تھے اور دونوں خطبوں کے درمیان (تھوڑی دیر) بیٹھ کر فرق کیا کرتے تھے۔[2]

▲ دونوں خطبوں کی درستی کی شرائط میں سے ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہو توحید ورسالت کا تذکرہ ہو۔رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجا جائے اور لوگوں کو تقویٰ کی وعظ ونصیحت ہو۔قرآن مجید کے کسی حصہ کی تلاوت ہو۔ایسا نہ ہو جیسا کہ آج کل کے بعض خطباء کو سنا اور دیکھا گیا ہے کہ ان کا خطبہ ان مذکورہ اوصاف وشرائط سے عاری ہوتا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خطبات پر غور کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان میں توحید وہدایت کا تذکرہ ہوتا تھا، رب تعالیٰ کی صفات، ایمان واسلام کے اصول، دعوت الی اللہ، اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوقات پر وہ انعامات واکرام جن سے سامعین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو، عذاب الٰہی کے واقعات جنھیں سن کر اللہ کا خوف پیدا ہو، بیان ہوتے تھے۔وہ ذکر وشکر کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کی صفات اور اسمائے مبارکہ کا ذکر کرتے۔لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وشکر اور اس کا ذکر کرنے کی تلقین وتاکید کرتے تھے۔سامعین جب خطبہ سن کر پلٹتے تھے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان محبت گہری ہو چکی ہوتی تھی اور وہ اس کی اطاعت کے لیے ایک نیا جذبہ اور ولولہ لے کر جاتے تھے۔

پھر مدت دراز کے بعد نبوت کا نور ماند پڑ گیا احکام شرعیہ اور اوامر اسلام صرف رسم ورواج بن کر رہ گئے، ان

① السنن الكبرى للبيهقي، الجمعة، باب من أدرك ركعة من الجمعة :204/3. ② صحيح البخاري، الجمعة، باب القعدة بين الخطبتين يوم الجمعة، حديث :928، وصحيح مسلم، الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة وما فيهما من الجلسة، حديث862.

کے حقائق ومقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، رسومات ورواج کو ایسی سنتوں کا درجہ دے دیا گیا کہ ان کا ترک گناہ قرار پایا۔ ضروری مقاصد چھوٹ گئے، خطبات کو خوبصورت الفاظ اور مسجع عبارات کا لبادہ پہنا دیا گیا اور ان پر علم بدیع کا خول چڑھا دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خطبات بے اثر ہو گئے حتیٰ کہ حقیقی مقصود ومطلوب ہاتھوں سے نکل گیا۔'' [1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنے دور کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے پیش نظر اب تو معاملہ بہت زیادہ بگڑ چکا ہے یہاں تک کہ آج کے خطبات میں با مقصد باتیں نہایت کم ہوتی ہیں اور بے مقصد باتیں بہت زیادہ۔

بعض خطباء جو منہ میں آتا ہے بولتے ہی جاتے ہیں، وہ اس بات کا قطعاً خیال نہیں رکھتے کہ ان کی باتوں کی خطبے کے موضوع سے کوئی مناسبت بھی ہے یا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خطبہ میں ان کا کوئی متعین موضوع ہی نہیں ہوتا۔ ان کا طویل خطبہ اکتاہٹ کا باعث بنتا ہے۔ شرائط شرعیہ کا قطعاً لحاظ نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ ایسے خطبات اثرات وفوائد سے خالی ہوتے ہیں۔

بعض خطباء خطبے میں موضوع سے غیر متعلق باتیں شروع کر دیتے ہیں، جن کا اس مقام پر ذکر کرنا حکمت کے منافی ہوتا ہے۔ بعض اوقات اکثر سامعین خطبہ کی باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کیونکہ وہ باتیں ان کی ذہنی سطح سے بلند ہوتی ہیں۔ بعض اوقات وہ سیاسی گفتگو میں پڑ جاتے ہیں یا ایسی بحث شروع کر دیتے ہیں جن کا حاضرین کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

خطبائے کرام! رسول اللہ ﷺ کے خطبہ کا جو انداز اور طریقہ تھا اس کی طرف پلٹ آئیے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔'' [2]

اپنے خطبات کے عنوان موقع ومحل کی مناسبت سے قرآن وسنت کے دلائل میں مرکوز رکھو، ان کے ضمن میں تقویٰ کی تلقین کرو، وعظ ونصیحت کا التزام رکھو، معاشرے کی امراض کا علاج واضح اور مختصر اسلوب میں کرو۔ ان میں قراءت قرآن کا اہتمام کرو کیونکہ اس میں دلوں کو زندگی اور نگاہوں کو روشنی ملتی ہے۔ مقصد صرف دو خطبے نہیں ہیں بلکہ اصل مقصد معاشرے کی بیماریوں کا علاج کرنا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''خطبے میں دنیا کی مذمت اور موت کا ذکر کرنا کافی نہیں ہے بلکہ خطبے کا مقصد (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) دلوں میں تحریک پیدا کرنا، لوگوں کو خیر وبھلائی پر آمادہ کرنا ہے۔ صرف دنیا کی مذمت کرنا اور اس میں احتیاط سے زندگی بسر کرنے کی تبلیغ کرنا یہ ان باتوں میں سے ہے جن کی منکرین

[1] زاد المعاد:1/423، 424. [2] الأحزاب 33:21.

شریعت بھی وصیت کرتے رہتے ہیں۔ خطبے میں اطاعت واتباع کی رغبت دلائی جائے، معصیت سے ڈرایا جائے، اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا جائے اور اس کے انعامات کا تذکرہ کیا جائے۔"

آگے چل کر شیخ موصوف فرماتے ہیں: "خطبہ میں اس قدر اختصار بھی نہ ہو کہ اصل مقصد فوت ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی، غصہ و جوش بڑھ جاتا اور یوں لگتا جیسے آپ ﷺ کسی ایسے لشکر سے ڈرا رہے ہیں جو صبح یا شام حملہ کرنے والا ہے۔"[1]

▲ فقہائے کرام نے بیان کیا ہے کہ جمعے کے دونوں خطبے منبر پر کھڑے ہو کر دینے مسنون ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے، اس میں شاید حکمت یہ ہے کہ جب سامع خطیب کو سامنے منبر پر دیکھ رہا ہو تو اس طریقے سے بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے اور مؤثر بھی ہو جاتی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منبر کے استعمال پر علماء کا اجماع ہے۔

▲ مسنون یہ ہے کہ جب امام منبر پر لوگوں کی طرف متوجہ ہو تو انھیں السلام علیکم کہے، کیونکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا صَعِدَ الْمِنبَرَ سَلَّمَ»

"رسول اللہ ﷺ جب منبر پر چڑھتے تو (حاضرین کو) سلام کہتے۔"[2]

▲ جب تک مؤذن اذان سے فارغ نہ ہو تب تک خطیب منبر پر بیٹھا رہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«كَانَ يَجْلِسُ إِذَا صَعِدَ الْمِنبَرَ حَتَّى يَفْرُغَ الْمُؤَذِّنُ، ثُمَّ يَقُومُ فَيَخْطُبُ»

"رسول اللہ ﷺ مؤذن کے فارغ ہونے تک منبر پر بیٹھے رہتے، پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ شروع کر دیتے۔"[3]

▲ مسنون یہ ہے کہ خطیب دو خطبوں کے درمیان (تھوڑی دیر) بیٹھ کر فرق کرے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَخْطُبُ الْخُطْبَتَيْنِ وَهُوَ قَائِمٌ، وَكَانَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا بِجُلُوسٍ»

① صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث:867. ② [ضعيف] سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ما جاء في الخطبة يوم الجمعة، حديث:1109. ③ سنن أبي داود، الصلاة، باب الجلوس إذا صعد المنبر، حديث:1092.

”نبی ﷺ کھڑے ہوکر دو خطبے ارشاد فرماتے اور دونوں کے درمیان بیٹھ کر فرق کرتے۔“[1]

- یہ بھی مسنون عمل ہے کہ دونوں خطبے کھڑے ہوکر دیے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی ہے: ﴿وَتَرَكُوكَ قَآئِمًا﴾ (الجمعة 62:11) ”اور وہ آپ کو کھڑا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔“ اور مسلمانوں کا اسی پر عمل ہے (کہ دونوں خطبے کھڑے ہوکر دیتے ہیں۔)
- عصا وغیرہ کا سہارا لینا بھی مسنون عمل ہے۔
- خطبے میں مسنون یہ ہے کہ خطیب اکثر طور پر سامنے نظر رکھے، صرف ایک طرف دیکھنے سے دوسری جانب کو نظر انداز کرنا لازم آتا ہے اور سنت کی مخالفت بھی ہوتی ہے۔ سامعین کو بھی چاہیے کہ وہ امام کی طرف منہ کر کے بیٹھیں۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا اسْتَوٰى عَلَى الْمِنْبَرِ اسْتَقْبَلْنَاهُ بِوُجُوهِنَا»

”رسول اللہ ﷺ جب منبر پر تشریف رکھتے تو ہم اپنے چہروں کا رخ آپ ﷺ کی طرف کر لیتے۔“[2]

- مسنون یہ ہے کہ خطبہ جمعہ چھوٹا اور مناسب سا ہو کہ لوگوں میں طوالت کی وجہ سے اکتاہٹ اور نفرت پیدا نہ ہو اور اس قدر مختصر بھی نہ ہو کہ مقصد خطبہ فوت ہو جائے اور لوگوں کو فائدہ نہ ہو۔ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ طُولَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ مِّنْ فِقْهِهِ، فَأَطِيلُوا الصَّلَاةَ وَأَقْصِرُوا الْخُطْبَةَ»

”آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور خطبے کا چھوٹا ہونا اس کی عقل مندی کی علامت ہے، چنانچہ تم نماز کو لمبا کرو اور خطبے کو مختصر کرو۔“[3]

- یہ بھی مسنون ہے کہ دوران خطبہ میں خطیب کی آواز بلند ہو۔ نبی ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ کی آواز بلند ہو جاتی اور جوش و غصہ بڑھ جاتا۔“[4] واضح رہے کہ اس انداز سے بات دلوں میں جاگزیں ہو جاتی ہے اور

---

[1] صحيح البخاري، الجمعة، باب القعدة بين الخطبتين يوم الجمعة، حديث:928، وصحيح مسلم، الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة وما فيها من الجلسة، حديث:861، وسنن النسائي، الجمعة، باب الفصل بين الخطبتين بالجلوس، حديث:1417 واللفظ له. [2] صحيح البخاري، الجمعة، باب استقبال الناس الإمام إذا خطب، حديث: 921، وجامع الترمذي، الجمعة، باب ما جاء في استقبال الإمام إذا خطب، حديث:509 واللفظ له. [3] صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: 869. [4] صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: 867.

یہ لہجہ وعظ ونصیحت کے لیے زیادہ مؤثر ہے۔ علاوہ ازیں خطیب کو چاہیے کہ واضح، مؤثر اور جامع الفاظ و عبارات کا سہارا لے۔

- خطیب خطبہ جمعہ میں اہل اسلام کے لیے ان کے دین و دنیا میں بھلائی اور اصلاح کی دعا کرے۔ اسلامی حکومت کے امیر اور بااختیار لوگوں کے حق میں خیر و بہتری کی دعا کرے۔ سلف صالحین کا روز اول سے یہی انداز چلا آ رہا ہے۔ اسے چھوڑنا اہل بدعت کا شیوہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اگر ہمیں کسی دعا کی قبولیت کا یقین ہوتو ہم اپنے خلیفہ کے حق میں خیر و بہتری کی دعا کریں۔“[1]

یہ حقیقت ہے کہ خلیفہ وامیر کا درست ہونا مسلمان رعایا کی درستی ہے۔ افسوس ہے کہ آج یہ چیز ختم ہو چکی ہے حتیٰ کہ لوگ حکمرانوں کے حق میں دعا کرنے پر تعجب کرتے ہیں بلکہ دعا کرنے والے کے حق میں بدگمانی رکھتے ہیں۔

- دو خطبوں سے فارغ ہو کر فوراً نماز کھڑی کرنا مسنون عمل ہے۔ اس میں لمبا وقفہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔
- نماز جمعہ کی بالاجماع دو رکعتیں ہیں جن میں قراءت بلند آواز سے کی جائے۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ جمعہ یا سورۂ اعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقون یا سورۂ غاشیہ کی قراءت کرنا مسنون ہے۔ ان سورتوں میں سے ایک سورت کو جمعے کی دونوں رکعتوں میں آدھی آدھی کر کے پڑھنا خلاف سنت عمل ہے۔

نماز جمعہ میں بلند آواز سے قراءت کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس سے مقصد جمعہ (وعظ ونصیحت) خوب حاصل ہو جاتا ہے۔

نمازِ عیدین کے احکام

نماز عیدین (عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ) کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ مشرکین مختلف اوقات ومقامات میں مختلف تہوار مناتے تھے، چنانچہ اسلام نے انھیں ختم کر کے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے تہوار مقرر کیے جن کا مقصد رمضان المبارک کے روزے اور بیت اللہ کے حج جیسی عظیم عبادات کی بجا آوری پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے۔

- صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا کہ اہل مدینہ نے لہو ولعب کے لیے سال میں دو دن مقرر کیے ہوئے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] السياسة الشرعية، فصل منزلة الولاية: 169/1.

«قَدْ أَبْدَلَكُمُ اللهُ بِهِمَا خَيْرًا مِّنْهُمَا : يَوْمَ الْفِطْرِ وَيَوْمَ الْأَضْحٰى»

''اللہ تعالیٰ نے ان کے عوض تمھیں دو بہتر دن عطا کیے ہیں جو عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ ہیں۔''[1]

ان دو عیدوں کے علاوہ اور کسی عید کو ایجاد کرنے کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں جیسا کہ عید میلادالنبی وغیرہ ہے جو سراسر اللہ تعالیٰ کے دین میں زیادتی ہے اور بدعت کا اجرا ہے۔ اس میں سیدالمرسلین ﷺ کی سنت کی مخالفت ہے اور کفار سے مشابہت ہے۔ اسے عید کہا جائے یا کسی انسان یا کسی واقعہ کی یاد میں دن منانا یا ہفتہ یا سال منانا، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ سب جاہلیت کے کام ہیں اور مغربی فرقوں کی تقلید ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: [مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ] ''جو شخص کسی قوم سے مشابہت کرے وہ انھی کا فرد ہے۔''[2]

نیز فرمایا:

«إِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

''سب سے اچھی بات اللہ کی کتاب ہے اور بہتر سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے اور سب سے برے کام بدعات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[3]

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھائے اور اس کے اتباع کی توفیق دے اور باطل کو باطل کی شکل میں دکھائے اور اس سے اجتناب کی ہمت دے۔

عید کے معنی ''لوٹ کر آنا'' ہے۔ عید کو عید اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بار بار ہر سال لوٹ کر آتی ہے، سرور اور فرحت لاتی ہے، نیز اس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر (روزے یا حج کے نتیجے میں) اپنا فضل و احسان کرتا ہے۔

◣ نماز عید کی مشروعیت پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝﴾ (الکوثر 2:108) ''پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔''

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝﴾

''بے شک اس نے فلاح پالی جو پاک ہوگیا اور جس نے اپنے رب کا نام یاد رکھا اور نماز پڑھتا رہا۔''[4]

① سنن النسائي،صلاة العيدين، حديث: 1557، ومسند أحمد: 103/3. ② سنن أبي داود، اللباس، باب في لباس الشهرة، حديث:4031. ③ صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول اللهﷺ، حديث: 7277 وصحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: 867 واللفظ له. ④ الأعلى87:14، 15.

علاوہ ازیں نبی ﷺ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے اس عمل پر مداومت فرمائی ہے۔

▲ نماز عید میں شرکت کی تاکید اس قدر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس میں خواتین کو حاضر ہونے کا حکم دیا ہے، لہٰذا عورت کے لیے مناسب یہ ہے کہ جب وہ نماز عید کے لیے گھر سے نکلے تو خوشبو نہ لگائے، سامان زینت کے استعمال سے اجتناب کرے، شہرت کے لیے لباس نہ پہنے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''عورتیں سادگی سے نکلیں۔[1] مردوں سے الگ رہیں اور حیض والی عورتیں نماز گاہ سے دور رہیں، البتہ دعا میں ضرور شریک ہوں۔''[2]

سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''ہمیں حکم ہوتا کہ عید کے روز باہر (عیدگاہ کی طرف) نکلیں۔ کنواری لڑکیاں بھی وہاں پہنچیں، حتیٰ کہ حیض والی عورتیں بھی عیدگاہ جائیں لیکن وہ پیچھے رہیں۔ لوگوں کے ساتھ تکبیریں بھی کہیں اور دعا میں شریک ہوں۔ اس دن کی برکت و بخشش کی امید رکھیں۔''[3]

▲ نماز عید کی ادائیگی کے لیے یوں سب کا مل جل کر نکلنا، اس میں شعار اسلام کا اظہار ہے اور یہ دین اسلام کا ظاہری مظہر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلی نماز عید (عیدالفطر) ہجرت کے دوسرے سال پڑھائی تھی، پھر آپ ﷺ اسے مسلسل پڑھاتے رہے حتیٰ کہ اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ بعد میں مسلمانوں کا تواتر کے ساتھ اس پر عمل رہا ہے۔ اگر کسی شہر کے لوگ نماز عید کو (اس کی شرائط کے مطابق) ادا کرنا چھوڑ دیں تو امیر و خلیفہ پر لازم ہے کہ ان کے خلاف جنگ کرے کیونکہ یہ اذان کی طرح دین اسلام کی ظاہری علامات میں سے ایک علامت ہے۔

▲ نماز عید شہر کے قریب کھلے میدان میں ادا کرنی چاہیے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَالْأَضْحٰى إِلَى الْمُصَلّٰى»

''رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے باہر نکل کر کھلی جگہ میں عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی نماز ادا کرتے تھے۔''[4]

چنانچہ کسی روایت میں نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے عذر کے بغیر مسجد میں نماز عید ادا کی ہو۔ کھلے میدان میں جانے سے اسلام اور اہل اسلام کا رعب طاری ہوتا ہے۔ دین کے شعائر کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر سال میں ایسے صرف دو ہی

---

[1] سنن أبي داود، باب ما جاء في خروج النساء إلى المسجد، حديث: 565. [2] صحيح البخاري، الحيض، باب شهود الحائض العيدين ودعوة المسلمين ويعتزلن المصلى، حديث: 324، وصحيح مسلم، العيدين، باب ذكر إباحة خروج النساء في العيدين إلى المصلى......، حديث: 890. [3] صحيح البخاري، الحيض، باب شهود الحائض العيدين......، حديث: 324. [4] صحيح البخاري، العيدين، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر، حديث: 956، وصحيح مسلم، العيدين، باب صلاة العيدين، حديث: 889.

تو اجتماع ہوتے ہیں (بخلاف جمعۃ المبارک کے اجتماع کے) اس لیے اس میں کوئی مشکل بھی نہیں، البتہ جہاں مجبوری ہو وہاں مسجد میں نمازعید ادا کرنا جائز ہے، جیسے مکہ مکرمہ وغیرہ میں۔

▪ نمازعید کا ابتدائی وقت تب شروع ہوتا ہے جب سورج ایک نیزہ کی مقدار بلند ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ اسی وقت عید کی نماز ادا کرتے تھے۔[1] اور آخری وقت زوال آفتاب تک ہے۔

▪ اگر زوال کے بعد عید کا علم ہوا تو اگلے دن اس کی قضا دی جائے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں ایک مرتبہ بادلوں کی وجہ سے ہم شوال کا چاند نہ دیکھ سکے تو ہم نے روزہ رکھ لیا۔ دن کے آخری حصے میں ایک قافلہ آیا تو انھوں نے گواہی دی کہ ہم نے گزشتہ رات چاند دیکھا تھا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ آج کا رکھا ہوا روزہ ختم کر دیں اور کل صبح عیدگاہ کی طرف نکلیں۔[2]

اگر نمازعید زوال آفتاب کے بعد ادا کرنا درست ہوتا تو نبیٔ اکرم ﷺ اسے اگلے دن کے لیے مؤخر نہ کرتے۔ علاوہ ازیں عید کا اجتماع ایک بہت بڑا اجتماع عام ہوتا ہے، اس لیے اس کی تیاری کے لیے مناسب وقت دینا چاہیے۔

▪ عیدالاضحیٰ کی نماز کو جلدی ادا کرنا اور عیدالفطر کی نماز میں قدرے تاخیر کرنا مسنون ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے مرسلاً روایت بیان کی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَتَبَ إِلٰى عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ وَّهُوَ بِنَجْرَانَ، أَنْ عَجِّلِ الْغُدُوَّ إِلَى الْأَضْحٰى، وَأَخِّرِ الْفِطْرَ وَذَكِّرِ النَّاسَ»

”نبی ﷺ نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا تھا کہ عیدالاضحیٰ میں جلدی کرنا اور عیدالفطر میں تاخیر کرنا اور لوگوں کو پند و نصیحت کرنا۔“[3]

نمازعیدالاضحیٰ جلدی ادا کرنے میں یہ حکمت ہے کہ لوگوں کو قربانی کرنے کے لیے زیادہ وقت مل جائے۔ اور عیدالفطر میں تاخیر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ صدقۃ الفطر کے لیے زیادہ وقت نکل آئے۔

▪ مسنون یہ ہے کہ نمازعیدالفطر کے لیے نکلنے سے پہلے کھجوریں کھائی جائیں جب کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر نماز سے فارغ ہو کر کچھ کھایا جائے۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

① سنن أبي داود، الصلاة، باب وقت الخروج إلى العيد، حديث: 1135، وتلخيص الحبير: 83/2. ② مسند أحمد: 57/5، وسنن أبي داود، الصلاة، باب إذا لم يخرج الإمام للعيد من يومه يخرج من الغد، حديث: 1157. ③ [ضعيف جداً] كتاب الأم للإمام الشافعي، العيدين، باب وقت الغدو إلى العيدين، حديث: 457، وإرواء الغليل، حديث: 633.

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَوْمَ الْفِطْرِ لَا يَخْرُجُ حَتَّى يَطْعَمَ وَيَوْمَ النَّحْرِ لَا يَطْعَمُ حَتَّى يَرْجِعَ»

''نبی ﷺ عیدالفطر کے روز کچھ کھا کر نماز کے لیے نکلتے تھے اور عیدالاضحیٰ کے روز نماز ادا کرنے کے بعد کھایا کرتے تھے۔''[1]

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے نماز کو قربانی سے مقدم رکھا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝﴾

''اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔''[2] اور تزکیہ کو نماز سے مقدم رکھا ہے۔

چنانچہ فرمان الٰہی ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝﴾

''بے شک اس نے فلاح پالی جو پاک ہو گیا اور جس نے اپنے رب کا نام یاد رکھا اور نماز پڑھتا رہا۔''[3]

بنا بریں سنت یہ ہے کہ صدقۃ الفطر (عیدالفطر میں) نماز سے پہلے ادا کیا جائے اور عیدالاضحیٰ میں نماز کے بعد جانور ذبح کیا جائے۔''[4]

- نماز کے لیے صبح جلدی عیدگاہ جانا چاہیے تاکہ امام کے قریب جگہ مل سکے اور نماز کے انتظار کی فضیلت اور اس کا ثواب حاصل ہو۔
- نماز عید کے لیے ہر مسلمان اچھے سے اچھے کپڑے پہنے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كَانَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ جُبَّةٌ يَلْبَسُهَا فِي الْعِيدَيْنِ وَيَوْمَ الْجُمُعَةِ»

''رسول اللہ ﷺ کے پاس کپڑوں کا ایک خوبصورت جوڑا تھا جو آپ ﷺ جمعہ اور عید کے روز پہنتے تھے۔''[5]

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدین کے موقع پر اچھے کپڑے پہنتے تھے۔

- نماز جمعہ کی طرح عید کی نماز بھی مقیم لوگوں کے لیے ہے۔ مسافر پر نماز عید لازم نہیں۔ نبی ﷺ کے حج کے ایام میں (میدان منیٰ) میں عید کا دن آیا لیکن آپ ﷺ نے (سفر کی وجہ سے) نماز عید ادا نہیں کی تھی اور آپ ﷺ کے

---

① مسند أحمد: 352/5. ② الكوثر 2:108. ③ الأعلى 87:14، 15. ④ مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية بتصرف: 222/24. ⑤ [ضعيف] صحيح ابن خزيمة، جماع أبواب الطيب و التسوك، واللبس للجمعة، باب استحباب لبس الجبة في الجمعة......، حديث: 1766، وسلسلة الأحاديث الضعيفة، حديث: 2455.

خلفاء رضی اللہ عنہم نے بھی اسی طرح کیا تھا۔

▲ نمازعید کی دو رکعتیں ہیں جو خطبے سے پہلے ادا کی جاتی ہیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«شَهِدْتُ الْعِيدَ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَبِي بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَعُثْمَانَ، فَكُلُّهُمْ كَانُوا يُصَلُّونَ قَبْلَ الْخُطْبَةِ»

''میں نے رسول اللہ ﷺ سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ عید کی نماز پڑھی، یہ سب حضرات نماز خطبے سے پہلے پڑھتے تھے۔''[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے اہل علم کا یہی طریقہ تواتر سے چلا آ رہا ہے کہ عیدین کی نماز خطبے سے پہلے ہے۔[2] نماز عید میں خطبے کا بعد میں ہونے اور نماز جمعہ میں خطبے کا پہلے ہونے میں شاید حکمت یہ ہے کہ خطبۂ جمعہ نماز کی شرط ہے اور شرط مشروط سے مقدم ہوتی ہے۔ جب کہ عیدین میں خطبہ شرط نہیں بلکہ سنت ہے۔

▲ اہل اسلام کا اس امر پر اجماع ہے کہ عیدین کی نماز دو رکعتیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَرَجَ يَوْمَ الْفِطْرِ، فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا»

''نبی ﷺ عیدالفطر کے دن نکلے تو آپ نے صرف دو رکعتیں نماز ادا کی، پہلے اور بعد میں کوئی نفل نہیں پڑھے۔''[3]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَصَلَاةُ الْأَضْحٰى رَكْعَتَانِ وَصَلَاةُ الْفِطْرِ رَكْعَتَانِ . . . تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ عَلٰى لِسَانِ مُحَمَّدٍ ﷺ»

''عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کی نماز دو، دو رکعتوں پر مشتمل ہے...... یہ مکمل نماز ہے قصر نہیں۔ یہ بات (تمھارے نبی) محمد ﷺ نے فرمائی ہے۔''[4]

''وہ شخص نامراد ہے جس نے آپ ﷺ پر افترا باندھا۔''[5]

[1] صحيح البخاري، العيدين، باب الخطبة بعد العيد، حديث:962، وصحيح مسلم، كتاب وباب صلاة العيدين، حديث: 884. [2] جامع الترمذي، العيدين، باب ما جاء في صلاة العيدين قبل الخطبة، تحت حديث:531. [3] صحيح البخاري، العيدين، باب الصلاة قبل العيد و بعدها، حديث:989، وصحيح مسلم، صلاة العيدين، باب ترك الصلاة قبل العيد وبعدها في المصلى، حديث:884. [4] مسند أحمد :37/1. [5] مسند أحمد :91/1 عن علي رضي الله عنه.

- نماز عید سے قبل اذان ہے نہ اقامت، چنانچہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متعدد مرتبہ نماز عید ادا کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے سے پہلے نماز پڑھائی جس کے لیے اذان کہی نہ اقامت۔"[1]

- پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ اور دعائے استفتاح کے بعد سات تکبیریں کہی جائیں، البتہ تکبیر تحریمہ رکن ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ باقی تکبیرات مسنون ہیں۔ پھر تعوذ پڑھے کیونکہ تعوذ قراءت قرآن کے لیے ہے، اس کے بعد قراءت کی جائے۔

- دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے (تکبیر انتقال کے علاوہ) پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَبَّرَ فِي عِيدٍ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ تَكْبِيرَةً: سَبْعًا فِي الْأُولٰى وَخَمْسًا فِي الْآخِرَةِ»

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید میں (زائد) بارہ تکبیریں کہی تھیں۔ سات پہلی رکعت میں اور پانچ دوسری رکعت میں۔"[2]

تکبیرات عید کی تعداد میں اور بھی روایات ہیں، چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں تکبیرات کی تعداد کے بارے میں اختلاف رہا ہے، لہٰذا ہر صورت جائز ہے۔

- ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا کرتے تھے۔

- ہر دو تکبیروں کے درمیان یہ کلمات پڑھے جائیں:

«اَللهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا، وَسُبْحَانَ اللهِ بُكْرَةً وَّأَصِيلاً، وَصَلَّى اللهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ وَآلِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا»

"سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ عید کی تکبیرات کے دوران میں کیا پڑھنا چاہیے؟ تو انھوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھیے۔"[3]

سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تصدیق کی ہے۔

الغرض! تکبیرات کے درمیان کوئی اور کلمات بھی پڑھے جا سکتے ہیں کیونکہ کسی روایت میں ذکر کی تعیین نہیں کی

[1] صحيح مسلم، كتاب وباب صلاة العيدين، حديث: 885-887. [2] مسند أحمد: 180/2. [3] إرواء الغليل: 114/3، حديث: 642.

گئی۔[1]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم تکبیرات کے درمیان معمولی سا سکتہ کیا کرتے تھے لیکن آپ سے تکبیرات کے درمیان کوئی معین ذکر ثابت نہیں۔“[2]

- اگر تکبیرات کی تعداد میں شک پڑ جائے تو کم عدد کو شمار کرے، مثلاً: اگر شک ہو کہ تین تکبیریں کہی گئی ہیں یا چار تو تین سمجھ لے کیونکہ کم عدد یقینی ہے۔
- اگر کوئی عید کی تکبیرات کہنا بھول گیا حتیٰ کہ اس نے قراءت شروع کر دی تو قراءت جاری رکھے کیونکہ یہ تکبیرات سنت تھیں اب ان کا موقع گزر گیا ہے۔
- اگر کوئی شخص نماز عید میں تب شامل ہوا جب امام کی قراءت ہو رہی تھی تو وہ تکبیر تحریمہ کہہ کر شامل ہو جائے اور عید کی زائد تکبیریں (اکیلا) نہ کہے۔ یا کوئی شخص امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہوا تو وہ بھی تکبیر تحریمہ کہے اور رکوع میں چلا جائے زائد تکبیریں کہنے میں مشغول نہ ہو۔
- نماز عید کی دو رکعتیں ہیں۔ امام ان میں بآواز بلند قراءت کرے کیونکہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَجْهَرُ بِالْقِرَاءَةِ فِي الْعِيدَيْنِ وَفِي الْاِسْتِسْقَاءِ»

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور استسقا کی نماز میں بآواز بلند قراءت کرتے تھے۔“[3]

اس پر علماء کا اجماع ہے اور اسی پر سلف کا عمل چلا آ رہا ہے۔

- امام نماز عید کی پہلی رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ پڑھے۔

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْعِيدَيْنِ بِـ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ وَ﴿هَلْ أَتٰكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ﴾»

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز میں پہلی رکعت میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ اور دوسری میں ﴿هَلْ أَتٰكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ﴾ تلاوت کیا کرتے تھے۔“[4]

① [ضعيف] السنن الكبرى للبيهقي، صلاة العيدين، باب يأتي بدعاء الافتتاح عقيب تكبيرة الافتتاح: 291/3. ② زاد المعاد: 443/1. امام ابن قیم رحمہ اللہ کی بات ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ (صارم) ③ [ضعيف] سنن الدارقطني، كتاب الاستسقاء: 66/2، حديث: 1785، وإرواء الغليل، حديث: 643. ④ سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ما جاء في القرأة في صلاة العيدين، حديث: 1283، ومسند أحمد: 14/5.

پہلی رکعت میں سورۂ ق اور دوسری رکعت میں سورۂ قمر کی تلاوت کرسکتا ہے جیسے کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے۔

«كَانَ يَقْرَأُ فِيهِمَا بِـ ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ وَ ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾»

''رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت میں سورۂ ق اور دوسری رکعت میں سورۂ قمر کی قراءت کرتے تھے۔''[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام نمازعید میں قرآن مجید کے کسی بھی حصے کی قراءت کرلے تو جائز ہے لیکن اگر سورۂ ق اور سورۂ قمر (یا دیگر مسنون سورتوں) کی قراءت کرے تو بہتر ہے۔''[2] رسول اللہ ﷺ بڑے بڑے اجتماعات کے موقع پر ایسی سورتیں پڑھا کرتے تھے جن میں توحید، امر و نہی، دنیا و آخرت اور سابقہ انبیاء کا تذکرہ ہوتا یا جن سورتوں میں سابقہ امتوں کا بیان ہوتا جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر و کذب کی وجہ سے عذاب نازل کیا اور انھیں تباہ و برباد کیا تھا۔ یا جو انبیاء پر ایمان لا کر نجات اور عافیت پا گئے تھے۔

▲ نماز سے فارغ ہو کر امام عید کے دو خطبے دے، دونوں کے درمیان بیٹھے۔ عبداللہ بن عبیداللہ بن عتبہ سے روایت ہے:

«اَلسُّنَّةُ أَنْ يَّخْطُبَ الْإِمَامُ فِي الْعِيدَيْنِ خُطْبَتَيْنِ، يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا بِجُلُوسٍ»

''سنت یہ ہے کہ امام عیدین کے دو خطبے دے اور دونوں کے درمیان بیٹھ کر فرق کرے۔''[3]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«خَطَبَ قَائِمًا ثُمَّ قَعَدَ قَعْدَةً، ثُمَّ قَامَ»

''آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا، پھر تھوڑی دیر بیٹھ گئے، پھر کھڑے ہو گئے۔''[4]

صحیح بخاری و مسلم میں ہے:

«فَبَدَأَ بِالصَّلَاةِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ، بِغَيْرِ أَذَانٍ وَّلَا إِقَامَةٍ، ثُمَّ قَامَ مُتَوَكِّئًا عَلٰى بِلَالٍ، فَأَمَرَ بِتَقْوَى اللهِ، وَحَثَّ عَلٰى طَاعَتِهِ . . .»

''آپ ﷺ نے خطبے سے پہلے بغیر اذان اور بغیر اقامت کے نماز پڑھائی، پھر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا سہارا لے

[1] صحيح مسلم، صلاة العيدين، باب ما يقرأ في صلاة العيدين، حديث: 891، وسنن أبي داود، الصلاة، باب ما يقرأ في الأضحى والفطر، حديث: 1154. [2] مجموع الفتاوٰى لابن تيمية: 219/24. [3] [ضعيف] كتاب الأم، صلاة العيدين، الفصل بين الخطبتين، حديث: 495، والسنن الكبرٰى للبيهقي، باب جلوس الإمام حين يطلع علىٰ المنبر: 299/3 دیکھیے (نصب الراية: 221/2). [4] [منكر] سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ما جاء في الخطبة في العيدين، حديث: 1289. صحیح یہی ہے کہ نماز عید میں ایک خطبہ ثابت ہے، دو خطبے ثابت نہیں۔ دیکھیے فتاوی الدین الخالص: 301/6. (ع۔و)

کر کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا، تقویٰ کا حکم دیا اور اطاعت کرنے کی تلقین کی۔"[1]

عید الفطر کے خطبے میں امام کو چاہیے کہ وہ صدقۃ الفطر ادا کرنے کی طرف توجہ دلائے، اس کے احکام، اس کی مقدار، اس کا وقت اور جنس کی انواع کے مسائل سے آگاہ کرے۔ جب کہ عید الاضحیٰ کے خطبہ میں قربانی کے مسائل و احکام بتائے جائیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ کے خطبے میں اکثر یہی مسائل بیان کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں خطباء کو چاہیے کہ اس قسم کے عظیم اجتماع میں تقویٰ اور وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات کی مناسبت سے گفتگو کریں جس میں لوگوں کی راہنمائی ہو، غافل کو تنبیہ ہو اور جاہل کو دینی مسائل کا علم ہو۔

- عیدگاہ میں عورتوں کو بھی حاضر ہونا چاہیے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ خطیب کو چاہیے کہ خطبہ عید میں عورتوں سے بھی مخاطب ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے جب محسوس کیا کہ خواتین تک میری آواز پہنچ نہیں سکے گی تو آپ ﷺ ان کے مجمع میں چلے گئے، انھیں وعظ و نصیحت کی اور صدقہ کرنے کی ترغیب دلائی۔ اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ خطبۂ عید کا کچھ حصہ خواتین کے لیے بھی مخصوص ہونا چاہیے کیونکہ انھیں اس کی اشد ضرورت ہے۔ اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع بھی ہے۔
- نماز عید کے احکام میں یہ بھی ہے کہ عیدگاہ میں نماز باجماعت سے پہلے یا بعد میں نفل نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَرَجَ يَوْمَ الْفِطْرِ ، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ ، لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا»

"رسول اللہ ﷺ عید کے روز نکلے تو آپ ﷺ نے صرف دو رکعتیں نماز پڑھائی، اس سے پہلے یا بعد میں کوئی نماز نہیں پڑھی۔"[2]

عید نماز سے پہلے یا بعد میں نفل نہ پڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ یہ نہ سمجھنا شروع کر دیں کہ اس نماز کی بھی سنتیں ہوتی ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "میں نے کسی بھی صاحب علم سے نہیں سنا کہ اسلاف میں سے کوئی بھی نماز عید

[1] صحيح البخاري، العيدين، باب المشي والركوب إلى العيد والصلاة قبل الخطبة وبغير أذان ولا إقامة، حديث: 958، وصحيح مسلم، كتاب و باب صلاة العيدين، حديث:885 واللفظ له .

[2] صحيح البخاري، العيدين، باب الصلاة قبل العيد و بعدها، حديث: 989، وصحيح مسلم، صلاة العيدين، باب ترك الصلاة قبل العيد و بعدها في المصلى، حديث:884.

سے پہلے یا بعد میں نفل ادا کرتا ہو اور سیدنا ابن مسعود اور حذیفہ رضی اللہ عنہما عید سے قبل نماز سے منع کرتے تھے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل مدینہ نماز عید سے پہلے یا بعد میں کوئی نفل نہیں پڑھتے تھے (جبکہ اہل بصرہ پڑھتے تھے)۔''[1]

▲ گھر لوٹ کر نفل نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، مسند احمد وغیرہ میں ہے: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر لوٹتے تھے تو دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔''[2]

▲ اگر کسی شخص کی نماز عید نکل گئی یا نماز کا آخری کچھ حصہ ملا تو وہ دو رکعتیں زائد (بارہ) تکبیرات کے ساتھ ادا کرے کیونکہ قضا ادا کے مطابق ہونی چاہیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد:

«فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا»

''جو امام کے ساتھ مل جائے وہ پڑھ لو اور جو حصہ رہ جائے اسے بعد میں مکمل کرلو۔''[3]

میں عموم ہے۔ اسی طرح جس کی ایک رکعت رہ جائے وہ ایک رکعت اور پڑھ لے۔ اگر کوئی شخص خطبہ عید کے دوران میں آئے تو وہ اولاً بیٹھ جائے اور خاموشی سے خطبہ سنے، پھر خطبہ کے بعد دو رکعتیں پڑھ لے۔ اگر زیادہ افراد ہوں تو باجماعت پڑھیں ورنہ اکیلا ہی پڑھ لے۔

▲ عیدین میں کوئی جس قدر چاہے تکبیریں پڑھے کوئی وقت کی پابندی نہیں۔ مرد بلند آواز سے تکبیریں کہیں جب کہ عورتیں اپنی آواز پست رکھیں۔ عیدین کی راتوں میں اور ذوالحجہ کے پہلے عشرے میں بھی تکبیریں کہی جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ﴾

''تاکہ تم گنتی پوری کرلو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں بیان کرو اور اس کا شکر کرو۔''[4]

گھروں، بازاروں، مساجد اور ہر مناسب جگہ پر اور عیدگاہ جاتے وقت کثرت سے تکبیریں بلند آواز سے پڑھی جائیں۔ سنن دارقطنی وغیرہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ جب عید الاضحیٰ یا عید الفطر کا دن ہوتا تو آپ صبح سویرے تکبیریں پڑھتے ہوئے نکلتے، عیدگاہ آنے تک باآواز بلند تکبیریں کہتے رہتے حتیٰ کہ نماز کے لیے امام آجاتا۔[5]

---

[1] المغني والشرح الكبير: 242/2. [2] مسند أحمد: 28/3و40، وسنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب ماجاء في الصلاة قبل صلاة العيد وبعدها، حديث: 1293. [3] صحيح البخاري، الأذان، باب قول الرجل: فاتتنا الصلاة، حديث: 635. [4] البقرة 2:185. [5] سنن الدارقطني، العيدين: 44/2، حديث: 1700.

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كُنَّا نُؤْمَرُ أَنْ نَّخْرُجَ يَوْمَ الْعِيدِ . . . حَتَّى نُخْرِجَ الْحُيَّضَ، فَيَكُنَّ خَلْفَ النَّاسِ فَيُكَبِّرْنَ بِتَكْبِيرِهِمْ»

''ہمیں حکم ہوتا کہ ہم عید کے دن نکلیں...... یہاں تک کہ حیض والی عورتوں کو بھی عیدگاہ لائیں اور وہ (خواتین) مردوں کے پیچھے رہیں اور ان کی طرح تکبیریں کہیں۔''[1]

شعائر اسلام کے اظہار کی خاطر تکبیر بلند آواز سے کہنا مستحب ہے

عیدالفطر کے دن تکبیریں کہنے کی نہایت تاکید ہے کیونکہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ﴾

''تاکہ تم گنتی پوری کرلو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں بیان کرو اور اس کا شکر کرو۔''[2]

عیدالاضحیٰ کے موقع پر باجماعت فرض نماز ادا کرنے کے بعد امام اور مقتدی بآواز بلند تکبیریں پڑھیں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ کے روز (9 ذوالحجہ) کو جب صبح کی نماز ادا کرتے تو اپنے صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے اور کہتے: اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ[3]

فرض نماز کے بعد تکبیرات غیر حاجی کے لیے نویں ذوالحجہ کی فجر سے لے کر ایام تشریق تیرہویں ذوالحجہ کی عصر تک ہیں۔ حاجی کے لیے یہ تکبیریں یوم النحر (عید کے دن) کی ظہر سے ایام تشریق (تیرہویں ذوالحجہ) کی عصر تک ہیں کیونکہ یوم النحر سے پہلے وہ تلبیہ میں مصروف ہوتا ہے۔

امام دارقطنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کرتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُكَبِّرُ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ يَوْمَ عَرَفَةَ إِلَى صَلَاةِ الْعَصْرِ مِنْ آخِرِ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ حِينَ يُسَلِّمُ مِنَ الْمَكْتُوبَاتِ»

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ کی صبح سے لے کر تیرہ ذوالحجہ کی عصر تک جب فرض نماز کے بعد سلام پھیرتے تو

[1] صحيح البخاري، العيدين، باب التكبير أيام منى وإذا غدا إلى عرفة، حديث:971، وصحيح مسلم، صلاة العيدين، باب ذكر إباحة خروج النساء في العيدين إلى المصلى......، حديث: 890. [2] البقرة 2:185. [3] [ضعيف] سنن الدارقطني، العيدين:2/49، حديث:1721.

تکبیریں پڑھتے تھے۔‘‘[1]

ایک اور روایت میں ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا صَلَّى الصُّبْحَ مِنْ غَدَاةِ عَرَفَةَ يُقْبِلُ عَلٰى أَصْحَابِهِ فَيَقُولُ: "عَلٰى مَكَانِكُمْ" وَيَقُولُ: اَللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ، اَللهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ»

’’رسول اللہ ﷺ جب عرفہ کی صبح کو نماز پڑھاتے، پھر ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے: ’’اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔‘‘ پھر آپ ﷺ تکبیر کہنی شروع کرتے: اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ‘‘[2]

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾

’’اور گنتی کے چند دنوں میں تم اللہ کو یاد کرو۔‘‘[3]

ان ایام سے مراد ’’ایام تشریق‘‘ ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’یہی بات راجح ہے اور اسی پر مسلمانوں کا عمل رہا ہے۔‘‘

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’تکبیرات کے بارے زیادہ درست قول یہی ہے کہ یوم عرفہ کی فجر سے لے کر آخر ایام تشریق (تیرہ ذوالحجہ) کی عصر تک ہر فرض نماز کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ جمہور سلف اور فقہاء صحابہ کا یہی موقف ہے۔[4] سنن میں روایت ہے: ’’یوم عرفہ، یوم النحر اور منیٰ کے ایام ہمارے اہل اسلام کی عید کے دن ہیں اور یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔‘‘[5] اور ایک روایت کے لفظ ہیں: ’’اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔‘‘[6] اور مُحرم آدمی یوم النحر کی ظہر کے بعد یہ تکبیریں کہے گا کیونکہ تلبیہ جمرہ عقبہ کی رمی کے بعد ختم ہوتا ہے، جبکہ رمی کا مسنون وقت چاشت کا وقت ہوتا ہے تو محرم اس وقت میں حلال آدمی کی طرح ہے۔ اگر فجر سے قبل جمرہ عقبہ کی رمی کر دی تو بھی

[1] [ضعيف] سنن الدارقطني، العيدين:2/48، حديث: 1719. [2] [ضعيف] سنن الدارقطني، العيدين:2/49، حديث:1721. [3] البقرة2:203. [4] مجموع الفتاوى لابن تيمية:24/220. [5] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في كراهية صوم أيام التشريق، حديث:773، وسنن أبي داود، الصيام، باب صيام أيام التشريق، حديث:2419، وسنن النسائي المناسك، باب النهي عن صوم يوم عرفة، حديث:3007. [6] سنن أبي داود، الضحايا، باب حبس لحوم الأضاحي، حديث:2813.

وہ ظہر کے بعد تکبیرات کہنا شروع کرے کیونکہ اکثر لوگوں کا عمل یہی ہے کہ وہ رمی چاشت کے وقت کرتے ہیں اور تکبیرات ظہر کے بعد کہتے ہیں۔

◣ عید سے فراغت کے بعد ایک دوسرے کو مبارک باد کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس روز مسلمان بھائی سے ملاقات کرتے وقت یہ کلمات کہنے مناسب ہیں: تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكَ ''اللہ تعالیٰ ہمارا اور تمھارا عمل قبول کرے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مبارک باد کا عمل ثابت ہے۔ اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی رخصت دی ہے۔''[1]

مبارک باد کا مقصد پیار و محبت اور خوشی کا اظہار ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں مبارک دینے میں پہل نہیں کرتا، البتہ اگر کوئی مبارک دے تو اسے جواب دے دیتا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے جب کہ مبارک باد کی ابتدا کرنا ایسی سنت نہیں جس کا حکم ہو اور نہ ہی یہ منع ہے۔''[2]

◣ مبارک دیتے وقت مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

نمازکسوف کے احکام

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے سورج کو چمک والا بنایا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کر سکو۔ یہ (سب کچھ) اللہ نے حق ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی آیتیں تفصیل سے بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔''[3]

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝﴾

[1] مجموع الفتاوٰی لشیخ الإسلام ابن تیمیة رحمه الله: 253/24. [2] مجموع الفتاوٰی: 253/24. [3] یونس 5:10.

"اور دن اور رات اور سورج اور چاند بھی (اس کی) نشانیوں میں سے ہیں، تم سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ سجدہ اس اللہ کے لیے کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے، اگر واقعی تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔"[1]

▲ نمازِ کسوف کے سنت مؤکدہ ہونے میں علماء کا اتفاق ہے کیونکہ یہ نماز رسول اللہ ﷺ کے عمل ہی سے ثابت ہے۔

▲ سورج یا چاند کا گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝﴾

"ہم تو لوگوں کو دھمکانے کے لیے ہی نشانات بھیجتے ہیں۔"[2]

▲ عہد نبوی میں سورج کو گرہن لگا تو آپ ﷺ چادر گھسیٹتے ہوئے گھبراہٹ کے ساتھ جلدی میں مسجد کی طرف آئے، لوگوں کو نماز پڑھائی اور انھیں بتایا کہ یہ گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک ایسی نشانی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، نیز لوگوں پر عذاب کے نازل ہونے کا سبب ہو سکتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے خاتمے کے لیے چند اعمال صالحہ کی طرف توجہ دلائی۔ آپ ﷺ نے ایسی صورت حال میں گرہن کے صاف ہونے تک نماز، دعا، استغفار، صدقہ اور غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا، مقصد یہ تھا کہ اس صورت حال میں لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور رجوع کریں۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ گرہن کسی عظیم شخصیت کی ولادت یا وفات کے موقع پر ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس اعتقاد کو باطل قرار دیا اور اس کے بارے میں حکمت الٰہیہ کی وضاحت فرما دی۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں جس روز آپ ﷺ کا فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہوا، اتفاقاً اسی روز سورج کو گرہن بھی لگ گیا، لوگوں نے کہا کہ ابراہیم کی موت کے سبب سورج کو گرہن لگا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

«إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ، يُخَوِّفُ اللهُ بِهِمَا عِبَادَهُ، وَإِنَّهُمَا لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ، فَإِذَا رَأَيْتُمْ مِّنْهَا شَيْئًا فَصَلُّوا وَادْعُوا اللهَ حَتَّى يُكْشَفَ مَا بِكُمْ»

[1] حٰمٓ السجدة 37:41. [2] بنی إسرآءيل 59:17.

''سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ یہ کسی انسان کی موت یا زندگی کی وجہ سے بے نور نہیں ہوتے، جب تم انھیں ایسا ہوتے ہوئے دیکھو تو اس وقت تک نماز پڑھتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو جب تک کہ (گرہن) ختم نہ ہو جائے۔''[1]

صحیحین کی ایک روایت میں ہے:

«فَادْعُوا اللهَ وَصَلُّوا حَتَّى يَنْجَلِيَ»

''جب تک وہ صاف نہ ہو جائے تب تک دعا اور نماز میں مشغول رہو۔''[2]

صحیح بخاری میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ نے فرمایا:

«هٰذِهِ الْآيَاتُ الَّتِي يُرْسِلُ اللهُ لَا تَكُونُ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهِ، وَلٰكِنْ يُّخَوِّفُ اللهُ بِهَا عِبَادَهُ، فَإِذَا رَأَيْتُمْ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ فَافْزَعُوا إِلٰى ذِكْرِ اللهِ وَدُعَائِهِ وَاسْتِغْفَارِهِ»

''یہ نشانیاں جنھیں اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا رہتا ہے، یہ کسی کی موت یا کسی کی زندگی (پیدائش) کی وجہ سے ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، جب تم یہ دیکھ لو تو اللہ کے ذکر اور اس سے دعا و استغفار میں مشغول ہو جاؤ۔''[3]

اللہ تعالیٰ سورج اور چاند پر گرہن طاری کر کے ان دو عظیم نشانیوں کو اس لیے دکھاتا ہے کہ لوگ عبرت حاصل کریں اور انھیں علم ہو کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ہیں، دیگر مخلوقات کی طرح ان میں بھی نقص اور تغیر ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو بتاتا ہے کہ ہر چیز پر قدرت صرف اسے ہی حاصل ہے۔ بنابریں وہ اکیلا ہی عبادت کے لائق ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○﴾

[1] صحيح البخاري، الكسوف، باب الدعاء في الكسوف، حديث: 1060، وصحيح مسلم، الكسوف، باب ذكر النداء بصلاة الكسوف: الصلاة جامعة، حديث: 911 واللفظ له. [2] صحيح البخاري، الكسوف، باب الدعاء في الكسوف، حديث: 1060، وصحيح مسلم، الكسوف، باب ذكر النداء بصلاة الكسوف: الصلاة جامعة، حديث: 915. [3] صحيح البخاري، الكسوف، باب الذكر في الكسوف، حديث: 1059.

''اور اسی (اللہ) کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند بھی ہیں۔ تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، اگر واقعی تم اسی کی عبادت کرتے ہو تو تم اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان (سب) کو پیدا کیا ہے۔''[1]

▲ نمازکسوف کا وقت گرہن لگنے سے شروع ہوتا ہے اور اس کے ختم ہونے تک رہتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«فَإِذَا رَأَيْتُمْ مِّنْهَا شَيْئًا فَصَلُّوا وَادْعُوا اللهَ حَتَّى يُكْشَفَ مَابِكُمْ»

''جب تم ایسا ہوتے ہوئے دیکھو تو اس وقت تک نماز پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو جب تک کہ (گرہن) ختم نہ ہو جائے۔''[2]

▲ گرہن ختم ہو جانے کے بعد نمازکسوف کی قضا نہیں ہے کیونکہ اب اس کا موقع ختم ہو چکا ہے۔ اسی طرح اگر گرہن ختم ہو جانے کے بعد اس کا علم ہوا تو نمازکسوف نہ پڑھی جائے۔

▲ نمازکسوف کا طریقہ یہ ہے کہ امام دو رکعتیں پڑھائے جن میں بآواز بلند قراءت ہو۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی لمبی سی سورت (مثلاً: سورۂ بقرہ وغیرہ) پڑھے، پھر لمبا سا رکوع کرے، پھر سر اٹھائے اور سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہے۔ سیدھا کھڑے ہو کر (عام نماز کی طرح) پھر سورۂ فاتحہ کے بعد پہلی سورت سے قدرے کوئی چھوٹی سورت (مثلاً: آل عمران) پڑھے۔ پھر دیر تک رکوع میں رہے جو پہلے رکوع سے قدرے چھوٹا ہو۔ پھر سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، کہتے ہوئے رکوع سے سر اٹھائے اور قومے کی دعا رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيهِ، مِلْءَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْءَ الْأَرْضِ وَمِلْءَ مَابَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَاشِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ پڑھے اور تادیر کھڑا رہے۔ پھر لمبے لمبے دو سجدے کرے، دونوں سجدوں کے درمیان زیادہ دیر نہ بیٹھے، پھر اسی طرح دوسری رکعت ادا کرے کہ اس میں پہلی رکعت کی طرح دو لمبے لمبے قیام اور رکوع ہوں اور دو ہی لمبے سجدے ہوں، پھر تشہد پڑھے اور سلام پھیر دے۔

نمازکسوف کا یہی وہ مسنون طریقہ ہے جو رسول اللہ ﷺ سے متعدد طرق سے صحیحین وغیرہ میں منقول ہے، جن میں سے ایک طریق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جسے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے اپنی اپنی صحیح میں درج کیا ہے، چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

[1] حٰمٓ السجدة 41:37. [2] صحيح البخاري، الكسوف، باب الدعاء في الكسوف، حديث: 1060، وصحيح مسلم، الكسوف، باب ذكر النداء بصلاة الكسوف: الصلاة جامعة، حديث:911 واللفظ له.

«قَالَتْ: خَسَفَتِ الشَّمْسُ فِي حَيَاةِ النَّبِيِّ ﷺ، فَخَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ فَصَفَّ النَّاسُ وَرَاءَهُ فَكَبَّرَ فَاقْتَرَأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قِرَاءَةً طَوِيلَةً، ثُمَّ كَبَّرَ فَرَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلاً، ثُمَّ قَالَ: سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، فَقَامَ وَلَمْ يَسْجُدْ وَقَرَأَ قِرَاءَةً طَوِيلَةً، هِيَ أَدْنٰى مِنَ الْقِرَاءَةِ الْأُولٰى، ثُمَّ كَبَّرَ وَرَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلاً وَّهُوَ أَدْنٰى مِنَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ قَالَ: سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ قَالَ فِي الرَّكْعَةِ الْآخِرَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ، فَاسْتَكْمَلَ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ فِي أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ، وَانْجَلَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَنْ يَّنْصَرِفَ»

''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں سورج گرہن ہوگیا تو آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو لوگوں نے آپ کے پیچھے صفیں بنائیں۔ آپ نے تکبیر کہی اور لمبی قراءت کی، پھر اللّٰہ أکبر کہا اور لمبا رکوع کیا، پھر سمع اللّٰہ لمن حمدہ کہتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور سجدہ نہ کیا بلکہ قراءت شروع کی جو کہ پہلی قراءت کی نسبت کچھ کم تھی، پھر تکبیر کہی اور لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع کی نسبت چھوٹا تھا، پھر سمع اللّٰہ لمن حمدہ، ربنا ولك الحمد کہا، پھر سجدہ کیا، پھر دوسری رکعت بھی اسی طرح ادا کی، آپ نے (دو رکعتوں والی نماز) چار رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ نماز مکمل کی، نماز سے فارغ ہونے تک سورج صاف ہو چکا تھا۔''[1]

- مسنون یہ ہے کہ نماز کسوف باجماعت ادا کی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔ اگرچہ یہ نماز بھی (دیگر نوافل کی طرح) فرداً فرداً جائز ہے لیکن باجماعت ادا کرنا افضل ہے۔
- نماز کسوف ادا کر لینے کے بعد امام کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو وعظ ونصیحت کرے۔ ان کی غفلت اور لاپرواہی پر تنبیہ کرے۔ دعا واستغفار کا حکم دے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«ثُمَّ انْصَرَفَ . . . فَخَطَبَ النَّاسَ فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ لَا يَنْخَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمْ ذٰلِكَ فَاذْكُرُوا اللهَ وَكَبِّرُوا وَصَلُّوا وَتَصَدَّقُوا»

''نبی ﷺ جب نماز کسوف سے فارغ ہوئے...... تو لوگوں سے مخاطب ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی

[1] صحيح البخاري، الكسوف، باب خطبة الإمام في الكسوف، حديث: 1046، وصحيح مسلم، الكسوف، باب صلاة الكسوف، حديث:901.

اور فرمایا: یہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، یہ کسی کی موت یا زندگی (پیدائش) کی وجہ سے بے نور نہیں ہوتے جب تم ایسا ہوتے ہوئے دیکھو تو اللہ کو یاد کرو، تکبیرات کہو، نماز پڑھو اور صدقہ کرو۔"[1]

▲ اگر گرہن ختم ہونے سے پہلے ہی نماز مکمل ہو جائے تو دوبارہ نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دعا میں مصروف ہو جانا چاہیے۔ اگر نماز کے دوران میں گرہن ختم ہو جانے کا علم ہو جائے تو نماز کو توڑا نہ جائے بلکہ مختصر کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تُبْطِلُوٓا أَعْمَالَكُمْ ۝﴾ "اور اپنے اعمال کو غارت نہ کرو۔"[2]

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "نماز کسوف گرہن کے ختم ہونے تک ہے۔"[3]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "کسوف کا دورانیہ کبھی لمبا ہوتا ہے اور کبھی چھوٹا کیونکہ کبھی سارا حصہ گرہن زدہ ہو جاتا ہے اور کبھی نصف اور کبھی ایک تہائی حصہ، جب زیادہ حصے کو گرہن لگے تب پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ یا اس جیسی لمبی سورت کی قراءت کرے، پھر ایک رکوع کے بعد پہلی سورت سے کم لمبی سورت کی قراءت کی جائے۔ اس بارے میں ہم احادیث صحیحہ کا ذکر کر چکے ہیں۔"

نماز کسوف میں تخفیف اس کے سبب کے زائل ہو جانے کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح اگر معلوم ہو کہ گرہن زیادہ دیر نہیں رہے گا یا نماز شروع کرنے سے پہلے ہی کم ہونا شروع ہو جائے گا تو نماز شروع کر دے لیکن مختصر پڑھے جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے کیونکہ یہ نماز کسی علت کی وجہ سے شروع کی تھی اور وہ اب زائل ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر نماز شروع کرنے سے قبل ہی گرہن ختم ہو گیا تو تب نماز کسوف پڑھنے کی ضرورت نہیں۔[4]

نماز استسقا کے احکام

یہاں استسقا سے مراد اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کرنا ہے۔ کسی فریاد رس سے فریاد کرنا نفوس انسانیہ کی فطرت اور جبلت ہے۔ اور حقیقی فریاد رس اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ نماز استسقا سابقہ امتوں میں بھی معروف تھی، لہٰذا یہ انبیائے

[1] صحيح البخاري، الكسوف، باب الصدقة في الكسوف، حديث: 1044، وصحيح مسلم، الكسوف، باب صلاة الكسوف، حديث: 901. [2] محمد 47:33. [3] صحيح البخاري، الكسوف، باب الدعاء في الكسوف، حديث: 1060,1040، وصحيح مسلم، الكسوف، باب ما عرض على النبي ﷺ في صلاة الكسوف من أمر الجنة والنار، حديث: 904و915. [4] مجموع الفتاوى لشيخ الإسلام ابن تيمية: 260/24.

کرام علیہم السلام کی سنن میں سے ایک سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ﴾ ''اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا۔''[1]

خود رسول اللہ ﷺ نے متعدد مرتبہ بارش کی دعا کی، جس کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ اس نماز کی مشروعیت پر اہل علم کا اجماع ہے۔

✍ جب عرصہ دراز تک بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین بنجر اور خشک ہو رہی ہو اور اس کی وجہ سے لوگوں کا نقصان ہو رہا ہو، تب ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر فریاد کریں اور بارش کی درخواست کریں، کبھی تو باجماعت نماز استسقا پڑھی جائے یا اکیلے اکیلے بارش کی دعا کی جائے اور کبھی خطبۂ جمعہ میں صرف دعا کی جائے۔ اس کے لیے خطبۂ جمعہ میں بھی دعا کرنا درست ہے کہ امام دعا کرے اور سامعین اس کی دعا پر آمین کہیں۔ فرض نماز کے بعد طلبِ بارش کی دعا کرنا بھی صحیح ہے۔ اسی طرح تنہائی میں (خطبہ اور نماز کے بغیر) بھی دعا کرنا درست ہے۔

✍ نماز استسقا سنت مؤکدہ ہے، چنانچہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ يَسْتَسْقِي، فَتَوَجَّهَ إِلَى الْقِبْلَةِ يَدْعُو، وَحَوَّلَ رِدَاءَهُ، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ يَجْهَرُ فِيهِمَا بِالْقِرَاءَةِ»

''ایک مرتبہ نبی ﷺ طلب باراں کے لیے نکلے، قبلہ رو ہوئے، دعا کی اور اپنی چادر کو پلٹایا پھر دو رکعتیں اونچی قراءت سے پڑھائیں۔''[2]

✍ نماز استسقا مقام اور احکام کے لحاظ سے نماز عید کی طرح ہے، یعنی نماز عید کی طرح اسے کھلے میدان میں ادا کرنا مستحب ہے۔ احکام میں یکسانیت یوں ہے کہ نماز عید کی طرح نماز استسقا کی بھی دو رکعتیں ہیں، بلند آواز سے قراءت ہوتی ہے۔ خطبہ سے پہلے نماز استسقا پڑھی جاتی ہے۔ قراءت شروع کرنے سے پہلے بارہ تکبیریں بھی دونوں رکعتوں میں کہی جاتی ہیں۔[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«وَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ كَمَا كَانَ يُصَلِّي فِي الْعِيدِ»

[1] البقرة 2:60. [2] صحيح البخاري، الاستسقاء، باب الجهر بالقراءة في الاستسقاء، حديث: 1025,1024، وصحيح مسلم، كتاب وباب صلاة الاستسقاء، حديث: 894.

[3] نماز استسقا میں بارہ تکبیریں کہنے کی کوئی صحیح روایت نہیں مل سکی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ روایت میں نماز استسقا کی نماز عید سے مشابہت ومماثلت صرف تعداد رکعات کے اعتبار سے واضح ہوتی ہے۔ (فاروق صارم)

''نبی ﷺ نے نماز عید کی طرح نماز استسقا کی دو رکعتیں پڑھائیں۔''[1]

▲ امام نماز استسقا کی پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی قراءت کرے۔

▲ اہل شہر نماز استسقا کھلے میدان میں ادا کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نماز کھلے میدان ہی میں ادا کی تھی۔ علاوہ ازیں اس میں اللہ کے حضور عاجزی اور احتیاج کا خوب اظہار ہوتا ہے۔

▲ جب نماز استسقا کے لیے باہر نکلنے کا ارادہ ہو تو امام کو چاہیے کہ پہلے عام لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی جزا و سزا سن کر ان کے دل نرم ہو جائیں، معاصی سے توبہ کرنے اور غصب شدہ حقوق حق داروں کو ادا کرنے کی تلقین کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بارش کے رک جانے اور برکات کے منقطع ہو جانے کا اکثر سبب بن جاتی ہے جبکہ توبہ و استغفار دعا کی قبولیت کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾

''اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز گاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔''[2]

نیز امام لوگوں کو فقراء و مساکین پر صدقہ و خیرات کرنے کا حکم دے کیونکہ یہ چیز بھی نزول رحمت کا سبب ہوتی ہے۔ پھر نماز استسقا کے لیے کوئی دن مقرر کر کے اعلان کرے تاکہ اس موقع کی مناسبت سے لوگ مسنون طریقے سے تیاری کر کے گھر سے نکلیں۔ پھر لوگ نہایت عاجزی اور تذلل کے ساتھ اور فقیرانہ حالت میں مقررہ دن کھلے میدان میں جائیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

«إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ خَرَجَ مُتَبَذِّلًا ، مُتَوَاضِعًا ، مُتَضَرِّعًا»

''رسول اللہ ﷺ استسقا کے لیے نکلے تو آپ ﷺ کی حالت و کیفیت نہایت تذلل، تواضع، خشوع اور عجز و مسکینی والی تھی''۔[3]

▲ جو شخص بھی وہاں جانے کی طاقت رکھتا ہو اسے جانا چاہیے، کسی کو پیچھے نہیں رہنا چاہیے حتیٰ کہ بچوں کو اور عورتوں کو

[1] جامع الترمذي، الجمعة، باب ما جاء في صلاة الاستسقاء، حديث :559,558، والمستدرك للحاكم، الاستسقاء، 327,326/1، حديث : 1219,1218. [2] الأعراف 96:7. [3] جامع الترمذي، الجمعة، باب ما جاء في صلاة الاستسقاء، حديث : 558.

(جن سے کسی فتنے کا خوف نہیں) بھی شریک ہونا چاہیے۔

امام انھیں دو رکعتیں پڑھائے، پھر ایک خطبہ دے۔ بعض علماء دو خطبوں کے قائل ہیں۔ بہرحال اس امر میں وسعت ہے، البتہ ایک خطبہ پر اکتفا کرنا دلائل کے اعتبار سے راجح ہے۔ اسی طرح نماز استسقا کے بعد خطبہ دینا آپ ﷺ کا عام معمول تھا۔ اہل علم کے ہاں یہی معمول بہ اور راجح ہے۔ بعض روایات میں آپ کا نماز سے پہلے خطبہ دینے کا ذکر ہے اور علماء اس کے قائل بھی ہیں جبکہ درست بات پہلے والی ہے۔

◢ امام کو چاہیے کہ خطبۂ استسقا میں کثرت سے استغفار کرے اور اس مضمون سے متعلقہ آیات کی قراءت کرے کیونکہ توبہ و استغفار بھی بارش کے نزول کا سبب ہے۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے نزول بارش کی زیادہ سے زیادہ دعا کرے۔ رسول اللہ ﷺ بارش کے لیے اس قدر ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دیتی تھی۔ نبی ﷺ پر درود پڑھے کیونکہ یہ بھی قبولیت دعا کے اسباب میں سے ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے امام کو وہ دعائیہ کلمات کہنے چاہئیں جو نبی ﷺ سے منقول ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾

”یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (ﷺ) میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے۔“[1]

◢ مسنون یہ ہے کہ دعا کے وقت امام قبلہ رو ہو اور اپنی چادر کو پلٹائے جس کی صورت یہ ہے کہ چادر کندھوں پر ڈالے، پھر چادر کا جو کنارہ دائیں کندھے پر ہو اسے بائیں اور جو بائیں کندھے پر ہو اسے دائیں کندھے پر کرے، صحیحین کی روایت ہے:

«فَحَوَّلَ إِلَى النَّاسِ ظَهْرَهُ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ يَدْعُو، ثُمَّ حَوَّلَ رِدَاءَهُ . . .»

”رسول اللہ ﷺ نے اپنی پشت لوگوں کی طرف کی اور قبلہ رو ہو کر دعا کی، پھر چادر کو پلٹایا......۔“[2]

اس میں شاید حکمت یہ ہے کہ یہ اس خواہش کا اظہار ہے کہ چادر کی طرح ہماری بدحالی کی حالت خوشحالی میں بدل جائے۔ سامعین و حاضرین بھی اپنی اپنی چادریں پلٹائیں، چنانچہ مسند احمد میں روایت ہے کہ ”لوگوں نے بھی اپنی چادریں پلٹائیں تھیں۔“[3]

[1] الأحزاب 21:33. [2] صحيح البخاري، الاستسقاء، باب كيف حول النبيﷺ ظهره إلى الناس، حديث: 1025، وصحيح مسلم، كتاب و باب صلاة الاستسقاء، حديث: 894. [3] مسند أحمد: 41/4.

نیز جو حکم رسول اللہ ﷺ کے حق میں ثابت ہے وہ آپ ﷺ کی امت کے حق میں بھی ثابت ہے الا یہ کہ کسی دلیل سے وہ نبی ﷺ کا خاصہ ثابت ہو جائے۔ پھر اگر بارش ہو جائے تو ٹھیک ورنہ دوسری یا تیسری بار بھی نماز استسقا پڑھی جائے کیونکہ حاجت وضرورت اس کی متقاضی ہے۔

- جب بارش ہو تو ابتدا میں اس کے نیچے کھڑا ہونا چاہیے تا کہ اسے باران رحمت لگے اور زبان سے یہ کہے: اَللّٰهُمَّ صَيِّبًا نَّافِعًا ''اے اللہ! اسے مفید بارش بنا۔''[1]

اور یہ بھی کہے: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ ''ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے سبب بارش ملی ہے۔''[2]

- اگر بارش کا پانی حد سے بڑھتا ہوا نظر آئے اور نقصان کا اندیشہ ہو تو کہے:

«اَللّٰهُمَّ! حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا . اَللّٰهُمَّ! عَلَى الْآكَامِ وَالْجِبَالِ وَالظِّرَابِ وَالْأَوْدِيَةِ وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ»

''اے اللہ! ہمارے اردگرد (بارش برسا) ہم پر نہ برسا، اے اللہ! ان بادلوں کو بڑے ٹیلوں، پہاڑوں، چھوٹے ٹیلوں، وادیوں اور جنگلوں پر برسا۔''[3] رسول اللہ ﷺ یہی کلمات کہا کرتے تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، الاستسقاء، باب ما يقال إذا مَطَرتُ، حديث : 1032. [2] صحيح البخاري، الاستسقاء، باب قول الله تعالى: ﴿وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ﴾ ، حديث: 1038. [3] صحيح البخاري، الاستسقاء، باب الاستسقاء في المسجد الجامع، حديث : 1013، وصحيح مسلم، الاستسقاء، باب الدعاء في الاستسقاء، حديث : 897.

جنازے کے احکام

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہماری شریعت ایک کامل شریعت ہے جو انسان کی زندگی اور موت کے بعد تمام مصلحتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں جنازے کے وہ احکام بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جاری و ساری فرمائے ہیں جن کا تعلق انسان کی بیماری اور موت سے لے کر قبر میں دفن کرنے تک ہے، یعنی مریض کی بیمار پرسی کرنا، اسے کلمۂ اخلاص کی تلقین کرنا، غسل دینا، کفن پہنانا، اس کی نماز جنازہ ادا کرنا اور دفن کرنے کے سب احکام ہیں اور ان کے ضمن میں ادائیگیٔ قرض، اجرائے وصیت، تقسیم ترکہ اور اس کی ضعیف و ناتواں اولاد کی نگہداشت اور سرپرستی کے مسائل بھی ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جنازہ اور اس سے متعلق جملہ امور کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ایسی مکمل ہدایات دی ہیں جو ہمیں دیگر امتوں سے ممتاز کرتی ہیں اور مکمل احوال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر مشتمل ہیں، نیز میت کے ساتھ احسان کرنے اور اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے پر مشتمل ہیں جو اسے قبر اور آخرت میں فائدہ دیں، مثلاً: مریض کی عیادت کرنا، میت کو کلمۂ خیر کی تلقین کرنا، اسے پاک صاف کرنا، ادب و احترام کے ساتھ قبرستان لے جانا۔ پھر میت کے مسلمان بھائی صف بندی کر کے اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے رب کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں، نبی ﷺ کی ذات پر درود شریف بھیجتے ہیں۔ پھر میت کے لیے مغفرت، رحمت اور اسے معاف کرنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں، پھر اس کی قبر پر کھڑے ہو کر قبر کے امتحان کے موقع پر اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وقتاً فوقتاً اس کی قبر کی زیارت کی جاتی ہے اور دعا ہوتی ہے۔ ان تمام امور میں اس کا ایسے خیال رکھا جاتا ہے جس طرح زندگی میں ایک شخص اپنے ساتھی کا خیال رکھتا ہے، پھر اس کے اہل و عیال، اقارب وغیرہ سے احسان و بھلائی کی جاتی ہے۔''[1]

✽ مسنون یہ ہے کہ ہر مسلمان موت کو کثرت سے یاد کرے، گناہوں اور معاصی سے توبہ کرے، آخرت کی تیاری کرے، ظلم و زیادتی کر کے جن کے حقوق غصب کیے ہیں انھیں واپس کرے اور موت کے اچانک حملے سے قبل اعمال صالحہ انجام دینے میں خود کو مصروف رکھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

① زاد المعاد :498/1 بتصرف یسیر.

«أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ» ”لذتوں کو توڑنے والی (موت) کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو۔“[1]

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِسْتَحْيُوا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ. قَالَ: قُلْنَا: يَا نَبِيَّ اللهِ! إِنَّا لَنَسْتَحْيِي وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، قَالَ: لَيْسَ ذَاكَ وَلٰكِنَّ الْإِسْتِحْيَاءَ مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ أَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعٰى، وَتَحْفَظَ الْبَطْنَ وَمَا حَوٰى، وَتَتَذَكَّرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى، وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا، فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيٰى، يَعْنِي مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ»

”اللہ تعالیٰ سے کما حقہ حیا کرو۔ صحابۂ کرام نے کہا: اے اللہ کے نبی! ہم اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس طرح نہیں بلکہ جو اللہ تعالیٰ سے کما حقہ حیا کرتا ہے وہ سر کی اور جو سر (دماغ) میں (سوچ) ہے اس کی حفاظت کرے، پیٹ اور جو پیٹ نے جمع کیا ہے اس کا خیال رکھے (کہ اس میں حرام تو نہیں داخل ہو رہا) موت اور بوسیدگی کو یاد رکھے جو آخرت کا طالب ہوتا ہے وہ دنیا کی زینت کو ترک کر دیتا ہے، جس شخص نے ایسا کیا اس نے اللہ تعالیٰ سے اس طرح حیا کی جس طرح اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔“[2]

مریض اور قریب الوفات شخص کے احکام: جب کسی انسان کو کوئی مرض لاحق ہو جائے تو وہ ثواب کی نیت سے صبر سے کام لے، جزع فزع نہ کرے، اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر ناراضی کا اظہار نہ کرے، البتہ اپنی بیماری کا سبب یا اس کی نوعیت سے متعلق کسی کو بتائے تو کوئی حرج نہیں لیکن اسے بہر صورت اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے مرض کا شکوہ کرنا اور اس سے شفا کی درخواست کرنا صبر کے منافی نہیں بلکہ یہ امر شرعاً مطلوب اور مستحب ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے رب کو یوں پکارا تھا:

﴿أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ۝﴾

”(اے میرے پروردگار!) بے شک مجھے یہ بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے

[1] جامع الترمذي، الزهد، باب ما جاء في ذكر الموت، حديث :2460,2307، وسنن النسائي، الجنائز، باب كثرة ذكر الموت، حديث : 1825، وسنن ابن ماجه، الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له، حديث : 4258، ومسند أحمد :2/292-293. [2] [ضعيف] جامع الترمذي، صفة القيامة، باب في بيان ما يقتضيه الاستحياء من الله حق الحياء، حديث :2458، وضعيف الجامع الصغير وزيادته، حديث : 806,805.

والا ہے۔''[1]

▲ جائز ادویات کے ذریعے علاج کروانے میں کوئی حرج نہیں بلکہ بعض علماء تو اسے ضروری قرار دیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ علاج و معالجہ کا حکم بہت سی احادیث میں بھی مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج توکل علی اللہ کے منافی نہیں، جیسا کہ بھوک پیاس دور کرنے کے لیے کھانا پینا توکل کے خلاف نہیں۔

▲ حرام اشیاء کے ذریعے سے علاج کروانا قطعاً جائز نہیں کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نشہ آور شے کے بارے میں فرمایا:

«إِنَّ اللهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ»

''اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کردہ اشیاء میں تمھارے لیے شفا نہیں رکھی۔''[2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ أَنْزَلَ الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ وَجَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً، فَتَدَاوَوْا وَلَا تَتَدَاوَوْا بِحَرَامٍ»

''اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا نازل کی اور ہر بیماری کی دوا مقرر کی ہے، لہٰذا تم علاج کرو لیکن تم حرام چیزوں کے ساتھ علاج نہ کرو۔''[3]

صحیح مسلم میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے متعلق فرمایا: [إِنَّهُ لَيْسَ بِدَوَاءٍ، وَلٰكِنَّهُ دَاءٌ] ''یہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے۔''[4]

▲ ایسی اشیاء سے علاج کروانا جو عقیدۂ اسلام کے منافی ہوں، قطعاً حرام ہے، مثلاً: شرکیہ یا مجہول الفاظ پر مشتمل تعویذ لٹکانا یا منکے، دھاگے کا استعمال کرنا، گلے میں مختلف اشیاء کے ہار ڈالنا، بازو، کلائی میں کڑے وغیرہ پہننا اور اس سے شفا کا عقیدہ رکھنا، نظر و بلا کے لیے دافع سمجھنا، سب کام حرام ہیں کیونکہ اس میں حصول نفع اور ازالۂ ضرر کے لیے انسان کے دل کا تعلق اللہ تعالیٰ کی بجائے غیر اللہ کی طرف ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ تمام کام شرک ہیں یا شرک کے وسائل اور ذرائع ہیں۔ نیز کاہنوں، نجومیوں، جادوگروں اور جنوں سے خدمت لینے والوں کے ذریعے سے علاج کروانا بھی حرام ہے۔ ایک مسلمان کا عقیدہ اس کی صحت سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء

[1] الأنبياء 83:21. [2] رواه البخاري معلقا، الأشربة، باب شراب الحلواء والعسل، قبل حديث: 5614. [3] [ضعيف الإسناد] سنن أبي داود، الطب، باب في الأدوية المكروهة، حديث: 3874. [4] صحيح مسلم، الأشربة، باب تحريم التداوي بالخمر و بيان أنها ليست بدواء، حديث: 1984.

میں شفا رکھی ہے جو جائز ہیں اور بدن، عقل اور دین کے لیے مفید ہیں۔ سب سے اہم چیز قرآن مجید اور مسنون دعاؤں کے ذریعے سے دم کرنا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سب سے بہتر علاج ذکر و دعا کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنا اور توبہ واستغفار کرنا ہے۔ ان کا اثر دواؤں کے اثر سے بڑھ کر ہے لیکن اس کا دارومدار اس امر پر ہے کہ نفس انسانی اس کے لیے کس حد تک تیار ہے اور اسے قبول کرتا ہے۔''[1]

علاوہ ازیں ہسپتالوں وغیرہ میں تشخیص علاج میں ماہر ڈاکٹروں سے جائز ادویہ کے ذریعے سے علاج کروانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

▲ مریض کی بیمار پرسی کرنا مسنون ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«خَمْسٌ تَجِبُ لِلْمُسْلِمِ عَلٰى أَخِيهِ . . .»

''ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں......''[2] ان میں سے ایک حق بیمار کی بیمار پرسی ہے۔

جب آپ بیمار پرسی کے لیے جائیں تو بیمار کا حال دریافت کریں، خود نبی ﷺ مریض کے قریب جاتے اور اس کا حال دریافت کرتے تھے۔ بیمار پرسی ایک دن چھوڑ کر بھی دو دن چھوڑ کر کرنی چاہیے، البتہ اگر مریض کی خواہش ہو تو روزانہ بھی عیادت کی جاسکتی ہے۔ مریض کی رغبت کے بغیر اس کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھے اور مریض سے یوں کہے:

«لَا بَأْسَ عَلَيْكَ، طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ»

''تم پر کوئی حرج نہیں، إن شاء اللہ تم (بیماری کی وجہ سے) گناہوں سے پاک ہو جاؤ گے۔''[3]

مریض کے پاس بیٹھ کر ایسی باتیں کریں جن سے اسے خوشی ہو، اس کی شفا کے لیے دعا کریں، آیات قرآنیہ کے ساتھ دم کریں۔ خاص طور پر سورۂ فاتحہ، اخلاص اور معوذتین پڑھ کر دم کریں۔

▲ یہ بھی مسنون ہے کہ مریض اپنے مال کے بارے میں وصیت کرے کہ اسے اچھے کاموں میں صرف کیا جائے۔ اگر اس پر قرضہ ہو یا اس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں تو اس سے ورثاء کو آگاہ کرے بلکہ ان باتوں کی فکر اسے

[1] زاد المعاد: 144/4. [2] صحيح البخاري، الجنائز، باب الأمر باتباع الجنائز، حديث: 1240، وصحيح مسلم، السلام، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام، حديث: 2162 واللفظ له . [3] صحيح البخاري، التوحيد، باب في المشيئة والإرادة، حديث: 7470.

حالت صحت میں بھی ہونی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَا حَقُّ امْرِیءٍ مُّسْلِمٍ لَّهُ شَيْءٌ يُّوصِي فِيهِ يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ»

''ہر مسلمان شخص کا حق ہے کہ اگر وہ کوئی وصیت کرنا چاہتا ہے تو دو راتیں بھی نہ گزرنے دے، مگر اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی محفوظ ہونی چاہیے۔''[1]

واضح رہے، حدیث میں دو راتوں کا ذکر بطور تاکید کے ہے، یہ کوئی حد بندی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہونی چاہیے کیونکہ کوئی پتہ نہیں کہ موت کا وقت کب آ جائے۔

▲ بیمار شخص اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن رکھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

«أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي»

''میں اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق رویہ اختیار کرتا ہوں۔''[2]

جب کسی بندے کو اپنے خالق کے پاس جانے کا احساس ہو جائے تب اس ''حسن ظن'' کی زیادہ ہی ضرورت ہے۔

▲ جو شخص قریب الوفات ہو اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید ولائی جائے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے امید کا پہلو خوف کے پہلو پر غالب آ جائے، البتہ حالت صحت میں امید اور خوف کے دونوں پہلو مساوی رہنے چاہئیں کیونکہ اگر خوف کا پہلو غالب ہوگا تو وہ مایوس ہو جائے گا اور اگر امید کا پہلو غالب ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ کی اچانک آ جانے والی سزا سے بے خوف ہو جائے گا۔

▲ جب کوئی قریب الوفات ہو تو اسے لا إله إلا الله پڑھنے کی تلقین کرنی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ»

''اپنے فوت ہونے والوں کو لا إله إلا الله کی تلقین کرو۔''[3]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی موت کلمۂ اخلاص پر واقع ہو جائے اور یہ کلمہ اس کی دنیوی زندگی کا آخری کلمہ ہو۔

---

① صحيح البخاري، كتاب و باب الوصايا، حديث: 2738، و صحيح مسلم، الوصية، باب وصية الرجل مكتوبة عنده، حديث: 1627. ② صحيح البخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللهُ نَفْسَهُ﴾ ......، حديث: 7405، وصحيح مسلم، الذكر والدعاء والتوبة، باب فضل الذكر والدعاء......، حديث: 2675. ③ صحيح مسلم، الجنائز، باب تلقين الموتى: لا إله إلا الله، حديث: 916.

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ»

''جس کا آخری کلام لا إله إلا الله ہوا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔''[1]

واضح رہے کہ کلمہ اخلاص کی تلقین اسے بڑے پیار اور نرمی کے ساتھ کی جائے۔ اس پر زیادہ تکرار و اصرار نہ کیا جائے تاکہ وہ موت کی تکلیف کی بنا پر انکار نہ کر دے۔

- اس کا رخ قبلہ کی طرف کر دینا چاہیے۔
- قریب الوفات شخص کے پاس سورۂ یٰس کی تلاوت کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: [اِقْرَؤُوا ﴿يٰسٓ ۝﴾ عَلٰى مَوْتَاكُمْ] ''اپنے فوت ہونے والوں کے پاس سورۂ یٰس پڑھو۔''[2]

واضح رہے جب کوئی شخص فوت ہو جائے تب اس کے پاس سورۂ یٰس پڑھنا بدعت ہے، جب کہ قریب الوفات شخص کے پاس اسے پڑھنا مسنون ہے۔ اسی طرح جنازہ کے وقت یا قبر پر یا ایصال ثواب کے لیے سورۂ یٰس وغیرہ پڑھنا بدعت ہے کیونکہ کتاب وسنت میں اس کی کوئی دلیل نہیں۔[3] لہٰذا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سنت کے مطابق عمل کرے اور بدعت سے اجتناب کرے۔

احکام وفات جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو مستحب یہ ہے کہ اس کی آنکھیں بند کر دی جائیں، چنانچہ جب سیدنا ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور فرمایا:

«إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ تَبِعَهُ الْبَصَرُ، فَضَجَّ نَاسٌ مِّنْ أَهْلِهِ، فَقَالَ: لَا تَدْعُوا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ يُؤَمِّنُونَ عَلٰى مَا تَقُولُونَ»

''جب روح قبض کی جاتی ہے تو نگاہ اس کا پیچھا کرتی ہے تو ان کے گھر کے کچھ لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم زبان سے سوائے خیر کے کچھ نہ کہنا کیونکہ تم جو کہو گے فرشتے اس پر آمین کہیں گے۔''[4]

- وفات کے بعد میت کو ڈھانپ دینا چاہیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

---

① سنن أبي داود، الجنائز، باب في التلقين، حديث: 3116. ② [ضعيف] سنن أبي داود، الجنائز، باب القراءة عندالميت، حديث: 3121، وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء فيما يقال عندالمريض إذا حضر، حديث: 1448.

③ قریب الوفات شخص کے پاس سورۂ یٰس پڑھنے والی روایت نہایت ضعیف ہے۔ (صارم)

④ صحيح مسلم، الجنائز، باب في إغماض الميت والدعاء له إذا حُضر، حديث: 920.

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ حِينَ تُوُفِّيَ سُجِّيَ بِبُرْدٍ حِبَرَةٍ»

''جب نبی ﷺ کا انتقال ہوا تو یمن کی دھاری دار چادروں کے ساتھ آپ ﷺ کا جسم مبارک ڈھانپ دیا گیا۔''[1]

▲ جب کسی شخص کی وفات کا یقین ہو جائے تو اس کی تجہیز و تکفین میں دیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَنْبَغِي لِجِيفَةِ مُسْلِمٍ أَنْ تُحْبَسَ بَيْنَ ظَهْرَانَيْ أَهْلِهِ»

''کسی مسلمان کی نعش کو اس کے اہل وعیال میں زیادہ دیر روک کر نہ رکھا جائے۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ میت کسی قسم کے تغیر وتبدل سے محفوظ ہو جاتی ہے۔امام احمد رحمہ اللہ کا فرمان ہے: ''میت کی عزت وتکریم اس کو قبرستان کی طرف جلدی لے جانے میں ہے۔''[3] البتہ اگر میت کی جسمانی ہیئت بدلنے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کے اقرباء وغیرہ کا انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ قریب رہتے ہوں۔

▲ مسلمان کی موت کا اعلان کرنا مباح ہے تاکہ اس کی تیاری میں جلدی ہو، اس کی نماز جنازہ میں حاضری زیادہ ہو اور دعا میں لوگوں کی شرکت ہو، البتہ نوحہ، بین یا قابل فخر کارناموں کے ساتھ اعلان کرنا جاہلیت کا کام ہے۔اسی طرح تعزیتی اجلاس منعقد کرنا اور ماتمی مجالس کا انعقاد واہتمام کرنا عہد جاہلیت کو واپس لانا ہے۔

▲ مستحب امر یہ ہے کہ میت کی وصیتوں کو جلد نافذ کیا جائے تاکہ اس کو جلد از جلد اجر وثواب مل جائے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اجرائے وصیت کا ذکر ادائیگی قرض کے ذکر سے پہلے کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کو واضح کرنا اور اس کے اجرا پر رغبت دلانا ہے۔

▲ وصیتوں کے اجرا کے بعد میت پر جو قرضے ہیں انھیں جلد از جلد ادا کیا جائے۔[4] خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے قرضے ہوں، مثلاً: زکاۃ، حج، جائز نذر یا کفارہ یا لوگوں کے قرضے ہوں، مثلاً: امانت یا غصب شدہ یا عارضی طور پر مانگی ہوئی اشیاء وغیرہ۔میت نے ان کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو بہر صورت ان کی ادائیگی ہونی چاہیے۔رسول اللہ ﷺ کا

---

① صحيح البخاري، اللباس، باب البرود والحبر والشملة، حديث: 5814. ② [ضعيف] سنن أبي داود، الجنائز، باب تعجيل الجنازة وكراهية حبسها، حديث: 3159. ③ المغني والشرح الكبير: 310/2.

④ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ تم قرآن مجید میں وصیت کا ذکر قرضے سے پہلے پڑھتے ہو لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنے فیصلہ میں قرض کو وصیت پر مقدم رکھا ہے (جامع الترمذي، الفرائض، باب ماجاء في ميراث الإخوة......، حديث: 2094) اس روایت کی روشنی میں میت کے قرضے اس کی وصیت کے اجرا سے پہلے ادا ہوں گے۔(صارم)

ارشاد ہے:

«نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ»

''مومن کی جان اس کے قرض کے ساتھ لٹکی رہتی ہے، حتیٰ کہ اسے ادا کر دیا جائے۔''①

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرضہ میت کے ذمے رہتا ہے اور اس وجہ سے اسے جنت میں جانے سے روک دیا جاتا ہے۔ اس حدیث شریف میں میت کے قرضے کی ادائیگی پر رغبت دلائی گئی ہے۔ لیکن یہ تب ہے جب میت کا مال ہو جس سے اس کا قرضہ ادا ہو سکے۔ اگر کسی میت کے پاس زندگی میں مال نہ تھا اور وہ قرض کی ادائیگی کا پختہ ارادہ رکھتا تھا تو احادیث میں ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے خود ادا کر دے گا۔②

میت کو غسل دینے کا طریقہ اور اس کے مسائل | احکام جنازہ میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ میت کو وہ شخص غسل دے جو اس کا سلیقہ و طریقہ جانتا ہو اور غسل دے سکتا ہو۔ ایک شخص اونٹنی سے گر کر مر گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: [اِغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَ سِدْرٍ] ''اسے پانی میں بیری کے پتے ڈال کر غسل دو۔''③

میت کو غسل دینے کے بارے میں اہل اسلام کا قول اور عمل تواتر سے چلا آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو وفات کے بعد غسل دیا گیا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ ظاہری اور باطنی طور پر پاک تھے تو پھر کسی دوسرے مسلمان کو غسل کیوں نہ دیا جائے؟ غسلِ میت ان لوگوں پر فرض کفایہ ہے جنھیں اس کی وفات کا علم ہو جائے۔

▲ میت مرد ہو تو اسے مرد ہی غسل دے۔ بہتر اور افضل یہ ہے کہ میت کو غسل دینے کے لیے کسی با اعتماد اور مسائلِ غسل سے واقف شخص سے کام لیا جائے کیونکہ یہ ایسا شرعی حکم ہے جس کا ایک خاص طریقہ و سلیقہ ہے، لہٰذا اسے صحیح طور پر وہی شخص سرانجام دے سکتا ہے جو اس بارے میں احکام شرعیہ سے واقف ہو۔ اگر اس بارے میں میت نے

① جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء أن نفس المؤمن معلقة بدينه......، حديث: 1078، ومسند أحمد: 440/2، میت کا قرض زندہ لوگوں کو ادا کرنا چاہیے، خواہ اقارب ہوں یا اجنبی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مقروض کا جنازہ پڑھنے سے انکار کیا تو ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: صَلِّ عَلَيْهِ يَارَسُولَ اللّٰهِ! وَعَلَيَّ دَيْنُهُ ''اللہ کے رسول! آپ اس کا جنازہ پڑھائیں اس کا قرض میں ادا کروں گا۔'' (صحيح البخاري حديث:2289)۔ تب رسول اللہ ﷺ نے جنازہ پڑھایا۔ بعد میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما دیا تھا کہ مَنْ تَرَكَ دَيْناً أَوْ ضَيَاعًا فَإِلَيَّ وَعَلَيَّ. ''اگر کوئی مقروض فوت ہو جائے یا اس کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو تو میں اس کا قرض ادا کروں گا اور پس ماندگان کی کفالت کروں گا، (سنن أبي داود، حديث: 2954)، لہٰذا جو میت قرض ادا کرنے کے لیے مال نہ چھوڑ کر فوت ہو، اس کا قرض بیت المال سے ادا کرنا چاہیے یا محلے کے مسلمان اس کا قرض ادا کریں۔ (صارم) ② صحيح البخاري، الاستقراض......، باب من أخذ أموال الناس يريد أداء ها أو إتلافها، حديث: 2387. ③ صحيح البخاري، الجنائز، باب الكفن في ثوبين، حديث: 1265، وصحيح مسلم، الحج، باب ما يفعل بالمحرم إذا مات؟ حديث: 1206.

کسی خاص شخص کو وصیت کی ہو تو اسے غسل دینے کا موقع دیا جائے، بشرطیکہ وہ اچھا اور قابل اعتماد ہو جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ انھیں ان کی بیوی سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا غسل دے۔[1]

واضح رہے اس روایت سے بیوی کا خاوند کو غسل دینے کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح مرد کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی فوت شدہ بیوی کو غسل دے (جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا)[2] سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ بعد از وفات انھیں محمد بن سیرین رحمہ اللہ غسل دیں۔[3]

اگر میت نے کسی خاص شخص کے بارے میں وصیت نہ کی ہو تو میت کا باپ غسل دے، بیٹے کو غسل دینے کے لیے باپ زیادہ مناسب اور بہتر ہے کیونکہ باپ اپنے بیٹے پر زیادہ شفیق و رحیم ہوتا ہے۔ اگر بوقت وفات باپ موجود یا زندہ نہ ہو تو میت کا دادا باپ کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے، لہٰذا وہ غسل دے۔ پھر عصبات، یعنی بھائی، چچا وغیرہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ اگر یہ سب نہ ہوں یا انکار کر دیں یا انھیں طریقۂ غسل نہ آتا ہو تو پھر کسی بھی اجنبی شخص سے یہ کام لیا جا سکتا ہے جو طریقہ غسل سے واقف ہو۔

- میت عورت ہو تو اسے عورت ہی غسل دے، بہتر یہ ہے کہ جس متعین عورت کے بارے میں وصیت کی گئی ہو وہ غسل دے بشرطیکہ وہ طریقۂ غسل کا علم رکھتی ہو۔ ورنہ میت کے اقرباء میں سے کوئی بھی عورت غسل دے سکتی ہے جو احکام غسل جانتی اور سمجھتی ہو۔

- عورت، عورت کو اور مرد، مرد کو مذکورہ ترتیب کے مطابق غسل دے۔ خاوند یا بیوی میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے تو دوسرا اسے غسل دے سکتا ہے جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی بیوی سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے غسل دیا یا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے غسل دیا تھا۔ صحابۂ کرام میں (اس کے علاوہ) اور بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

- سات برس سے کم عمر والا فوت شدہ بچہ ہو یا بچی، اسے مرد یا عورت کوئی بھی غسل دے سکتا ہے۔

ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کا اس امر پر اجماع ہے کہ عورت چھوٹے بچے کو نہلا سکتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹے بچے کا اس کی زندگی میں بھی ستر کا مسئلہ نہیں ہوتا۔''[4]

نیز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تھا تو عورتوں ہی نے اسے غسل دیا تھا۔[5]

- سات برس یا اس سے زائد کے بچے کو عورت غسل نہ دے۔ اسی طرح سات برس یا اس سے زیادہ عمر کی بچی کو

---

① [ضعيف] الموطأ للإمام مالك، الجنائز، باب غسل الميت، حديث: 3، والمغني والشرح الكبير: 2/308-311، وإرواء الغليل، حديث: 696. ② المستدرك للحاكم، معرفة الصحابة: 3/163,164، حديث: 4769. ③ المغني والشرح الكبير: 2/308، قال الشيخ الألباني: لم أقف على إسناده، إرواء الغليل، حديث: 697. ④ المغني والشرح الكبير: 2/313. ⑤ منار السبيل، ص: 147، قال الشيخ الألباني رحمه الله: في إرواء الغليل: 3/163 لم أقف عليه.

کوئی مرد غسل نہ دے۔

٭ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مرے ہوئے کافر کو غسل دے، اس کا جنازہ اٹھائے، اسے کفن پہنائے، اس پر نماز پڑھے یا اس کے جنازے میں شامل ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾

''اے مسلمانو! تم اس قوم سے دوستی نہ رکھو جن پر اللہ نے غضب نازل کیا۔''[1]

یہ آیت کریمہ اپنے عموم کے اعتبار سے کافر کو غسل دینے، اٹھانے اور اس کے جنازے میں شامل ہونے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ﴾

''ان میں سے کوئی مر جائے تو آپ اس کی نماز جنازہ ہرگز نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں، یہ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں۔''[2]

اور ارشاد الٰہی ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ ﴾

''پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں۔''[3]

کوئی کسی کافر کو دفن بھی نہ کرے، البتہ جب کافروں میں سے کوئی دفن کرنے والا نہ ہو تب کوئی مسلمان زمین میں گڑھا کھود کر اسے چھپا دے تاکہ اس کی لاش خراب ہونے سے زندہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے کفار مقتولوں کو گھسیٹ کر کنویں میں پھینک دیا تھا۔ مرتد شخص، مثلاً: نماز کو قصداً چھوڑنے والا یا (کفر کی حد تک پہنچانے والی) بدعت کے مرتکب کا بھی یہی حکم ہے۔ واضح رہے کافر زندہ ہو یا مردہ، ایک مسلمان کا یہی موقف ہونا چاہیے کہ وہ بغض و بیزاری کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کے بارے میں فرمایا:

﴿ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ﴾

''جب کہ ان سب نے اپنی قوم سے برملا کہہ دیا کہ بے شک ہم تم سے اور جن جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، ان سب سے بالکل بیزار ہیں۔ ہم تمھارے (عقائد کے) منکر ہیں، جب تک تم اللہ کی وحدانیت

[1] الممتحنة 60:13. [2] التوبة 9:84. [3] التوبة 9:113.

پر ایمان نہ لاؤ، ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغض وعداوت ظاہر ہوگئی۔''[1]

اور فرمایا:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ﴾

''اللہ (تعالیٰ) پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے محبت رکھتے ہوئے ہرگز نہ پائیں گے گو وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کا کنبہ قبیلہ ہی کیوں نہ ہو۔''[2]

درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر اور ایمان دونوں باہم متضاد ہیں، کفار سے دشمنی محض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور دین کی خاطر ہے، اس لیے وہ زندہ ہوں یا مردہ، ان سے دوستی اور محبت قطعاً جائز نہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دلوں کو حق پر قائم رکھے اور ہمیں راہ راست کی ہدایت دے۔

- جس پانی سے میت کو غسل دینا ہو وہ پاک صاف اور ٹھنڈا ہونا چاہیے، البتہ میت کے جسم سے اگر میل کچیل اتارنا مقصود ہو یا سخت سردی ہو تو گرم کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔
- میت کو غسل ایسی جگہ دینا چاہیے جو نظروں سے محفوظ ہو یا کسی گھر میں چھت کے نیچے ہو یا کسی خیمہ وغیرہ کے اندر ہو۔
- غسل دینے سے قبل میت کی ناف سے لے کر گھٹنوں تک جسم کو کسی کپڑے سے ڈھانپ کر رکھنا ضروری ہے۔ پھر اس کے کپڑے اتارے جائیں اور غسل کے تختے پر لٹایا جائے جو پاؤں کی جانب سے قدرے نیچا ہو تاکہ جسم کا میل کچیل اور مستعمل پانی پاؤں کی طرف سے بہہ جائے۔
- غسل کے مقام پر غسل دینے والا یا غسل میں تعاون کرنے والا ہی موجود ہو۔ وہاں زائد افراد کی موجودگی درست نہیں۔

طریقۂ غسل: غسل دینے والا شخص اولاً میت کا سر اس قدر اٹھائے کہ وہ بیٹھنے کی حالت کے قریب ہو جائے، پھر اس کے پیٹ پر آہستہ آہستہ اور دبا کر ہاتھ پھیرے تاکہ جسم سے نکلنے والی نجاست نکل جائے اور ساتھ ساتھ پانی بھی خوب بہائے تاکہ وہاں نجاست ٹھہر نہ سکے۔ پھر غسل دینے والا اپنے ہاتھوں پر سوتی وغیرہ کپڑے کی تھیلیاں چڑھا کر میت کو استنجا کروائے۔

[1] الممتحنة 60:4. [2] المجادلة 58:22.

پھر غسل کی نیت کرے۔ بسم اللہ پڑھے، نماز کی طرح اسے وضو کرائے، البتہ کلی کے لیے منہ میں اور اسی طرح ناک میں پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں بلکہ تر ہاتھوں یا گیلے کپڑے کے ساتھ اس کے دانت، منہ اور ناک کو صاف کر لینا کافی ہے۔ پھر اس کا سر اور ڈاڑھی بیری کے پتوں والے پانی یا صابن سے دھوئے۔ پھر اس کے جسم کی داہنی جانب یوں دھوئے کہ گردن سے شروع کرے پھر کندھا اور پھر بازو اور ہاتھ دھوئے، پھر جسم کی داہنی جانب پاؤں تک دھوئے، پھر اسے بائیں پہلو پر اٹھائے اور اس کی کمر اور پشت کی داہنی جانب دھوئے۔ اسی طرح بائیں جانب دھوئی جائے۔ پھر داہنی جانب اٹھا کر اس کی کمر اور پشت کی بائیں جانب کو دھوئے۔ غسل کے ساتھ بیری کے پتے یا صابن استعمال کیا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ بوقت غسل ہاتھ پر کپڑے کی تھیلی چڑھائی جائے۔

▲ اگر صفائی حاصل ہو جائے تو ایک ہی بار پانی کا استعمال کافی ہے، البتہ تین تین بار پانی بہانا مستحب ہے۔ اگر اس سے بھی صفائی حاصل نہ ہو تو سات بار تک اعضاء دھوئے جا سکتے ہیں۔ آخری بار پانی بہاتے وقت پانی میں کافور شامل کر لیا جائے کیونکہ وہ میت کے بدن کو اچھا، خوشبودار اور ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ نیز آخر میں کافور کا استعمال کرنے سے اس کا اثر زیادہ دیر تک باقی رہے گا۔

▲ غسل دینے کے بعد میت کے بدن کو کسی کپڑے وغیرہ سے خشک کیا جائے۔ اس کی مونچھیں کاٹی جائیں، ناخن لمبے ہوں تو تراش دیے جائیں، بغلوں کے بال صاف کر دیے جائیں۔[1] اگر میت عورت ہو تو اس کے سر کی تین لٹیں بنائی جائیں اور انھیں پیچھے کی طرف ڈال دیا جائے۔

▲ اگر میت کو غسل دینے کے لیے پانی میسر نہ ہو یا پانی کے استعمال سے اس کا جسم خراب ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً: میت کا وجود آگ سے جلا ہوا ہو یا اسے کوڑھ وغیرہ کا مرض ہو، یا مردوں میں کسی عورت کی میت ہو جس کا خاوند وہاں موجود نہ ہو (اور اسے غسل دینے کے لیے کوئی عورت بھی موجود نہ ہو) یا عورتوں میں مرد میت ہو جسے غسل دینے کے لیے اس کی بیوی نہ ہو (نہ وہاں کوئی اور مرد ہو) تو ان احوال میں میت کو مٹی کے ساتھ تیمّم کروا دیا جائے، جس کی صورت یہ ہو کہ مسح کروانے والا اپنے ہاتھ پر کوئی چیز لپیٹ لے اور میت کے چہرے اور ہتھیلیوں پر مسح کرے۔

▲ اگر میت کے بعض اعضاء دھونے مشکل ہوں تو جن اعضاء کو دھونا ممکن ہو دھو دیا جائے اور باقی اعضاء پر مسح کر دیا جائے۔

▲ جو شخص میت کو غسل دے اس کے لیے غسل کرنا مستحب ہے، واجب نہیں۔

---

[1] المغني والشرح الكبير: 325,324/2.

کفن پہنانے کے احکام میت کو غسل دینے اور اس کے بدن کو خشک کرنے کے بعد میت کو کفن پہنایا جائے۔

- میت کو ایسے کپڑوں میں کفن دیا جائے جو اس کے سارے بدن کو اچھی طرح ڈھانپ لیں۔ صاف ستھرے ہوں، نئے اور سفید کپڑے مستحب ہیں، البتہ دھلے ہوئے ہوں تو بھی درست ہیں۔
- ایک کپڑے میں کفن دینا واجب ہے جو میت کے پورے بدن کو اچھی طرح ڈھانپ لے جب کہ مرد کے لیے تین اور عورت کے لیے پانچ کپڑے مستحب ہیں جس میں تہہ بند، سر کی اوڑھنی، قمیص اور دو بڑی چادریں ہوں گی۔ کفن کے کپڑوں پر عرق گلاب چھڑکنے کے بعد خوشبو (لوبان وغیرہ) کی دھونی دینا مستحب ہے تاکہ اس دھونی کا اثر باقی رہے۔[1]
- میت کو کفن پہنانے کا طریقہ یہ ہے کہ تین چادریں لے کر انھیں ایک دوسری کے اوپر بچھا دیا جائے، پھر میت کو اس طرح لایا جائے کہ اس کا ضروری ستر ڈھانپا ہوا ہو اور اسے چادروں کے اوپر چت لٹا دیا جائے۔

پھر میت کے نیچے بچھی ہوئیں چادروں میں سے سب سے اوپر والی چادر کا بایاں کنارہ میت کے بدن پر یوں ڈال دیا جائے کہ میت کی داہنی جانب چھپ جائے۔ پھر اسی چادر کا داہنی جانب کا کنارہ پکڑ کر میت کی بائیں جانب پر ڈال دیا جائے۔ پھر اسی طرح دوسری پھر تیسری چادر سے میت کو چھپا دیا جائے۔ یاد رہے چادر کا زائد حصہ قدموں کی نسبت سر کی جانب زیادہ ہونا چاہیے جو اس کے چہرے پر ڈال دیا جائے۔ پاؤں کی جانب چادر کا جو زائد حصہ ہو وہ اس کے قدموں پر ڈال دیا جائے۔ پھر ان چادروں کو احتیاط سے باندھ دیا جائے تاکہ قبر میں ڈالنے تک کھل نہ سکیں۔ میت کو قبر میں لٹا کر یہ بندھن کھول دیے جائیں۔

- عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دیا جائے۔ ایک چادر جو ازار کا کام دے، دوسری چادر قمیص کے طور پر ہو، تیسری چادر دوپٹہ کی جگہ پر ہو اور دو بڑی چادریں جسم کو چھپانے کے لیے ہوں۔

نماز جنازہ کے احکام مسلمان میت کو کفن پہنانے کے بعد اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَّمَنْ شَهِدَ حَتَّى تُدْفَنَ كَانَ لَهُ قِيرَاطَانِ، قِيلَ: وَمَا الْقِيرَاطَانِ؟ قَالَ: مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ»

[1] مرد اور عورت کے کفن کے کپڑوں کا تین اور پانچ کا فرق صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا تین کپڑوں میں کفن دینا ہی مستحب ہے جن میں قمیص کا ذکر نہیں ہے۔

''جو شخص کسی جنازہ میں شامل ہوا پھر اس کی نماز جنازہ ادا کی تو اس کے لیے ایک قیراط اجر ہے اور جو دفن کرنے تک میت کے ساتھ رہا اسے دو قیراط ثواب ملے گا۔ آپ ﷺ سے سوال ہوا کہ قیراط کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: دو عظیم پہاڑوں کے برابر۔''[1]

- نماز جنازہ فرض کفایہ ہے، اگر کچھ افراد نماز جنازہ ادا کر لیں تو دوسرے لوگ گناہ گار نہ ہوں گے، البتہ ان کے حق میں سنت کا درجہ ہوگا۔ اور اگر کسی میت کی نماز جنازہ کوئی نہ پڑھے گا تو سب گناہ گار ہوں گے۔
- نماز جنازہ کی شرائط یہ ہیں: نیت کرنا، قبلہ کی طرف رخ کرنا، ستر کو چھپانا، نماز جنازہ ادا کرنے والے اور میت دونوں کا پاک صاف ہونا، نجاست کو دور کرنا، نماز جنازہ ادا کرنے والے اور میت دونوں کا مسلمان ہونا، میت کا موجود ہونا اگر اس کا تعلق اس شہر سے ہے۔ نمازی کا مکلّف (عاقل بالغ) ہونا۔
- نماز جنازہ کے ارکان یہ ہیں: قیام کرنا، چار تکبیریں کہنا، سورۂ فاتحہ پڑھنا، نبی ﷺ پر درود شریف پڑھنا، میت کے لیے دعا کرنا، ترتیب قائم رکھنا اور سلام پھیرنا۔
- نماز جنازہ کی سنتیں یہ ہیں: ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا، قراءت شروع کرنے سے پہلے تعوذ پڑھنا، اپنے لیے اور اہل اسلام کے لیے دعا کرنا، سرًا قراءت کرنا۔[2] چوتھی تکبیر اور سلام کے درمیان تھوڑا سا وقفہ کرنا، سینے پر ہاتھ باندھنا اور صرف دائیں جانب سلام پھیرنا۔[3]
- نماز جنازہ کا طریقہ درج ذیل ہے:

نماز جنازہ پڑھنے والا اکیلا ہو یا جماعت کا امام ہو، اگر میت مرد ہو تو اس کے سینے کے بالمقابل کھڑا ہو اور اگر میت عورت ہو تو اس کے جسم کے درمیانی حصے کے بالمقابل کھڑا ہو، جب کہ مقتدی امام کے پیچھے کھڑے ہوں۔[4] حاضرین کی کم از کم تین صفیں بنانا مسنون ہے (زیادہ کی کوئی حد نہیں)۔ پھر تکبیر تحریمہ کہے اور دعائے استفتاح پڑھے بغیر تعوذ وتسمیہ کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھے۔ پھر دوسری تکبیر کہہ کر رسول اللہ ﷺ پر (نماز والا) درود شریف

① صحيح البخاري، الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن، حديث: 1325، وصحيح مسلم، الجنائز، باب فضل الصلاة على الجنازة واتباعها، حديث: 945.

② رسول اللہ ﷺ کا نماز جنازہ میں اونچی آواز سے دعائیں پڑھنا اور صحابۂ کرام کا سن کر انھیں یاد کرنا احادیث سے ثابت ہے جیسے کہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے نماز جنازہ میں ایک دعا پڑھی جو میں نے یاد کر لی اور میں نے تمنا کی: کاش! یہ میرا جنازہ ہوتا۔ (صحيح مسلم، الجنائز، باب الدعاء للميت في الصلاة، حديث:963) (صارم)

③ رسول اللہ ﷺ سے دونوں طرف سلام پھیرنا بھی ثابت ہے، جیسے السنن الكبرىٰ:4/43 میں امام بیہقی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں شیخ البانی رحمہ اللہ کی أحكام الجنائز، ص: 162-164.

④ اگر میت مرد ہو تو اس کے سر کے بالمقابل کھڑے ہونا مسنون ہے۔ دیکھیے أحكام الجنائز للألباني، ص: 138. (ع۔و)

پڑھے۔ پھر تیسری تکبیر کہہ کر میت کے لیے ماثورہ (مسنون) دعائیں پڑھے۔ نماز جنازہ کی چند ایک دعائیں درج ذیل ہیں:

«اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا. اَللّٰهُمَّ! مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ. اَللّٰهُمَّ! لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهُ»

''اے اللہ! ہمارے زندوں کو، مردوں کو، حاضرین کو، غیر حاضرین کو، بچوں کو، بڑوں کو، مردوں کو اور عورتوں کو بخش دے، (تو ہمارے مقام اور ٹھکانے کو جانتا ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے) اے اللہ! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھنا اور جسے موت دے اسے ایمان پر موت دینا۔ اے اللہ! ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کرنا اور نہ اس کے بعد ہمیں گمراہ کرنا۔''[1]

دوسری دعا:

«اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهِ، وَأَهْلاً خَيْرًا مِّنْ أَهْلِهِ، وَزَوْجًا خَيْرًا مِّنْ زَوْجِهِ، وَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ»

''اے اللہ! اس (میت) کو بخش دے، اس پر رحم فرما، اسے (عذاب اور سزا سے) عافیت میں رکھ، اسے معاف کر دے، اس کی اچھی مہمانی فرما۔ اس کی قبر کشادہ کر، اسے پانی، برف اور اولوں سے دھو دے، اس کے گناہ اور خطائیں دھو کر ایسے صاف کر دے جس طرح سفید کپڑا دھو کر میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے، اسے اس کے گھر سے بہتر گھر عطا کر، اس جوڑے سے بہتر جوڑا دے، اسے جنت میں داخل کر، اسے قبر اور آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔''[2]

یہ کلمات بھی پڑھے جا سکتے ہیں:

«وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ وَنَوِّرْ لَهُ فِيهِ»

---

① سنن أبي داود، الجنائز، باب الدعاء للميت، حديث: 3201، وجامع الترمذي، حديث: 1024، وسنن النسائي، حديث: 1988، وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في الدعاء في الصلاة على الجنازة، حديث: 1498 و اللفظ له.

② صحيح مسلم، الجنائز، باب الدعاء للميت في الصلاة، حديث: 963.

''اس کی قبر کو وسیع کر اور اسے منور و روشن فرما۔''[1]

اگر میت عورت ہو تو مؤنث کی ضمیر کا استعمال کرے۔[2] اور اگر میت بچہ ہو تو مندرجہ ذیل دعا پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْهُ فَرَطًا لِّوَالِدَيْهِ وَذُخْرًا وَّسَلَفًا وَّأَجْرًا . اَللّٰهُمَّ! ثَقِّلْ بِهِ مَوَازِينَهُمَا وَأَعْظِمْ بِهِ أُجُورَهُمَا . اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْهُ فِي كَفَالَةِ إِبْرَاهِيمَ وَأَلْحِقْهُ بِصَالِحِ سَلَفِ الْمُؤْمِنِينَ ، وَأَجِرْهُ بِرَحْمَتِكَ مِنْ عَذَابِ الْجَحِيمِ وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهِ ، وَأَهْلاً خَيْرًا مِّنْ أَهْلِهِ ، اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِأَسْلَافِنَا وَأَفْرَاطِنَا وَمَنْ سَبَقَنَا بِالْإِيمَانِ»

''اے اللہ! اس (بچے) کو اس کے والدین کے لیے (آخرت میں) میر منزل، ذخیرہ، پیش رو اور اجر کا باعث بنا دے۔ اے اللہ! اس بچے کے ذریعے سے اس کے والدین کی نیکیوں کی ترازو بھاری کر دے اور اس کے سبب ان کا اجر بڑھا دے اور اسے ابراہیم علیہ السلام کی کفالت میں دے دے اور اسے سلف صالحین میں شامل کر دے اور اسے جہنم کے عذاب سے بچا کر رکھنا۔ اور اسے دنیا کے گھر سے بہتر گھر بدلے میں دے اور اسے گھر والے (دنیا کے) گھر والوں سے بہتر عطا کر، اے اللہ! ہمارے پیش روؤں اور میر منزلوں اور جو ہم سے پہلے ایمان کی حالت میں گزر گئے ان کو معاف فرما۔''[3]

پھر چوتھی تکبیر کہے اور تھوڑا سا وقفہ کرے[4] پھر داہنی جانب ایک سلام پھیر دے۔[5]

- اگر کوئی شخص نماز جنازہ میں اس وقت داخل ہوا جب اس کا کچھ حصہ گزر گیا تھا تو وہ امام کے ساتھ شامل ہو جائے، جب امام سلام پھیرے تو وہ بعد میں فوت شدہ حصہ ادا کرے اور پھر سلام پھیر دے۔ اگر اسے یہ محسوس ہو کہ امام کے سلام پھیرنے کے فوراً بعد میت کو اٹھا لیا جائے گا تو وہ جلدی جلدی تکبیرات مکمل کر لے اور پھر سلام پھیر دے۔
- اگر کوئی شخص میت کو دفن کرنے سے پہلے نماز جنازہ ادا نہ کر سکا تو اس کی قبر کے سامنے (اور قبلہ رو) کھڑے ہو کر نماز جنازہ ادا کر لے۔
- کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اگر وہ مردہ بچہ چار ماہ یا زیادہ کا ہو تو اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے اور اگر

---

[1] صحيح مسلم، الجنائز، باب في إغماض الميت والدعاء له إذا حضر، حديث: 920.

[2] کلمہ ''میت'' اسم صفت ہے، جس کا اطلاق مذکر مؤنث دونوں پر ہوتا ہے، لہٰذا ضمائر کا بدلنا ضروری نہیں۔

[3] المغني والشرح الكبير: 369/2. [4] السنن الكبرى للبيهقي، أبواب التكبير على الجنائز ......، باب عدد التكبير في صلاة الجنازة: 35/4. [5] [ضعيف] سنن الدارقطني، الجنائز، باب التسليم في الجنازة واحد......، 71/2، حديث: 1799، والمستدرك للحاكم: 360/1، حديث: 1332.

چار ماہ سے کم عمر ہو تو اس مردہ بچے کو نماز جنازہ پڑھے بغیر ہی دفن کر دیا جائے۔[1]

میت کو قبرستان لے جانا اور دفن کرنا: میت کو کندھا دینا اور اسے دفن کرنا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ میت کو دفن کرنا کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۝ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا ۝ ﴾

''کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی۔''[2]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝ ﴾ ''پھر اسے موت دی اور پھر قبر میں دفن کیا۔''[3]

میت کو دفن کرنے کے بارے میں وارد احادیث بہت زیادہ ہیں اور معروف ہیں، علاوہ ازیں یہ عمل نیکی اور بھلائی کا ہے اور اس میں میت کا احترام کرنا اور اس کا خیال رکھنا پایا جاتا ہے۔

- جنازے کے جلوس میں شامل ہونا اور اسے قبر تک پہنچانا مسنون عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَ حَتَّى تُدْفَنَ كَانَ لَهُ قِيرَاطَانِ، قِيلَ : وَمَا الْقِيرَاطَانِ؟ قَالَ : مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ»

''جو شخص نماز جنازہ کی ادائیگی تک جنازے میں شریک رہا اس کے لیے ایک قیراط اجر ہے اور جو شخص دفن کرتے وقت تک شریک رہا اس کے لیے دو قیراط اجر ہے۔ پوچھا گیا قیراط کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: دو عظیم پہاڑوں کے برابر۔''[4]

اس حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات میں میت کو قبر تک الوداع کرنے کی تلقین وترغیب ہے۔

- جو شخص جنازے کے ساتھ جائے اس کے لیے مسنون یہ ہے کہ وہ حتی الامکان میت کو کندھا دینے والوں میں شامل ہو۔ میت کو کسی جانور یا گاڑی پر لے جانے میں کوئی حرج نہیں بالخصوص جب قبرستان دور ہو۔

- میت کا جنازہ لے جاتے ہوئے مناسب حد تک تیز چلنا چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوٰى ذٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ رِّقَابِكُمْ»

---

[1] المغني والشرح الكبير: 393/2. حدیث میں ناتمام بچے (سقط) کے نماز جنازہ کی مشروعیت ثابت ہے۔ دیکھیے أحكام الجنائز للألباني، ص: 104. (ع۔و) [2] المرسلٰت 26,25:77. [3] عبس 21:80. [4] صحيح البخاري، الجنائز، باب من انتظر حتى تدفن، حديث: 1325، وصحيح مسلم، الجنائز، باب فضل الصلاة على الجنازة واتباعها، حديث: 945.

”جنازہ لے جانے میں جلدی کرو اگر وہ (جان) نیک ہے تو تم اسے خیر کی طرف لے جا رہے ہو (لہٰذا جلدی پہنچاؤ) اور اگر وہ (جان) ایسی نہیں، اس کا انجام برا ہے تو تم اپنی گردنوں سے اس کا بوجھ جلد از جلد اتار دو گے۔“ ①

اس روایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم حد سے بڑھ کر تیز رفتاری سے چلو بلکہ اطمینان و سکون کے ساتھ چلنا چاہیے۔ اور جنازہ لے جاتے وقت بلند آواز سے تلاوت قرآن یا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ یا ذکر وغیرہ نہ کیا جائے یا استغفار وغیرہ کے لیے کہنا درست نہیں کیونکہ یہ سراسر بدعت ہے۔

- جنازے کے ساتھ عورتوں کا گھروں سے نکلنا حرام ہے کیونکہ سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ ”ہمیں جنازے کے ساتھ جانے سے منع کر دیا گیا۔“ ②

عہد نبوی میں خواتین اسلام جنازوں کے ساتھ شریک نہیں ہوتی تھیں، لہٰذا جنازوں کے ساتھ جانا صرف مردوں کا کام ہے۔

- مسنون یہ ہے کہ قبر گہری اور وسیع بنائی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«اِحْفِرُوا وَأَوْسِعُوا وَأَعْمِقُوا»

”قبر بناؤ اور اسے وسیع ③ اور گہرا کرو۔“ ④

- عورت کو قبر میں اتارتے وقت قبر پر پردے کا اہتمام کرنا مسنون ہے کیونکہ عورت کا معنی ہی پردہ ہے، لہٰذا حتی الامکان اسے پردے میں رکھا جائے۔

- جو شخص میت کو قبر میں اتارے وہ کہے:

«بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰی مِلَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ»

”اللہ کے نام اور اللہ کی توفیق کے ساتھ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت پر (ہم اسے دفن کرتے ہیں۔)“ ⑤

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہی ہدایت کی ہے۔

① صحيح البخاري، الجنائز، باب السرعة بالجنازة ، حديث : 1315، وصحيح مسلم، الجنائز، باب الإسراع بالجنازة، حديث: 944. ② صحيح البخاري، الجنائز، باب اتباع النساء الجنازة، حديث : 1278. ③ سنن أبي داود، الجنائز، باب في تعميق القبر، حديث : 3215 وجامع الترمذي، الجهاد، باب ما جاء في دفن الشهداء، حديث : 1713. ④ سنن أبي داود، الجنائز، باب في تعميق القبر، حديث : 3216. ⑤ جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء ما يقول إذا أدخل الميت القبر؟ حديث : 1046، وسنن أبي داود، الجنائز، باب في الدعا للميت إذا وضع في قبره، حديث: 3213، ومسند أحمد: 27/2.

- میت کو قبر میں دائیں پہلو پر لٹایا جائے کہ اس کے چہرے کا رخ جانب قبلہ ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے بارے میں فرمایا ہے:

«قِبْلَتُكُمْ أَحْيَاءً وَّأَمْوَاتًا»

''تم زندہ ہو یا مردہ دونوں حالتوں میں کعبہ تمھارا قبلہ ہے۔''[1]

- قبر میں میت کے سر کے نیچے اینٹ یا پتھر رکھ دیا جائے یا مٹی کا ڈھیر لگا کر اس کا سرا اونچا کر دیا جائے، نیز چہرے کے سامنے والی دیوار کے قریب کیا جائے۔ اس کی کمر اور پشت کے پیچھے سہارے کے طور پر مٹی ڈالی جائے تاکہ اس کا بدن الٹ کر چہرے یا پشت کے بل نہ ہو جائے۔

- پھر لحد کو مٹی اور کچی اینٹوں سے مکمل طور پر بند کر دیا جائے۔ پھر اس پر وہی مٹی دال دی جائے جو قبر کھودتے وقت نکلی تھی، اس کے علاوہ مزید مٹی نہ ڈالی جائے۔

- قبر کو ایک بالشت اونچا کیا جائے جو اونٹ کی کوہان کی طرح ہو تاکہ بارش یا سیلاب وغیرہ کا پانی اس پر ٹھہر نہ سکے، نیز اس پر کنکریاں ڈال دی جائیں اور اس پر پانی کا چھڑکاؤ کیا جائے تاکہ مٹی جم جائے اور ہوا یا آندھی سے بکھر نہ سکے۔

قبر کو ایک بالشت اونچا کرنے کا مقصد اور حکمت یہ ہے کہ گزرنے والوں کو قبر دکھائی دے تاکہ لوگ اسے پامال نہ کریں بلکہ قبر کی نشاندہی اور حد بندی کو واضح کرنے کی غرض سے اس کے اردگرد پتھر رکھنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اس پر کسی قسم کی تحریر منع ہے۔

- جب مسلمان کسی میت کو دفن کر کے فارغ ہوں تو مستحب یہ ہے کہ اس کی قبر پر کھڑے ہو کر اس کے لیے دعا واستغفار کریں۔ رسول اللہ ﷺ جب کسی مسلمان کو دفن کر کے فارغ ہوتے تو وہاں ٹھہر جاتے اور فرماتے:

«اِسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ وَاسْأَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيتِ فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ»

''اپنے بھائی کے لیے دعا اور استغفار کرو اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے ثابت قدمی کا سوال کرو کیونکہ اب اس سے سوالات کیے جائیں گے۔''[2]

قبر پر قرآن مجید کی تلاوت کرنا نہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا کیا تھا، لہٰذا یہ کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے (اور گمراہی کا نتیجہ جہنم کی آگ ہے۔)

---

[1] سنن أبي داود، الوصايا، باب ما جاء في التشديد في أكل مال اليتيم، حديث :2875.

[2] سنن أبي داود، الجنائز، باب الاستغفار عندالقبر للميت في وقت الانصراف، حديث :3221.

▲ قبروں پر عمارتیں تعمیر کرنا، انھیں پتھر وغیرہ سے پختہ کرنا اور ان پر لکھنا سراسر حرام کام ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ»

''رسول اللہ ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت کھڑی کرنے سے منع فرمایا ہے۔''①

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُورُ، وَأَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا، وَأَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهَا وَأَنْ تُوطَأَ»

''آپ ﷺ نے قبروں کو چونا گچ کرنے، ان پر لکھنے، ان پر عمارت کھڑی کرنے اور انھیں روندنے سے منع فرمایا۔''②

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام شرک کا سبب ہیں اور میت سے بے جا وابستگی کے وسائل اور ذرائع ہیں کہ جاہل لوگ جب کسی قبر پر خوبصورت عمارت دیکھیں گے تب اس کے ساتھ غیر شرعی طریقے سے وابستہ ہو جائیں گے۔

▲ قبروں پر چراغاں کرنا، وہاں مساجد تعمیر کرنا، ان قبروں کے قریب یا ان کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنا حرام ہے، علاوہ ازیں عورتوں کا قبروں کی زیارت کے لیے کثرت سے جانا بھی حرام ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَوَّارَاتِ الْقُبُورِ»

''رسول اللہ ﷺ نے کثرت سے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔''③

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى، اِتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ»

''اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ان یہود و نصاریٰ پر جنھوں نے اپنے انبیائے کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔''④

① صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر والبناء عليه، حديث: 970. ② جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء في كراهية تجصيص القبور والكتابة عليها، حديث: 1052. ③ جامع الترمذي، الجنائز، باب ماجاء في كراهية زيارة القبور للنساء، حديث:1056، وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في النهي عن زيارة النساء القبور، حديث:1574-1576. ④ صحيح البخاري، الجنائز، باب ماجاء في قبر النبي ﷺ، حديث: 1390.

واضح رہے تعظیم کی خاطر قبروں پر عمارات کی تعمیر وغیرہ دنیا میں پائے جانے والے شرک کی ایک بنیاد اور اصل سبب ہے۔

- قبروں پر چلنا، انھیں جوتوں سے پامال کرنا، ان پر بیٹھنا، ان پر کوڑا کرکٹ پھینکنا یا پانی کا نکاس ان کی طرف کر دینا، یہ قبروں کی توہین ہے جو حرام ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَأَنْ يَجْلِسَ أَحَدُكُمْ عَلٰى جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِيَابَهُ، فَتَخْلُصَ إِلٰى جِلْدِهِ، خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَنْ يَجْلِسَ عَلٰى قَبْرٍ»

''کوئی شخص آگ کے انگاروں پر بیٹھ جائے جس سے اس کے کپڑے جل جائیں حتیٰ کہ آگ کا اثر اس کی جسمانی جلد کو پہنچ جائے تو یہ تکلیف اس کے قبر پر بیٹھنے سے بہتر ہے۔''[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص قبروں پر بیٹھنے، ان پر تکیہ لگانے، انھیں پامال کرنے کی ممانعتِ روایات پر غور و تدبر کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ یہ جملہ امور اہل قبور کے احترام کی خاطر ہیں تاکہ ان کے سروں کو جوتوں کے ساتھ روندا نہ جائے۔''[2]

تعزیت اور زیارت قبور کے احکام میت کے لواحقین سے تعزیت کرنا، انھیں صبر کی تلقین کرنا اور میت کے لیے دعا کرنا مستحب ہے، سیدنا عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ مُّؤْمِنٍ يُّعَزِّي أَخَاهُ بِمُصِيبَةٍ إِلَّا كَسَاهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ مِنْ حُلَلِ الْكَرَامَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

''جو مومن شخص اپنے بھائی کے ساتھ اس کی مصیبت کے وقت تعزیت کرے گا اللہ تعالیٰ روز قیامت اسے عزت کا لباس پہنائے گا۔''[3]

اس مضمون کی اور بھی روایات ہیں۔

- کلمات تعزیت اس قسم کے کہے جائیں کہ جن کا مفہوم یہ ہو: ''اللہ تعالیٰ تمھیں اس مصیبت پر اجر عظیم دے اور صبر جمیل کی توفیق دے اور تمھارے فوت شدہ کو معاف فرمائے۔''
- تعزیت کے لیے بیٹھنے کا اہتمام کرنا اور اس کا اعلان کرنا (جیسا کہ آج کل رواج ہے) شرعاً درست نہیں۔

---

[1] صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن الجلوس على القبر والصلاة عليه، حديث: 971. [2] حاشية ابن القيم: 37/9. [3] [ضعيف] سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ما جاء في ثواب من عزى مصاباً، حديث: 1601، و إرواء الغليل، 216/3، حديث: 764.

اہل میت کے لیے کھانا تیار کر کے ان کی طرف بھیجنا مستحب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِصْنَعُوا لِأَهْلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَإِنَّهُ قَدْ جَاءَهُمْ مَّا يَشْغَلُهُمْ»

''جعفر (رضی اللہ عنہ) کے خاندان کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ ان پر ایسی مصیبت آ گئی ہے جس نے انھیں مشغول کر دیا ہے۔''[1]

آج کل دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ، یعنی میت کے لواحقین اپنے ہاں لوگوں کو ایک جگہ بلاتے اور جمع کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے کھانا تیار کرتے ہیں، پھر ایصال ثواب کی خاطر قاریوں کو اجرت دے کر ان سے قرآن مجید پڑھواتے ہیں اور اس موقع پر اچھا خاصا مالی بوجھ اٹھاتے ہیں، یہ تمام کام سراسر حرام اور بدعت ہیں، چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا:

«كُنَّا نَعُدُّ الْاِجْتِمَاعَ إِلٰى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصَنِيعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النِّيَاحَةِ»

''ہم میت کو دفن کرنے کے بعد میت والوں کے ہاں جمع ہونے اور کھانا تیار کرنے کو نوحہ میں شمار کرتے تھے۔''[2]

اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میت کے لواحقین کا لوگوں کو کھانے پر جمع کرنا، ان سے تلاوت کروانا اور پھر انھیں تحائف دینا، یہ عمل سلف صالحین کے ہاں معلوم و معروف نہ تھا بلکہ اہل علم نے متعدد وجوہ کی بنا پر اسے مکروہ قرار دیا ہے۔''

علامہ طرطوشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''علمائے کرام کا اس امر پر اجماع ہے کہ تعزیتی اجلاس منعقد کرنا اور مصیبت کے وقت اجتماع کرنا ممنوع ہے جو نہایت قبیح بدعت ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کچھ بھی منقول نہیں۔ اسی طرح دوسرے، تیسرے، چوتھے، ساتویں روز یا ماہانہ محفل کا اہتمام و انعقاد کرنا یا سالانہ برسی، عرس منعقد کرنا، اس کا قطعاً کوئی شرعی ثبوت نہیں۔ اگر یہ خرچ میت کے ترکہ میں سے ہو اور میت کا کوئی وارث اپنے مال میں تصرف کرنے کا اہل نہ ہو (مثلاً: نابالغ بچہ) یا ان میں سے کسی ایک نے اجازت نہ دی ہو تو یہ خرچ حرام ہے اور اس طرح کا کھانا کھانا بھی حرام ہے۔''

[1] جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء في الطعام يصنع لأهل الميت، حديث: 998، ومسند أحمد: 205/1.
[2] مسند أحمد: 204/2.

◣ مَردوں کے لیے قبرستان جانا مستحب ہے بشرطیکہ عبرت و نصیحت حاصل کرنا مقصد ہو اور مُردوں کے لیے دعا اور استغفار کرنا غرض ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا»

''میں تمھیں قبروں کی زیارت سے روکتا تھا، اب تم ان کی زیارت کے لیے جایا کرو۔''[1]

جامع ترمذی میں یہ اضافہ ہے: فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ ''قبروں کی زیارت آخرت کی یاد تازہ کرتی ہے۔''[2]

◣ تین شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے زیارت قبور مستحب ہے جو درج ذیل ہیں:

① زیارت کرنے والے مرد ہوں، عورتیں نہ ہوں کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُورِ» ''قبروں کی کثرت سے زیارت کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔''[3]

② زیارت قبور کے لیے کسی دوسرے شہر کا سفر نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ»

''تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ کی زیارت کے لیے رخت سفر نہ باندھا جائے۔''[4]

③ زیارت قبور کا مقصد عبرت و نصیحت حاصل کرنا اور فوت شدہ کے لیے محض دعا کرنا ہو۔ اگر مقصد قبروں سے تبرک کا حصول ہو یا فوت شدگان سے حاجت روائی یا مشکل کشائی کی درخواست کرنا ہو تو یہ زیارت نہ صرف بدعت ہے بلکہ شرک کا ارتکاب ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قبروں کی زیارت دو طرح کی ہے: شرعی اور بدعی۔ زیارت شرعی کا

---

① صحيح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبيﷺ ربه عزوجل في زيارة قبر أمه، حديث : 977. ② جامع الترمذي، الجنائز، باب ما جاء في الرخصة في زيارة القبور، حديث : 1054.

③ السنن الكبرى للبيهقي: 78/4، ومسند أبي داود الطيالسي، حديث :2478. حدیث شریف میں وارد مبالغے کا کلمہ ''زَوَّارَات'' کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو معنی حدیث یہ ہے کہ وہ عورت ملعون ہے جو کثرت سے قبرستان جاتی ہے (ہم نے ترجمہ حدیث میں اسی نکتہ کو پیش نظر رکھا ہے)، البتہ کبھی کبھار جانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ مقصد عبرت و نصیحت اور موت کی یاددہانی ہو۔ حدیث رسول ﷺ اس مقصد کو حاصل کرنے کی تاکید کرتی ہے، جس کی عورتوں کو مردوں کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک عورت کو قبرستان میں روتے دیکھا تو اسے صبر کرنے کی تلقین کی، اٹھ جانے کا نہیں کہا۔ (صحیح البخاري، حديث:1252) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے زیارت قبور کی دعا پوچھی تو آپ ﷺ نے انھیں دعا سکھائی۔ (صحيح مسلم، حديث :974)

④ صحيح البخاري كتاب و باب فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة، حديث : 1189، وصحيح مسلم، الحج، باب فضل المساجد الثلاثة ، حديث : 1397.

مقصد میت کو سلام کہنا اور (رخت سفر باندھے بغیر) نماز جنازہ کی طرح اس کے حق میں دعائیں کرنا ہوتا ہے، جب کہ زیارت بدعی کا مقصد میت سے اپنی حاجت طلب کرنا ہوتا ہے جو ''شرک اکبر'' ہے۔ اگر کوئی کسی قبر یا صاحب قبر کو دعا میں وسیلہ بناتا ہے تو یہ بدعت ہے اور ذریعۂ شرک ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں اور نہ سلف صالحین اور ائمہ کرام نے اسے پسند واختیار کیا ہے۔''[1] وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ.

[1] مجموع الفتاوی:327,326/24 بتصرف يسير.

باب 3

زکاۃ کے مسائل

زکاۃ کی فرضیت اور اہمیت

جان لیجیے! زکاۃ کے احکام اور اس کی شرائط، زکاۃ ادا کرنے والے اور اس کے مستحقین، اموال زکاۃ اور ان کے نصاب، ان تمام امور کے بارے میں واقفیت نہایت ضروری ہے۔

زکاۃ دین اسلام کا ایک رکن اور اس کی اساس ہے، جیسا کہ کتاب وسنت کے دلائل سے واضح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تقریباً بیاسی (82) مقامات پر زکاۃ کو نماز کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے۔ جس سے زکاۃ کی عظمت اور اس کا نماز سے گہرا تعلق اور ربط عیاں ہوتا ہے۔ بنا بریں خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«وَاللهِ! لَأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ»

''اللہ کی قسم! میں ہر اس شخص کے ساتھ لڑائی کروں گا جو نماز اور زکاۃ میں فرق کرے گا۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا الزَّكَوٰةَ﴾ ''اور تم نمازوں کو قائم کرو اور زکاۃ دو۔''[2]

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ﴾

''ہاں اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکاۃ ادا کرنے لگیں تو تم ان کی راہیں چھوڑ دو۔''[3]

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ»

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: ① لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ کی گواہی دینا ② نماز قائم کرنا ③ زکاۃ دینا ④ حج کرنا ⑤ رمضان کے روزے رکھنا۔''[4]

مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ زکاۃ فرض ہے اور یہ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ اس کے وجوب کا منکر کافر

① صحيح البخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة، حديث: 1400. ② البقرة 43:2. ③ التوبة 5:9. ④ صحيح البخاري، الإيمان، باب دعاؤكم إيمانكم......، حديث: 8، وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أركان الإسلام ودعائمه العظام، حديث: 16.

ہے اور جو شخص اپنے مال کی زکاۃ نہیں دیتا اس سے جنگ ہوگی حتیٰ کہ وہ مکمل زکاۃ ادا کردے۔

◣ زکاۃ سن 2 ہجری میں فرض ہوئی۔ تب رسول اللہ ﷺ نے زکاۃ وصول کرنے اور مستحقین تک پہنچانے کے لیے کچھ افراد کو روانہ فرمایا۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین اور مسلمان حکمرانوں کا یہی طریقہ رہا۔

◣ زکاۃ کی ادائیگی مخلوقات کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کا کام ہے، مال کو میل کچیل سے پاک کرنے کا ذریعہ ہے اور اسے آفات سے بچانے کا سبب ہے۔ زکاۃ رب تعالیٰ کی اطاعت اور عبودیت کی ایک شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

''(اے نبی!) آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے جس کے ذریعے سے آپ انھیں پاک صاف کر دیں اور ان کے لیے دعا کیجیے، بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لیے موجب اطمینان ہے اور اللہ خوب سنتا ہے، خوب جانتا ہے۔''[1]

الغرض زکاۃ کی ادائیگی سے انسانی نفوس کنجوسی و بخل سے پاک وصاف ہو جاتے ہیں، نیز محبوب مال میں سے زکاۃ ادا کر کے مالدار شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان میں سرخرو ہو جاتا ہے۔

◣ اللہ تعالیٰ نے ان اموال میں زکاۃ فرض کی ہے جن میں مخلوق کا فائدہ زیادہ سے زیادہ ہو اور جو زیادہ بڑھنے والے اور نفع مند ہیں، مثلاً: جانوروں کے ریوڑ اور کھیت وغیرہ خود بخود بڑھتے ہیں۔ سونا چاندی اور مال تجارت تصرف، یعنی لین دین کرنے سے بڑھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زکاۃ کی شرح ہر مال میں اس قدر متعین فرمائی ہے جس قدر اس کے حصول میں محنت و مشقت اٹھائی جاتی ہے۔ دور جاہلیت کے دفن شدہ مال کے دستیاب ہونے کی صورت میں پانچواں حصہ زکاۃ ہے۔ اگر ایک جانب سے مشقت ہو تو اس میں دسواں حصہ زکاۃ (عشر) ہے، مثلاً: وہ کھیت جنھیں پانی دینے کی مشقت برداشت نہ کرنا پڑے بلکہ پانی کی ضرورت بارش اور چشموں سے پوری ہو جائے۔ اور جس زمین میں دوگنا محنت و مشقت ہو، یعنی اسے رَہٹ وغیرہ کے ذریعے سے پانی دینا پڑے اس میں بیسواں حصہ زکاۃ ہے۔ اور جس مال کے حصول میں بہت زیادہ محنت کرنا پڑے، اس میں چالیسواں حصہ ہے، مثلاً: کرنسی یا مال تجارت وغیرہ۔

◣ زکاۃ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی ادائیگی سے قلب و مال پاک ہو جاتا ہے۔ زکاۃ کوئی تاوان یا ٹیکس نہیں کہ جس

---

[1] التوبة 9:103.

سے مال کم ہوتا ہے اور مالک کا نقصان ہو بلکہ اس کے برعکس زکاۃ سے مال میں برکت اور اضافہ اس انداز میں ہوتا ہے کہ زکاۃ دینے والے کو علم بھی نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ» ''صدقہ (زکاۃ) دینے سے مال کم نہیں ہوتا۔''[1]

شریعت کی اصطلاح میں زکاۃ کا مطلب ہے: مخصوص مال میں مخصوص وقت پر واجب ہونے والا مخصوص لوگوں کا حق، یعنی ایک سال مکمل ہونے پر مویشی، نقدی اور مال تجارت پر زکاۃ ہے جب کہ اناج اور پھل تیار ہو جائے اور متعین مقدار میں شہد یا معدنیات کا حصول ہو تو ان میں زکاۃ فرض ہے۔ اسی طرح عید کی رات سورج غروب ہو جانے پر صدقۂ فطر ہر مسلمان پر فرض ہے۔

▲ زکاۃ ہر اس مسلمان پر فرض ہو جاتی ہے جس میں درج ذیل پانچ شرائط موجود ہیں:

① آزاد ہونا: غلام یا لونڈی پر زکاۃ فرض نہیں کیونکہ ان کی ملکیت میں مال ہوتا ہی نہیں، ان کے پاس جو مال ہو وہ ان کے آقا کی ملکیت ہوتا ہے، لہٰذا اس کی زکاۃ ان کا آقا ہی ادا کرے گا۔

② صاحب مال کا مسلمان ہونا: زکاۃ مسلمان کے مال میں فرض ہے۔ کافر کے مال میں فرض نہیں کیونکہ زکاۃ کا مقصد اللہ تعالیٰ کے قرب کا حصول اور اس کی اطاعت کا اظہار ہوتا ہے جب کہ کافر شخص اس کا اہل ہی نہیں۔ نیز زکاۃ میں نیت کا ہونا لازمی ہے اور کافر کی نیت معتبر ہی نہیں۔ کافر پر زکاۃ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں مخاطب وہ بھی ہے اور آخرت میں اسے اس کی سزا بھی ملے گی۔ الغرض کافر پر زکاۃ وغیرہ احکام کے واجب ہونے میں بعض اہل علم اختلاف کرتے ہیں۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

«اُدْعُهُمْ إِلٰى شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللهِ»

''انھیں (اہل کتاب کو) لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ کی شہادت دینے کی دعوت دو۔''

پھر آپ ﷺ نے نماز کا ذکر کیا، پھر فرمایا:

«فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ»

''اگر وہ تمھاری یہ بات مان لیں تو انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکاۃ فرض کی ہے جو ان کے مالدار لوگوں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر تقسیم ہوگی۔''[2]

---

① صحیح مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع، حدیث: 2588. ② صحیح البخاري، الزکاة، باب وجوب الزکاة، حدیث: 1395، وصحیح مسلم، الإیمان، باب الدعاء إلی الشهادتین وشرائع الإسلام، حدیث: 19.

اس روایت میں وجوب زکاۃ کے لیے اسلام کو شرط قرار دیا ہے۔ (واللہ اعلم)

③ نصاب کا مکمل ہونا: زکاۃ کی فرضیت کے لیے نصاب کا مکمل ہونا ضروری ہے، اگر مقررہ نصاب سے مال کم ہے تو اس میں زکاۃ فرض نہیں۔ صاحب نصاب بالغ ہو یا نابالغ، عاقل ہو یا مجنون ہر ایک پر زکاۃ فرض ہے کیونکہ دلائل شرعیہ میں عموم ہے جن کا اطلاق ان تمام مذکورہ افراد پر ہوتا ہے۔

④ ذاتی ملکیت کا ہونا: اگر کسی شخص کے پاس مال ہے لیکن اس پر اس کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ کوئی دوسرا شخص اس کا مالک ہے تو جس شخص کے پاس ہے اس پر زکاۃ فرض نہیں، مثلاً: اگر کسی غلام سے آقا کا معاہدہ ہو جائے کہ وہ ایک مقررہ رقم ادا کرے تو آزاد ہو جائے گا۔ پھر جب غلام کے پاس اتنی رقم جمع ہو جائے تو وہ بظاہر اس کا مالک تو ہے لیکن اصل میں وہ رقم آقا کی ہے جو وقتی طور پر اس کے پاس ہے۔

⑤ مال پر ایک سال کا گزرنا: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا زَكَاةَ فِي مَالٍ حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ»

''مال میں زکاۃ تب ہے، جب اس پر ایک سال گزر جائے۔''[1]

واضح رہے ایک سال گزرنے کی شرط اس مال پر ہے جو زمین کی پیداوار سے نہ ہو، مثلاً: نقدی، مویشی یا مال تجارت وغیرہ، ان میں حولانِ حول ضروری ہے تاکہ وہ خوب بڑھ جائے۔ اس میں مالک کا فائدہ ملحوظ رکھا گیا ہے، اگر وہ زمین کی پیداوار ہے تو اس میں ایک سال گزرنے کی شرط نہیں بلکہ اس مال (اناج وغیرہ) کے ہاتھ میں آجانے ہی پر زکاۃ فرض ہو جائے گی۔

▲ مقررہ نصاب کو پہنچے ہوئے مویشیوں کے پیدا ہونے والے بچوں یا مقررہ نصاب کو پہنچے ہوئے مال تجارت سے حاصل ہونے والے منافع کے لیے الگ ایک سال کا گزرنا شرط نہیں دوران سال میں حاصل ہونے والی آمدن کی بھی اصل نصاب کے ساتھ ملا کر زکاۃ ادا کر دی جائے، البتہ اگر اصل مال مقررہ نصاب کی حد تک نہ پہنچے تو جب نصاب مکمل ہو جائے تب سے ایک سال کی مدت شمار کی جائے۔

▲ اگر کسی نے کسی تنگدست سے قرض لینا ہو اور وہ مال مل نہیں رہا تو صحیح رائے کے مطابق جب اس کی رقم ملے گی تب وہ ایک سال کی زکاۃ دے گا (چاہے کئی سال گزر جائیں)۔ اگر وہ مقروض مال دار ہو اور ٹال مٹول کر رہا ہے تو

---

① سنن ابن ماجه، الزكاة، باب من استفاد مالاً، حديث:1792، وروى الترمذي معناه، الزكاة، باب ما جاء لا زكاة على المال المستفاد حتى يحول عليه الحول، حديث :631.

قرض خواہ ہر سال زکاۃ ادا کرے گا۔[1]

▲ استعمال کی عام چیزوں میں زکاۃ نہیں ہے، مثلاً: رہائشی گھر، استعمال میں آنے والے کپڑے، گھر کا سامان، گاڑیاں، مشینری، سواری کے جانور وغیرہ۔

▲ جن اشیاء سے کرایہ حاصل ہوتا ہو ان اشیاء میں زکاۃ نہیں بلکہ ان کی آمدن میں زکاۃ ہے بشرطیکہ کرایہ کی رقم یا اس کے علاوہ موجود رقم ملا کر زکاۃ کے نصاب تک پہنچ جائے اور ایک سال بیت جائے۔

▲ اگر کسی شخص پر زکاۃ فرض ہوگئی لیکن وہ ادائیگی سے پہلے فوت ہو گیا تو اس کی موت کی وجہ سے زکاۃ ساقط نہ ہوگی بلکہ اس کے ورثاء پر لازم ہے کہ اس کے ترکہ سے زکاۃ ادا کریں کیونکہ اس حق کی ادائیگی واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: [فَدَيْنُ اللّٰهِ أَحَقُّ بِالْقَضَاءِ] ''اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔''[2]

مویشیوں میں زکاۃ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے جن اموال میں زکاۃ فرض کی ہے ان میں سے مویشی، یعنی اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری بھی ہیں بلکہ یہ زکاۃ والے اموال میں سب سے نمایاں ہیں۔ ان جانوروں کی زکاۃ کی فرضیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے مشہور اور صحیح احادیث وارد ہیں، حتیٰ کہ آپ ﷺ اور آپ کے خلفاء نے ان اموال کی زکاۃ کی فرضیت اور مسائل کے بارے میں خطوط بھی لکھے تھے اور مدینہ کے گردونواح اور وسیع وعریض مملکت اسلامیہ کے اطراف میں زکاۃ وصول کرنے کے لیے اپنے نمائندے بھی روانہ کیے تھے۔

اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکریوں میں زکاۃ فرض ہونے کی دو شرطیں ہیں جو یہ ہیں:

① وہ جانور کام کاج اور کھیتی باڑی کے لیے نہ ہوں بلکہ دودھ اور نسل کے حصول کی خاطر رکھے ہوں کیونکہ ان کی عمر اور تعداد بڑھنے کے ساتھ ان کے فوائد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

② وہ جانور جو سارا سال یا سال کا اکثر حصہ خود چر کے اپنے لیے خوراک حاصل کریں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

① اہل علم کی ایک رائے کے مطابق ایسے شخص کا حکم بھی وہی ہے جو پہلے کا ہے، یعنی جب اسے قرضہ واپس ملے گا تب ایک سال کی زکاۃ دے گا۔ (صارم)

② صحيح البخاري، الصوم، باب من مات وعليه صوم، حديث: 1953، وصحيح مسلم، الصيام، باب قضاء الصوم عن الميت، حديث: 1148 واللفظ له.

«فِي كُلِّ إِبِلٍ سَائِمَةٍ فِي أَرْبَعِينَ ابْنَةُ لَبُونٍ»

''چرنے والے ہر چالیس اونٹوں میں دو سال کی اونٹنی ہے۔''[1]

اس روایت کی روشنی میں جن جانوروں کو پورا سال یا سال کا اکثر حصہ چارہ خرید کر یا مختلف جگہوں سے گھاس پھوس وغیرہ جمع کر کے ڈالی جائے ان جانوروں میں زکاۃ نہیں۔

اونٹوں میں زکاۃ کی تفصیل: جب اونٹوں میں مذکورہ شرائط پائی جائیں تو ان میں زکاۃ کی تفصیل درج ذیل ہے:

① پانچ اونٹوں میں زکاۃ ایک بکری ہے۔ دس میں دو، پندرہ میں تین اور بیس اونٹوں میں چار بکریاں زکاۃ ہے۔ جیسا کہ سنت واجماع سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

② جب اونٹوں کی تعداد پچیس ہو جائے تو اس میں ایسی اونٹنی بطور زکاۃ ادا کی جائے جو مکمل ایک سال کی ہو اور دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو، اگر اونٹوں میں ایسی اونٹنی نہ ہو تو ایسا اونٹ کافی ہو گا جو دو سال کا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

③ جب چھتیس اونٹ ہو جائیں تو ان میں زکاۃ ایسی اونٹنی ہے جو دو سال کی ہو اور تیسرے میں داخل ہو چکی ہو۔ اس پر اہل علم کا اجماع ہے، پینتالیس اونٹوں تک یہی زکاۃ ہے۔

④ جب چھیالیس (سے لے کر ساٹھ) اونٹ ہو جائیں تو اس میں تین سال کی اونٹنی بطور زکاۃ دی جائے جو سواری اور بوجھ اٹھانے کے قابل ہو۔

⑤ جب اکسٹھ اونٹ ہو جائیں تو ان میں چار سال کی اونٹنی بطور زکاۃ دی جائے۔ جس کے دودھ کے دانت گر چکے ہوں اور مکمل جوان ہو، رسول اللہ ﷺ کا یہی ارشاد ہے۔ پچھتر اونٹوں تک یہی زکاۃ ہے۔

⑥ جب اونٹوں کی تعداد چھہتر سے لے کر نوے تک ہو تو صحیح حدیث کے مطابق اس میں دو سال کی دو اونٹنیاں زکاۃ ہے۔

⑦ جب اکیانوے سے لے کر ایک سو بیس تک اونٹ ہوں تو ان میں دو جوان اونٹنیاں زکاۃ ہیں جو عمر کے تین سال مکمل کر کے چوتھے سال میں داخل ہو چکی ہوں۔

⑧ جب ایک سو بیس سے ایک بھی زیادہ ہو تو رسول اللہ ﷺ کے خط کے مطابق اس میں دو سال کی تین اونٹنیاں زکاۃ ہے۔

⑨ پھر ہر پچاس اونٹوں میں تین سال کی اونٹنی اور ہر چالیس میں دو سال کی اونٹنی بطور زکاۃ فرض ہے۔[2]

① سنن أبي داود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث:1575، وسنن النسائي، الزكاة، باب سقوط الزكاة عن الإبل إذا كانت رسلاً لأهلها ولحمولتهم، حديث :2451، ومسند أحمد:4,2/5. ② دیکھیے: صحيح البخاري، ◄◄

گایوں میں زکاۃ نصوص شرعیہ اور اجماع سے ثابت ہے کہ گایوں میں زکاۃ واجب ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ نے فرمایا:

«مَا مِنْ صَاحِبِ إِبِلٍ وَّلَا بَقَرٍ وَّلَا غَنَمٍ، لَا يُؤَدِّي حَقَّهَا، إِلَّا أُقْعِدَ لَهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقَاعٍ قَرْقَرٍ، تَطَؤُهُ ذَاتُ الظِّلْفِ بِظِلْفِهَا، وَتَنْطِحُهُ ذَاتُ الْقَرْنِ بِقَرْنِهَا، لَيْسَ فِيهَا يَوْمَئِذٍ جَمَّاءُ وَلَا مَكْسُورَةُ الْقَرْنِ»

''اونٹوں، گایوں اور بھیڑ بکریوں کا جو مالک زکاۃ نہیں دیتا، اس کو ایک ہموار میدان میں لٹایا جائے گا جہاں یہ جانور اپنے مالک کو سینگوں کے ساتھ ماریں گے اور اپنے پاؤں تلے اسے روندیں گے۔ اس دن ان میں نہ تو بے سینگ بکری ہوگی اور نہ ٹوٹے ہوئے سینگ والی بکری ہوگی۔''[1]

صحیح بخاری کے الفاظ ہیں:

«إِلَّا أُتِيَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْظَمَ مَا تَكُونُ وَأَسْمَنَهُ تَطَؤُهُ بِأَخْفَافِهَا وَتَنْطِحُهُ بِقُرُونِهَا»

''ان کو قیامت کے دن خوب موٹا تازہ کر کے لایا جائے گا، وہ اپنے مالک کو اپنے پاؤں تلے روندیں گی اور اپنے سینگوں سے ماریں گی۔''[2]

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا وَجَّهَهُ إِلَى الْيَمَنِ أَمَرَهُ أَنْ يَّأْخُذَ مِنَ الْبَقَرِ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِينَ، تَبِيعًا أَوْ تَبِيعَةً وَّمِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ مُسِنَّةً»

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کی طرف روانہ کیا تو حکم دیا کہ تیس گایوں میں ایک سال کا بچہ اور چالیس گایوں میں دو سال کا گائے کا بچہ بطور زکاۃ وصول کریں۔''[3]

گائیں تیس سے کم ہوں تو ان میں زکاۃ نہیں کیونکہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن بھیجا تو یہ حکم دیا کہ کسی کے پاس جب تک تیس گائیں نہ ہوں، زکاۃ نہ لینا۔''[4]

◄◄ الزكاة، باب زكاة الغنم، حديث: 1454، وسنن أبي داود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: 1568.
[1] صحيح مسلم، الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، حديث: 988. [2] صحيح البخاري، الزكاة، باب زكاة البقر، حديث: 1460. [3] سنن أبي داود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: 1576، وجامع الترمذي، الزكاة، باب ما جاء في زكاة البقر، حديث: 623، ومسند أحمد: 230/5. [4] هذا معنى الحديث وأصله في مسند أحمد: 240/5.

جب گایوں کی تعداد چالیس ہو تو اس میں ایک دو دانتا (دوندا) کی زکاۃ ہوگی۔ اور دو دانتا گائے کا وہ بچہ ہے جس کی عمر دو سال ہو چکی ہو، [1] سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ ﷺ نے یمن بھیجا تو انھیں حکم دیا تھا:

«أَنْ يَّأْخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِينَ مِنَ الْبَقَرِ تَبِيعًا أَوْ تَبِيعَةً، وَمِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ مُسِنَّةً»

''وہ ہر تیس گایوں میں گائے کا ایک سالہ بچہ اور ہر چالیس گایوں میں گائے کا دو دانتا بچہ زکاۃ وصول کریں۔'' [2]

جب گایوں کی مجموعی تعداد چالیس سے زیادہ ہو جائے تو ہر تیس گایوں میں گائے کا ایک سال کا بچہ اور ہر چالیس گایوں میں دو سال کا (دوندا) ایک بچہ زکاۃ ہے۔

بھیڑ، بکریوں میں زکاۃ بھیڑ بکریوں میں زکاۃ کی فرضیت پر سنت اور اجماع دلیل ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے لکھا:

«هٰذِهِ فَرِيضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِي فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمُسْلِمِينَ وَالَّتِي أَمَرَ اللهُ بِهَا رَسُولَهُ . . . وَفِي صَدَقَةِ الْغَنَمِ فِي سَائِمَتِهَا إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِينَ إِلٰى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ شَاةٌ . . .»

''کہ یہ زکاۃ کی وہ مقرر مقدار ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس کا حکم دیا ہے..... نیز فرمایا: خود چرنے والی بکریاں چالیس ہو جائیں تو ایک سو بیس تک ان میں ایک بکری یا بھیڑ زکاۃ ہے.....'' [3]

چھترا یا دنبہ ہو تو تقریباً ایک سال کا (کھیرا) اور بکری یا بکرا ہو تو جو دوسرے سال میں داخل ہو وہ (دوندا) بطور زکاۃ ادا کیا جائے۔ سیدنا سوید بن غفلہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف سے صدقہ وصول کرنے والا آیا۔ اس نے کہا ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم بھیڑ وغیرہ کی نسل کا تقریباً ایک سال کی عمر والا (کھیرا) جانور لیں اور بکری کی نسل سے دوندا جانور لیں، یعنی جو ایک سال مکمل کر کے دوسرے میں داخل ہو (اور سامنے والے دانت دودھ کے گر چکے ہوں۔)

اگر بھیڑ بکریاں چالیس سے کم ہوں تو ان میں زکاۃ نہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً مِّنْ أَرْبَعِينَ شَاةً وَّاحِدَةً فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ إِلَّا

---

[1] مُسِنه دو دانتے جانور کو کہتے ہیں، یعنی جس کے سامنے کے دو دانت گر چکے ہوں اور نئے دانت نکل آئے ہوں، عمر کا اعتبار نہیں ہے۔ دیکھیے النهاية. (ع۔و)

[2] سنن أبي داود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: 1576، وسنن النسائي، الزكاة، باب زكاة البقر، حديث: 2454، ومسند أحمد: 230/5 واللفظ لهما. [3] صحيح البخاري، الزكاة، باب زكاة الغنم، حديث: 1454.

أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا»

''جب خود چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک بھی کم ہوں تو ان میں زکاۃ نہیں الا یہ کہ مالک چاہے تو زکاۃ ادا کر دے۔''[1]

جب ایک سو اکیس بکریاں ہوں تو دو سو تک ان میں دو بکریاں زکاۃ ادا کی جائے جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں ہے:

«فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ إِلٰى مِائَتَيْنِ : شَاتَانِ»

''جب ایک سو بیس سے ایک بکری بھی زیادہ ہو جائے تو دو سو تک دو بکریاں زکاۃ ہے۔''[2]

جب دو سو ایک بکریاں ہوں تو تین سو تک اس میں تین بکریاں زکاۃ ہے جیسا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت ہے:

«فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى مِائَتَيْنِ إِلٰى ثَلَاثِمِائَةٍ فَفِيهَا ثَلَاثٌ»

''جب دو سو ایک (201) سے تین سو (300) تک بکریاں ہوں تو تین بکریاں زکاۃ ہے۔''[3]

اس مقدار کے بعد زکاۃ کی شرح ایک ہی رہتی ہے، یعنی ہر سو بکری میں ایک بکری زکاۃ ہے۔ چار سو میں چار، پانچ سو میں پانچ اور چھ سو میں چھ بکریاں زکاۃ ہیں۔ یہ ساری تفصیل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس خط میں موجود ہے جس پر وہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ وفات تک عمل کرتے رہے۔[4]

▲ زکاۃ میں ایسا بوڑھا، عیب دار جانور لیا یا دیا نہ جائے جس کی قربانی جائز نہ ہو الا یہ کہ سارا ریوڑ ہی ایسا ہو۔ اسی طرح حاملہ یا اپنے بچے کو دودھ پلانے والا جانور یا وہ جانور جس کے حاملہ ہونے کی امید ہو، زکاۃ میں نہ لیا جائے، چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

«وَلَا يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ، وَلَا ذَاتُ عَوَارٍ، وَلَا تَيْسٌ إِلَّا مَا شَاءَ الْمُصَدِّقُ»

''زکاۃ میں بوڑھا، عیب والا یا سانڈ جانور وصول نہ کیا جائے الا یہ کہ زکاۃ وصول کرنے والا چاہے۔''[5]

① صحيح البخاري، الزكاة، باب زكاة الغنم، حديث: 1454. ② صحيح البخاري، الزكاة، باب زكاة الغنم، حديث: 1454. ③ صحيح البخاري، الزكاة، باب زكاة الغنم، حديث: 1454. ④ صحيح البخاري، الزكاة، باب زكاة الغنم، حديث: 1454، وجامع الترمذي، الزكاة، باب ما جاء في زكاة الإبل والغنم، حديث: 621، وسنن أبي داود، الزكاة، باب زكاة السائمة، حديث: 1568. ⑤ صحيح البخاري، الزكاة، باب لا يؤخذ في الصدقة هرمة ولا ذات عوار......، حديث: 1455.

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾

''ان میں سے بری چیز کے خرچ کرنے کا قصد نہ کرنا۔''①

نیز رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

«وَلٰكِنْ مِّنْ وَّسَطِ أَمْوَالِكُمْ، فَإِنَّ اللهَ لَمْ يَسْأَلْكُمْ خَيْرَهُ وَلَمْ يَأْمُرْكُمْ بِشَرِّهِ»

''تم درمیانی قسم کے مال دیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے نہ زیادہ اچھا مال مانگتا ہے اور نہ تمھیں نکما مال دینے کا حکم دیتا ہے۔''②

الغرض زکاۃ دینے والے سے موٹا تازہ جانور جبراً وصول نہ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے ہوئے یہ تلقین کی تھی: [إِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ] ''لوگوں کا عمدہ مال لینے سے بچنا۔''③

◢ زکاۃ درمیانے درجے کی وصول کی جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''تم درمیانی قسم کے مال دیا کرو۔'' جس کی ساری بکریاں مریض ہوں تو زکاۃ میں مریض ہی قبول کی جائے کیونکہ زکاۃ کا مقصد ایک دوسرے سے غم خواری اور ہمدردی ہے۔ مریض بکریوں والے سے زکاۃ میں صحیح بکری کا مطالبہ کرنا ظلم ہے، اسی طرح جس کی سب بکریاں چھوٹی ہوں تو انھی سے زکاۃ لی جائے گی۔

◢ اگر زکاۃ دینے والا اعلیٰ اور افضل جانور دینا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ اس میں اس کے لیے اجر و ثواب زیادہ ہے۔

اگر مال میں جانور بڑے اور چھوٹے، تندرست اور بیمار یا نر اور مادہ ہوں تو بڑے اور چھوٹے جانوروں کی الگ الگ قیمت لگا کر دونوں قسم کے جانوروں کی قیمت کے برابر ایک بڑی تندرست مادہ زکاۃ میں لے لی جائے۔ اسی طرح دوسری قسمیں، مثلاً: تندرست اور بیمار یا نر اور مادہ کا اندازہ لگا لیا جائے۔ اگر تندرست بڑا جانور دو ہزار روپے کا ہو اور بیمار چھوٹا جانور ایک ہزار روپے کا ہو تو دونوں قیمتوں کا نصف، یعنی پندرہ سو روپے ادا کر دے۔

◢ اگر مویشیوں میں دو یا زیادہ افراد کی شراکت ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں:

① اشتراک اعیان، یعنی مال دو آدمیوں میں یوں مشترک ہو کہ ایک دوسرے کے مال کی تمیز و تعیین نہ ہو بلکہ اکٹھا

① البقرة 2:267. ② سنن أبي داود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: 1582. ③ صحيح البخاري، الزكاة، باب أخذ الصدقة من الأغنياء......، حديث: 1496، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدعاء إلى الشهادتين وشرائع الإسلام، حديث: 19.

مال ہو، مثلاً: ایک شخص کا نصف یا چوتھائی حصہ ریوڑ یا مال ہو۔

② اشتراک اوصاف، یعنی ہر ایک کا مال واضح اور معروف ہو، البتہ دونوں اپنا اپنا مال ملا کر ایک جگہ رکھتے ہوں۔

شراکت کی ان دونوں صورتوں میں دونوں شخص زکاۃ کے فرض ہونے یا اس کے ساقط ہونے میں شریک ہوں گے۔ اسی طرح زکاۃ کی کمی بیشی میں متاثر ہوں گے، نیز ان صورتوں میں دونوں کا مال ایک مال متصور ہو گا۔ اس کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

◄ مجموعی مال نصاب زکاۃ تک پہنچ چکا ہو۔ اگر مقرر نصاب سے کم مال ہو تو اس میں زکاۃ نہیں۔ واضح رہے یہاں مجموعی نصاب مراد ہے اگرچہ ہر ایک کا مال نصاب زکاۃ سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

◄ مشترکہ کاروبار میں دونوں وجوب زکاۃ کے اہل ہوں۔ اگر ایک کافر ہو تو اشتراک مؤثر نہ ہو گا صرف مسلمان کا مال نصاب زکاۃ تک ہو گا تو اس کے مال پر زکاۃ ہے، ورنہ نہیں۔

◄ دونوں کے جانور اکٹھے رہتے، چرتے اور ایک جگہ رات گزارتے ہوں۔ ان کا دودھ ایک جگہ دوہا جاتا ہو۔ اگر ہر ایک الگ الگ جگہ پر اپنے جانوروں کا دودھ دوہتا ہے تو یہ اشتراک متصور نہ ہو گا۔ مشترک ریوڑ کا سانڈ بھی مشترک ہو۔ سب جانور ایک ہی جگہ چرتے ہوں۔ اگر ہر ایک الگ الگ جگہ پر اپنے جانوروں کو چراتا ہو تو اشتراک مؤثر نہ ہو گا الگ الگ ملکیت شمار ہو گی۔

جب یہ تمام شرائط جمع ہو جائیں تو اشتراک کرنے والے دونوں شخصوں کا مال ایک مال شمار ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَلَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ، وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ، وَقَالَ: «وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيطَيْنِ فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ»

"زکاۃ دینے کے خوف سے متفرق مال کو اکٹھا نہ کیا جائے اور جو اکٹھا ہوا ہے متفرق (الگ الگ) نہ کیا جائے...... جو زکاۃ دو شریکوں سے وصول کی جائے گی، پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے برابری کی سطح پر وصولی کریں گے۔"[1]

◄ اگر ایک شخص کی ایک بکری ہو اور دوسرے کی انتالیس بکریاں ہوں یا چالیس اشخاص کی مشترکہ چالیس بکریاں ہوں۔ دونوں سارا سال اکھٹے رہے ہوں۔ اشتراک کی مذکورہ شرائط بھی موجود ہوں تو دونوں صورتوں میں مجموعی طور

① صحيح البخاري، الزكاة، باب لا يجمع بين مفترق ولا يفرق بين مجتمع، و باب ما كان من خليطين ......، حديث: 1451,1450.

پر ایک بکری زکاۃ ہے۔ پہلی صورت میں جس کی ایک بکری ہے اس کے ذمے بکری کا چالیس واں حصہ ہے۔ جب کہ دوسرے شخص کے ذمے ایک بکری کے انتالیس حصے ہیں۔ دوسری مثال میں ہر ایک کے ذمے بکری کا چالیسواں حصہ زکاۃ ہے۔

☜ اگر تین اشخاص کی ایک سو بیس بکریاں اس طرح ہوں کہ ہر ایک کی چالیس بکریاں ہیں تو مجموعی طور پر انھیں ایک بکری زکاۃ دینا ہوگی، اس طرح ہر ایک کو ایک تہائی بکری زکاۃ پڑے گی۔

جس طرح اشتراک مؤثر ہے، اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں تفریق بھی مؤثر ہے، مثلاً: ایک شخص کی جنگل میں چرنے والی بکریاں دو جگہ الگ الگ رہتی اور چرتی ہوں اور دونوں ریوڑوں میں اتنا فاصلہ ہو کہ نماز قصر کرنا جائز ہو جائے تو زکاۃ بھی الگ الگ ریوڑوں کے حساب سے دینا ہوگی۔ دونوں جگہوں کی بکریوں کو ملایا نہ جائے گا۔ جس جگہ بکریاں نصاب زکاۃ تک پہنچ جائیں گی ان کی زکاۃ ہوگی۔

جمہور علماء کے قول کے مطابق ایک شخص کے مال میں تفریق مؤثر نہ ہوگی بلکہ الگ الگ مال کو جمع کیا جائے گا اور یہی قول راجح ہے۔ واللہ أعلم.

غلہ، پھل، شہد، معدنیات اور مدفون مال کی زکاۃ کا بیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا۟ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُوا۟ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ حَمِيدٌ ﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمھارے لیے زمین میں سے نکالی ہیں اور مت ارادہ کرو (اللہ کی راہ میں) ردی اور خراب چیز خرچ کرنے کا' جب کہ تم (خود) تو وہ (چیز) لینا بھی پسند نہیں کرتے، الا یہ کہ اس کی بابت تم چشم پوشی کر جاؤ جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بے پروا ہے، قابل تعریف ہے۔“[1]

قرآن مجید میں زکاۃ کو ”نفقہ“ (خرچ کرنا) بھی کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] البقرة 2:267.

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

''اور جو لوگ سونے، چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔''[1] یعنی وہ زکاۃ نہیں دیتے۔

احادیث صحیحہ مشہورہ میں غلہ اور پھلوں کی زکاۃ نکالنے کا حکم اور اس کی مقدار وغیرہ کا بیان موجود ہے، نیز مسلمانوں کا اجماع ہے کہ گندم، جو، کھجور، منقّٰی میں زکاۃ فرض ہے۔ علاوہ ازیں چاول، چنا وغیرہ غلے میں بھی زکاۃ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسَاقٍ مِّنْ تَمْرٍ وَّلَا حَبٍّ صَدَقَةٌ»

''کھجور اور اناج کے پانچ وسق سے کم میں زکاۃ نہیں۔''[2]

نیز فرمایا:

«فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا ، الْعُشْرُ»

''جس کھیتی کو بارش اور چشموں کا پانی ملے یا جو نمی والی زمین ہو، اس میں ''عشر'' ہے۔''[3]

کھجور، منقّٰی وغیرہ ان تمام پھلوں میں زکاۃ فرض ہے جن کا وزن کیا جاتا ہو اور انھیں ذخیرہ کیا جا سکتا ہو۔ علاوہ ازیں وہ نصاب زکاۃ کی مقدار تک پہنچ جائیں۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ» ''پانچ وسق سے کم میں زکاۃ نہیں۔''[4]

واضح رہے ایک وسق ساٹھ صاع نبوی کا ہوتا ہے اور ایک نبوی صاع میں درمیانے آدمی کے چار لپ (دونوں ہاتھوں کے بھرنے کے بقدر) اناج ہوتا ہے (جس کا تحقیقی وزن دو کیلو اور ایک سو گرام ہے۔)

اناج اور پھلوں میں زکاۃ کے وجوب کی دو شرطیں ہیں:

① نصاب زکاۃ کی مقدار، یعنی پانچ وسق (630 کلوگرام) یا اس سے زیادہ اناج ہو۔

② وجوب زکاۃ کے وقت اس کی ملکیت میں ہو، وجوب زکاۃ کا وقت وہ ہے جب پھل میں پختگی آ جائے یا کھیتی میں دانہ سخت ہو جائے۔ اگر مذکورہ وقت کے بعد وہ مالک ہوا تو اس میں زکاۃ فرض نہیں، مثلاً: اس نے اناج خریدا ہو یا

① التوبة 9:34. ② صحيح مسلم، الزكاة، باب ليس فيما دون خمسة أوسق صدقة، حديث : 979. ③ صحيح البخاري، الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء والماء الجاري، حديث : 1483. ④ صحيح البخاري، الزكاة، باب ما أُدّيَ زكاته فليس بكنز، حديث : 1405، وصحيح مسلم، الزكاة، باب ليس فيما دون خمسة أوسق صدقة، حديث : 979.

کٹائی کی اجرت میں حاصل کیا ہو یا مختلف جگہوں سے جمع کیا یا چنا ہو۔

▲ اناج اور پھلوں میں سے نکالی جانے والی زکاۃ کی مقدار مختلف ہے جس کا دارو مدار کھیتی کو پانی دینے کے ذرائع کی نوعیت پر ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

اگر کھیت کو پانی دینے میں مشقت نہ ہو اور اسے سیلاب کا پانی یا سطح زمین پر بہنے والا بارش وغیرہ کا پانی ملتا ہو یا پودے اپنی جڑوں کے ذریعے سے زمین سے پانی حاصل کر لیں تو اس کی پیداوار میں عشر، یعنی دسواں حصہ ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا ، الْعُشْرُ»

''جس کھیتی کو بارش اور چشموں کا پانی ملے یا فصل خودرو ہو (زمین نمی والی ہو) تو اس میں عشر ہے۔''[1]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فِيمَا سَقَتِ الْأَنْهَارُ وَالْغَيْمُ الْعُشُورُ» ''جس زمین کو دریاؤں یا بادلوں کا پانی ملے اس میں عشر ہے۔''[2]

اگر کھیت کو کنویں وغیرہ سے مشقت اٹھا کر پانی دیا جائے تو اس میں نصف عشر، یعنی بیسواں حصہ زکاۃ ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ»

''جس کھیت کو رہٹ وغیرہ سے پانی پلایا جائے اس میں نصف عشر زکاۃ ہے۔''[3]

صحیح مسلم میں بھی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی روایت آئی ہے۔

«وَفِيمَا سُقِيَ بِالسَّانِيَةِ نِصْفُ الْعُشْرِ» ''اور جس کو رہٹ سے پانی دیا جائے اس میں نصف عشر ہے۔''[4]

▲ وجوب زکاۃ کا وقت وہ ہے جب پھل پک کر سرخ یا زرد ہو جائے یا دانہ سخت ہو جائے۔ اگر کسی شخص نے ایسی کیفیت و حالت ہو جانے کے بعد پھل یا اناج بیچ دیا تو زکاۃ اناج فروخت کرنے والے کے ذمہ ہو گی۔ خریدار کے ذمے نہ ہو گی۔

▲ اناج کی زکاۃ کی ادائیگی کے لیے لازم ہے کہ اسے چھلکے یا بھوسے سے نکال کر صاف کر لیا جائے۔ اگر میوہ ہو تو وہ خشک ہو جائے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ انگوروں کی زکاۃ کا اندازہ خشک انگور، یعنی منقّی کی

[1] صحيح البخاري، الزكاة ، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء والماء الجاري، حديث : 1483. [2] صحيح مسلم، الزكاة، باب ما فيه العشر أو نصف العشر، حديث: 981. [3] صحيح البخاري، الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء والماء الجاري، حديث : 1483. [4] صحيح مسلم، الزكاة، باب ما فيه العشر أو نصف العشر، حديث : 981.

صورت میں لگایا جائے۔ اور زکاۃ خشک انگوروں کی صورت میں لی جائے، جیسا کہ کھجور کے درخت پر لگی کھجوروں کی زکاۃ تیار اور پکی ہوئی کھجوروں کی صورت میں دی جاتی ہے۔ واضح رہے، زبیب یا تمر (منقّٰی اور خشک کھجور) ہی کو کہتے ہیں۔

▲ شہد میں زکاۃ تب ہے جب اسے اپنی ملکیت والی جگہ سے حاصل کر لیا گیا ہو یا غیر آباد غیر مملوک جگہ سے، جیسے پہاڑ کی چوٹیاں۔ اور نصاب، یعنی تیس صاع (62,60 کلوگرام) سے کم نہ ہو تب اس میں عشر، یعنی دسواں حصہ زکاۃ ہے۔

▲ معدنیات (جو دھاتیں اور جواہر زمین سے حاصل ہوں) میں زکاۃ اناج اور پھلوں کی طرح واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾

''(اے ایمان والو!) اپنی پاکیزہ کمائی میں سے خرچ کرو اور ان میں سے بھی جو ہم نے زمین میں سے نکالی ہیں۔''[1]

اگر وہ دھات سونا یا چاندی ہے تو اس میں چالیسواں حصہ زکاۃ ہے، بشرطیکہ وہ سونے یا چاندی کے نصاب تک پہنچ جائے۔ اگر زمین سے سرمہ، زرنیخ (ایک قسم کا زہر) گندھک، نمک اور پٹرول وغیرہ حاصل ہو تو اگر سونے یا چاندی کے نصاب کی مقدار یا اس سے زیادہ حاصل ہو تو اس کی قیمت میں چالیسواں حصہ زکاۃ ہے۔

▲ رکاز، یعنی زمانۂ جاہلیت میں کفار کی مدفون اشیاء دستیاب ہوں، وہ کثیر مقدار میں ہوں یا قلیل، اس میں خُمس، یعنی پانچواں حصہ زکاۃ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: [وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ] ''رکاز میں پانچواں حصہ زکاۃ ہے۔''[2]

کفار کے اموال کی پہچان ان کی کسی مخصوص علامت سے ہوگی، مثلاً: اس مال پر ان کے کسی بادشاہ کا نام کندہ ہو یا صلیب وغیرہ کا نقش ہو۔ جب اس کا پانچواں حصہ ادا کر دیا جائے تو باقی چار حصے اس شخص کے ہوں گے جسے وہ مال ملا تھا۔

اگر سارے یا بعض مدفون مال پر مسلمانوں کے عہد کی علامت ہو یا اس مال پر سرے سے کوئی علامت ہی نہ ہو تو اس کا حکم لُقَطَہ کا ہے جیسے راستے میں کسی کا گرا پڑا ہوا مال ملا ہے۔[3] حاصل شدہ کفار کے مدفون مال کی زکاۃ مالِ فے کی طرح مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر صرف کی جائے۔

[1] البقرة 2:267. [2] صحيح البخاري، الزكاة، باب في الركاز الخمس، حديث :1499، وصحيح مسلم، الحدود، باب جرح العجماء والمعدن والبئر جبار،حديث : 1710.

[3] ایسے مال کا ایک سال تک اعلان عام کیا جائے، اگر مالک آ جائے تو اسے واپس کر دیا جائے، ورنہ اٹھانے والا اسے اپنے مصرف میں لا سکتا ہے۔ (صارم)

▲ گزشتہ بحث سے واضح ہوا کہ زمین سے نکلنے والی متعدد اشیاء یہ ہیں: ① اناج اور پھل ② مختلف معدنیات ③ شہد ④ اور زمانہ جاہلیت کی مدفون اشیاء۔ یہ تمام انواع اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں داخل اور شامل ہیں:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمھارے لیے زمین میں سے نکالی ہیں۔''[1]

اور ارشاد ہے:

﴿ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ﴾ ''اور اس میں جو (اللہ کا) حق واجب ہے وہ اس کے کاٹنے کے دن دیا کرو۔''[2]

▲ زکاۃ زمین کی اس پیداوار میں ہے جس کو ماپا (یا وزن کیا) جاتا ہو اور ذخیرہ ہو سکے۔ اگر اس کو نہ ماپا جاتا ہو اور نہ ذخیرہ کیا جاتا ہو تو اس پر زکاۃ بھی فرض نہیں، مثلاً: اخروٹ، سیب، خوبانی، بہی اور انار وغیرہ۔ اسی طرح سبزیوں اور ترکاریوں، مثلاً: مولی، لہسن، پیاز، گاجر، تربوز، خربوزہ، کھیرا اور بینگن وغیرہ میں زکاۃ نہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [لَيْسَ فِي الْخَضْرَوَاتِ صَدَقَةٌ] ''سبزیوں میں زکاۃ نہیں۔''[3] نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''پانچ وسقوں سے کم میں زکاۃ نہیں'' ...... ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے نکلنے والی اشیاء میں ماپنے کے قابل ہونا اور ان کا ذخیرہ ہونے کے لائق ہونا یہ دونوں شرطیں معتبر ہیں، لہٰذا جن اشیاء کو ماپا تولا نہ جا سکے یا انھیں ذخیرہ نہ کیا جا سکے ان میں زکاۃ بھی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء نے ایسی ہی اشیاء کو نظر انداز کر دیا تھا، حالانکہ انھیں وہاں بویا اور کاشت کیا جاتا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کھیرا، ککڑی، پیاز، خوشبودار نباتات وغیرہ میں زکاۃ نہیں، البتہ انھیں فروخت کیا جائے اور ان کی قیمت پر ایک سال بیت جائے تو ان کی قیمت میں زکاۃ ہے۔''[4]

نقدی مال میں زکاۃ کا بیان

جان لیجیے! نقدی مال سے مراد سونا، چاندی، کرنسی، سونے اور چاندی کے زیور، ڈلی اور ان سے بنے ہوئے برتن وغیرہ ہیں۔

① البقرة 2:267. ② الأنعام 7:141. ③ [ضعيف] سنن الدارقطني، الزكاة، باب ليس في الخضروات صدقة :2/94، حديث :1890، وتلخيص الحبير، باب زكاة المعشرات:2/165. ④ المغني والشرح الكبير :2/548.

▲ سونے، چاندی میں زکاۃ کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾

''اور جو لوگ سونے چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجیے۔''[1]

اس آیت مبارکہ میں اس شخص کے لیے سخت عذاب کی وعید ہے جو سونا اور چاندی رکھتے ہوئے ان سے زکاۃ نہیں نکالتا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے:

«مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَّلَا فِضَّةٍ، لَا يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا، إِلَّا إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، صُفِّحَتْ لَهُ صَفَائِحُ مِنْ نَّارٍ»

''ہر وہ شخص جو سونے چاندی کا مالک ہے اور ان کا حق (زکاۃ) ادا نہیں کرتا قیامت کے دن اس کے لیے اسی سونے چاندی سے آگ کے تختے بنا دیے جائیں گے۔''[2]

ائمۂ کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آیت مذکورہ میں کلمہ ''کنز'' سے مراد وہ مال ہے جو زکاۃ کے نصاب کو پہنچ جائے لیکن اس میں زکاۃ ادا نہ کی جائے۔ اگر اس میں سے زکاۃ ادا کر دی جائے تو وہ ''کنز'' نہیں ہے۔ اور ''کنز'' کے لغوی معنی ہیں ہر وہ شے جس کو جمع کیا گیا ہو، خواہ زمین کے اندر جمع ہو یا باہر۔

▲ جب سونا کم از کم بیس مثقال (ساڑھے سات تولے) ہو اور چاندی دو سو اسلامی درہم (ساڑھے باون تولے) ہو تو ان میں چالیسواں حصہ زکاۃ ہے۔ یہ سونا، چاندی سکے کی صورت میں ہو یا اس کے علاوہ کسی اور شکل میں ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَأْخُذُ مِنْ كُلِّ عِشْرِينَ دِينَارًا فَصَاعِدًا نِّصْفَ دِينَارٍ»

''رسول اللہ ﷺ ہر بیس یا بیس سے زائد دینار میں سے نصف دینار زکاۃ لیا کرتے تھے۔''[3]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [فِي الرِّقَةِ رُبُعُ الْعُشْرِ] ''خالص چاندی میں چالیسواں حصہ زکاۃ ہے۔''[4]

سعودی عرب کی کرنسی جُنَیه (گنی) کے مطابق سونے کا نصاب 11.143 گنی ہے جبکہ سعودی عرب کی کرنسی ریال

---

[1] التوبة 9:34. [2] صحيح مسلم، الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، حديث: 987. [3] سنن ابن ماجه، الزكاة، باب زكاة الورق والذهب، حديث: 1791. [4] صحيح البخاري، الزكاة، باب زكاة الغنم، حديث: 1454.

کے حساب سے چاندی کا نصاب چھپن ریال یا اس کی قیمت کے برابر چاندی ہے۔ سونا یا چاندی مقرر نصاب تک یا اس سے زیادہ ہو تو اس میں سے چالیسواں حصہ زکاۃ ہے۔

مرد کے لیے کس قدر سونا، چاندی استعمال کرنا جائز ہے؟ مرد کے لیے چاندی کی انگوٹھی کا استعمال جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی اور استعمال کی تھی۔ ①

▲ مرد کے لیے سونے کی انگوٹھی کا استعمال حرام ہے کیونکہ نبی ﷺ نے مردوں کو سونے کا زیور استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ نہایت سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا:

«يَعْمِدُ أَحَدُكُمْ إِلٰى جَمْرَةٍ مِّنْ نَّارِ جَهَنَّمَ فَيَجْعَلُهَا فِي يَدِهِ»

''تم میں سے ایک شخص (سونا پہن کر) جہنم کی آگ کے انگارے کا قصد کرتا ہے، پھر اسے اپنے ہاتھ میں رکھتا (پہنتا) ہے۔'' ②

▲ کسی شدید ضرورت میں مرد کے لیے سونے کا استعمال مباح ہے، مثلاً: سونے کی ناک، یا دانتوں کے جوڑ کے لیے سونے کے تار کا استعمال درست ہے۔ سیدنا عرفجہ بن اسعد رضی اللہ عنہ کی جنگ کلاب کے روز ناک کٹ گئی تو انھوں نے چاندی کی ناک بنوالی جو بعد میں بدبودار ہو گئی، تب رسول اللہ ﷺ نے انھیں سونے کی ناک بنوانے کی اجازت دی۔ ③

عورتوں کے لیے کس قدر سونا، چاندی استعمال کرنا جائز ہے؟

▲ عورتوں کے لیے رواج کے مطابق سونے چاندی کا پہننا مباح ہے کیونکہ شارع علیہ السلام نے ان کے لیے اسے مطلق طور پر جائز قرار دیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«أُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِيرُ لِلْإِنَاثِ مِنْ أُمَّتِي وَحُرِّمَ عَلٰى ذُكُورِهَا»

''میری امت کی عورتوں پر سونے چاندی کا استعمال حلال ہے جبکہ مردوں پر حرام ہے۔'' ④

① صحيح البخاري، اللباس، باب خاتم الفضة، حديث: 5866، وصحيح مسلم، اللباس، باب لبس النبي ﷺ خاتما من ورق......، قبل حديث: 2092. ② صحيح مسلم، اللباس، باب تحريم خاتم الذهب على الرجال......، حديث: 2090. ③ سنن أبي داود، الخاتم، باب ما جاء في ربط الأسنان بالذهب، حديث: 4232، والسنن الكبرٰى للبيهقي، الصلاة، باب الرخصة في اتخاذ الأنف......: 426,425/2. ④ جامع الترمذي، اللباس، باب ما جاء في الحرير والذهب للرجال، حديث: 1720، وسنن النسائي، الزينة، باب تحريم لبس الذهب، حديث: 5267، ومسند أحمد: 393,392/4 واللفظ له.

▲ عورتوں کے سونے اور چاندی کے زیورات میں زکاۃ نہیں، بشرطیکہ انھیں استعمال کرنے، پہننے یا کسی کو عاریتاً دینے کے لیے بنوایا گیا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: [لَيْسَ فِي الْحُلِيِّ زَكَاةٌ] ''زیور میں زکاۃ نہیں۔'' [1] اگرچہ یہ روایت ضعیف ہے لیکن جمہور علماء کا عمل اس کا مؤید ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سیدنا انس، جابر، ابن عمر، عائشہ اور اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم کی یہی رائے ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ پانچ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مذہب تھا، نیز یہ مال بڑھتا بھی نہیں بلکہ گھٹتا ہے۔ یہ مال استعمال کے کپڑوں، خدمت کے غلاموں اور رہائشی گھروں کی طرح ہے۔'' [2]

اگر زیورات بنوانے کی غرض انھیں کرایہ پر دینا یا کسی ضرورت یا اہم کام کو پورا کرنا یا انھیں کاروبار میں لانا یا ذخیرہ کرنا اور سنبھال کر رکھنا ہو تو اس میں زکاۃ واجب ہے کیونکہ سونے اور چاندی پر زکاۃ واجب تھی اور وجوب کا یہ حکم تب ساقط ہوگا جب زیور استعمال یا عاریتاً دینے کے لیے بنوایا گیا ہو کیونکہ جب یہ مقصد نہ رہا تو ادائیگی کے وجوب کا اصل حکم باقی اور قائم رہا، بشرطیکہ وہ نصاب زکاۃ کی حد تک بنفسہٖ پہنچ جائے یا اسے دوسرے مال میں شامل کر کے نصاب زکاۃ تک پہنچ جائے۔ اور اگر وہ زیورات نصاب زکاۃ کی مقدار تک بنفسہٖ یا دوسرے مال سے ملا کر نہ پہنچ پائیں تو اس میں زکاۃ بھی نہیں، ہاں! اگر وہ سونا تجارت کے لیے ہو تو اس کی قیمت میں زکاۃ ہے۔

درو دیوار پر سونے چاندی کی ملمع سازی یا ان کے برتن بنوانے کا حکم: درو دیوار یا چھت پر سونے چاندی کی ملمع سازی یا کار وغیرہ کی کسی چیز پر یا اس کی چابیوں پر سونے چاندی کا ملمع کروانا ایک مسلمان شخص پر حرام ہے، اسی طرح سونے چاندی کا قلم یا دوات بنوانا یا اس پر پالش کروانا بھی حرام ہے کیونکہ یہ فضول خرچی اور تکبر میں شامل ہے۔ سونے یا چاندی کے برتن بنوانا یا ان پر پالش چڑھانا بھی حرام ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ شَرِبَ فِي إِنَاءٍ مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ فَإِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ»

''جو شخص سونے چاندی کے برتنوں میں پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ ڈالتا ہے۔'' [3]

گزشتہ روایت میں مردوں کے لیے سونے کے استعمال کی حرمت اور وعید واضح ہے لیکن اس کے باوجود مقام افسوس ہے کہ آپ کئی مسلمان مردوں کو دیکھیں گے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنے ہوئے ہوتے

---

[1] [ضعيف] سنن الدار قطني: 2/106، حديث: 1937. [2] المغني والشرح الكبير: 2/603-605 بتصرف۔ بہت سے علمائے کرام سونے چاندی کے زیورات کی زکاۃ کے قائل ہیں اور ان کے دلائل قوی اور زیادہ صحیح ہیں۔ (صارم) [3] صحيح البخاري، الأشربة، باب آنية الفضة، حديث: 5634، وصحيح مسلم، اللباس والزينة، باب تحريم استعمال أواني الذهب والفضة......، حديث: 2065 واللفظ له.

ہیں، سینوں پر زنجیریں لٹکاتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ حدیث رسول ﷺ میں موجود وعید شدید کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے یا پھر انھیں ایسی روایات کا علم ہی نہیں۔ ان لوگوں کو سونے کے زیورات پہننے سے توبہ کرنی چاہیے اور صرف چاندی کی انگوٹھی پر اکتفا کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مباح قرار دی ہے۔ حلال کے ہوتے ہوئے حرام استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝﴾

''اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔ اور وہ اسے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان تک نہیں ہوتا۔ اور جو شخص اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے، بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ بے شک اللہ نے ہر چیز کے لیے اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔''[1]

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے دین کی بصیرت اور اس کا فہم دے اور علم و اخلاص کی دولت سے مالا مال کر دے۔

سامان تجارت میں زکاۃ کا بیان

سامان تجارت میں زکاۃ فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾

''(اے نبی!) ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے (تاکہ) اس کے ذریعے سے انھیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں۔''[2]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝﴾

''اور جن کے مالوں میں مقررہ حصہ ہے۔ مانگنے والوں کا بھی اور سوال سے بچنے والوں کا بھی۔''[3]

علاوہ ازیں مال زیادہ تر سامان تجارت ہی کی صورت میں ہوتا ہے، اس لیے مذکورہ آیات کے عمومی حکم میں یہ بالاولیٰ شامل ہے۔ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم تجارت کے

[1] الطلاق 65:2، 3. [2] التوبة 9:103. [3] المعارج 70:24، 25.

مال میں سے زکاۃ ادا کریں۔[1]

علاوہ ازیں جنگل میں چرنے والے جانوروں کی طرح مال تجارت بڑھنے والا مال ہے۔ بنا بریں مال تجارت میں زکاۃ فرض ہے بشرطیکہ اس پر ایک سال گزر گیا ہو۔ متعدد علمائے کرام نے اس پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ائمہ اربعہ اور دیگر علمائے امت کا (ماسوا چند افراد کے) اس امر پر اجماع ہے کہ اموال تجارت میں زکاۃ فرض ہے، تاجر مقیم ہو یا مسافر یا کسی نے مال تجارت رکھ چھوڑا ہو اور وہ اس کی قیمت کے بڑھنے کا منتظر ہو یا کوئی دوکاندار ہو، نیز وہ مال تجارت نیا کپڑا ہو یا مستعمل لباس وغیرہ۔ کھانے پینے کی اشیاء ہوں یا پھل پھول، اچار مربے وغیرہ ہوں یا کوئی اور چیز، مٹی کے برتن (خواہ چینی مٹی کے ہوں یا عام) ہوں یا غلام، گھوڑے، خچر، گدھے اور بھیڑ بکریاں ہوں، خواہ انھیں گھر میں چارا لا کر ڈالا جائے یا وہ خود چر چگ لیتی ہوں تمام پر زکاۃ ہے کیونکہ ہر علاقے کے لوگوں کا باطنی مال زیادہ تر سامان تجارت پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ ان کا ظاہری مال زیادہ تر مویشیوں کی صورت میں ہوتا ہے۔''[2]

سامان تجارت میں زکاۃ کی فرضیت کی چند شرائط یہ ہیں:

① وہ اپنے کسی عمل کے نتیجے میں اس کا مالک بنا ہو، مثلاً: خرید وفروخت، قبول ہبہ، وصیت، حصول اجرت یا کسی اور کمائی کے طریقے سے مالک بنا ہو۔

② تجارت کی نیت سے کسی سامان کا مالک ہو، یعنی اس مال کے ذریعے سے مزید مال کمانے کی نیت رکھتا ہو کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے اور تجارت عمل ہے، لہٰذا دیگر اعمال کی طرح اس میں بھی نیت کو شامل کرنا ضروری ہے۔

③ اس مال کی قیمت سونے یا چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے۔

④ اس مال پر ایک سال گزر گیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَلَيْسَ فِي مَالٍ زَكَاةٌ حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ»

''کسی مال میں زکاۃ تب ہے جب اس پر ایک سال گزر گیا ہو۔''[3]

اگر کسی نے زکاۃ کے نقدی نصاب کے عوض کوئی اور سامان تجارت خرید لیا یا ایسے سامان کے بدلے میں اور سامان خریدا جو زکاۃ کے نصاب تک پہنچ چکا تھا تو مدت سال کی ابتدا اسی مال سے شمار ہو گی جس کے عوض نیا سامان تجارت خریدا گیا ہے۔

① سنن أبي داود، الزكاة، باب العروض إذا كانت للتجارة هل فيها زكاة؟ حديث: 1562. ② مجموع الفتاوى لابن تيمية: 45/25. ③ سنن أبي داود، الزكاة، باب في زكاة السائمة، حديث: 1573.

▲ مال تجارت میں سے زکاۃ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ سال مکمل ہونے پر اس کی قیمت کرنسی کے ساتھ بنا لی جائے (اس میں فقراء کی بہتری کا لحاظ رہے) اور وہ سونے یا چاندی کی کرنسی کے نصاب تک پہنچ جائے تو چالیسواں حصہ اس میں زکاۃ ہے۔ واضح رہے مال کا بھاؤ وہ نہیں لگے گا جو ایک سال قبل تھا بلکہ موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا۔ تاجر اور زکاۃ وصول کرنے والے دونوں کے درمیان یہی عدل وانصاف ہے۔

▲ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ سامان تجارت کی زکاۃ نکالتے وقت وہ اپنے اموال تجارت کی ایک ایک چیز کا اچھی طرح باریک بینی سے حساب وکتاب کرے جیسا کہ شراکت کی صورت میں ایک حریص اور بخیل شخص کاروبار میں شریک اپنے ساتھی کے ساتھ مین میکھ نکال کر ہر چیز کا حساب کرتا ہے۔ اسے چاہیے کہ جو بھی مختلف انواع کا سامان تجارت اس کے پاس ہے وہ شمار کرے، پھر اس کی صحیح اور مناسب قیمت لگائے، مثلاً: جنرل سٹور کے مالک کے پاس دکان میں مختلف اقسام کی جو اشیاء ہیں حتی کہ ڈبوں میں بند سامان، چھوٹی چھوٹی اور ہر قسم کی اشیاء وغیرہ، سب کا حساب کرے اور اوزار، مشینری، سپیئر پارٹس اور گاڑیاں جو فروخت کے لیے ہیں ان کی قیمت لگائی جائے، اسی طرح فروخت کے لیے جو پلاٹ اور عمارات ہوں ان کی بھی قیمت لگائی جائے، البتہ جو عمارات، گھر اور کاریں وغیرہ کرائے کے لیے ہوں، ان میں زکاۃ نہیں۔ ان اشیاء کے کرائے کی آمدن میں زکاۃ ہے بشرطیکہ اس پر ایک سال گزر جائے۔

رہائشی مکانات، ضروری اور سواری میں استعمال ہونے والی گاڑیوں میں زکاۃ نہیں۔ اسی طرح گھر یا دکان کا سامان، تاجر کے آلات، مثلاً: پیمائش، ناپ اور وزن کرنے کی اشیاء، عطار کی شیشیاں ان تمام اشیاء میں زکاۃ نہیں کیونکہ انھیں تجارت کی خاطر رکھا نہیں جاتا۔

▲ میرے مسلمان بھائیو! خوشی کے ساتھ پورا پورا حساب کر کے ثواب کی نیت سے زکاۃ نکالو۔ اسے دنیا وآخرت میں اپنے لیے غنیمت سمجھو، تاوان وجرمانہ نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ ۚ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۚ سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ﴾

''اور کچھ دیہاتی اس کو تاوان سمجھتے ہیں جو وہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور وہ تمھارے خلاف زمانے کی گردشوں کا انتظار کرتے ہیں (مگر) منحوس گردش انھی کے خلاف ہے اور اللہ خوب سننے والا، خوب

جاننے والا ہے۔ اور کچھ دیہاتی وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں، اور وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اسے اللہ کے ہاں قربت اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آگاہ رہو! یقیناً یہ (خرچ کرنا) ان کے لیے قربت کا ذریعہ ہے، اللہ جلد انھیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

اس آیت سے واضح ہوا کہ دونوں گروہ زکاۃ دیتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر ایک سے معاملہ اس کی نیت کے حساب سے ہوگا۔ پہلے گروہ نے زکاۃ کو تاوان سمجھا لیکن ادا اس لیے کی کہ ان (منافقین) کے بارے میں اسلام کا جو حکم (تغلیظ و جہاد) تھا اس سے خود کو بچا لیں اور محفوظ کر لیں۔ اور وہ منتظر تھے کہ مسلمانوں پر کوئی برا وقت آئے تو ان سے انتقام لیں لیکن انھیں سزا یہ ملی کہ انھی پر برے دن آئے اور ثواب سے محروم ہوئے اور اموال میں نقصان اٹھایا۔ دوسرا گروہ اہل ایمان کا تھا جو اللہ تعالیٰ کے قرب اور حصول ثواب کی نیت سے زکاۃ دیتے تھے۔ ان کے لیے پورا پورا اجر ہے جو انھوں نے خرچ کیا اس کے بدلے میں انھیں خیر و بھلائی ملے گی کیونکہ ان کی نیت اچھی تھی اور مقصد بلند تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِىْ رَحْمَتِهٖ ﴾

''یاد رکھو کہ ان کا یہ خرچ کرنا بے شک ان کے لیے موجب قربت ہے، ان کو اللہ (تعالیٰ) ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔''[2]

اے مسلمان بھائی! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ اور اس آیت کے معانی پر غور و خوض کرو۔

﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''اور اللہ کو قرض حسنہ دو۔ اور تم اپنے آپ کے لیے جو نیکی آگے بھیجو گے تو اسے اللہ کے ہاں بہتر اور زیادہ اجر والی پاؤ گے۔ اور اللہ سے استغفار کرو۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔''[3]

صدقۂ فطر کا بیان

صدقۂ فطر (فطرانہ) کا تعلق ماہ رمضان المبارک سے ہے۔ اسے صدقۂ فطر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسے

[1] التوبة 9:98، 99. [2] التوبة 9:99. [3] المزمل 73:20.

روزوں کے مکمل ہونے پر دیا جاتا ہے۔

صدقۂ فطر کی فرضیت کی دلیل کتاب وسنت اور اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝﴾ ''بے شک فلاح پا گیا جو پاک ہوا۔''[1]

بعض سلف صالحین کا کہنا ہے یہاں ﴿تَزَكّٰى﴾ سے مراد صدقۂ فطر کا ادا کرنا ہے۔ علاوہ ازیں آیت ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ کے حکمِ عام میں صدقۃ الفطر بھی شامل ہے۔

حدیث نبوی ہے:

«فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ، وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثٰى، وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ»

''رسول اللہ ﷺ نے ایک صاع کھجور کا یا ایک صاع جو (وغیرہ) کا صدقۂ فطر کے طور پر مسلمان غلام، آزاد، مرد، عورت، بچے اور بالغ پر فرض قرار دیا ہے۔''[2]

علماء نے اس پر اہل اسلام کا اجماع نقل کیا ہے۔

- صدقۂ فطر کی مشروعیت میں یہ حکمت ہے کہ بشری کمزوریوں کی وجہ سے روزے دار کے روزوں میں واقع ہونے والے گناہوں اور لغویات کے آثار ختم ہو جاتے ہیں اور روزے دار پاک صاف ہو جاتا ہے، نیز مساکین کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا ہے اور روزوں کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہو جاتا ہے۔
- صدقۂ فطر ہر مسلمان مرد، عورت، بچے، بالغ، آزاد اور غلام پر فرض ہے جیسا کہ اوپر روایت میں بیان ہو چکا ہے۔
- صدقۂ فطر کی مقدار ایک صاع نبوی ہے۔ باقی رہی جنس تو وہ کوئی ایک دی جا سکتی ہے جو علاقے کے لوگوں میں بطور خوراک عام استعمال ہوتی ہو، مثلاً: گندم، جو، کھجور، منقٰی، پنیر، چاول اور مکئی وغیرہ۔
- صدقۂ فطر کا افضل وقت یکم شوال، یعنی عید کی رات غروب آفتاب سے لے کر نماز عید کی ادائیگی سے پہلے تک ہے، البتہ عید سے ایک دو روز پہلے بھی دیا جا سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم فطرانہ عید سے ایک دو دن پہلے ادا کر دیا کرتے تھے۔[3] گویا اس مسئلے پر ان کا یہ اجماع تھا۔

---

① الأعلى 87:14. ② صحيح البخاري، صدقة الفطر، باب فرض صدقة الفطر، حديث: 1503، وصحيح مسلم، الزكاة، باب زكاة الفطر على المسلمين من التمر و الشعير، حديث: 984. ③ صحيح البخاري، صدقة الفطر، باب فرض صدقة الفطر، حديث: 1503، وصحيح مسلم، الزكاة، باب زكاة الفطر على المسلمين من التمر والشعير، حديث: 984.

▲ صدقۂ فطر کی ادائیگی نمازِ عید کی ادائیگی سے پہلے پہلے افضل ہے۔ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے نمازِ عید سے قبل ادا نہ کر سکا تو عید کے بعد بطور قضا ادا کر دے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

«مَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ فَهِيَ زَكَاةٌ مَّقْبُولَةٌ، وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلَاةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِّنَ الصَّدَقَاتِ»

''جس نے نمازِ عید سے پہلے صدقۂ فطر ادا کر دیا تو وہ مقبول صدقہ ہوگا اور جس نے نماز کے بعد ادا کیا تو یہ عام صدقات میں سے ایک صدقہ ہے۔''[1]

ایسا شخص مقرر وقت میں تاخیر کرنے کی وجہ سے ضرور گناہ گار ہوگا کیونکہ اس میں حکمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہوئی ہے۔

▲ ایک مسلمان اپنی طرف سے اور جن کے نان ونفقے کا وہ ذمہ دار ہے، مثلاً: بیویاں، اولاد اور اقارب سب کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرے کیونکہ ارشادِ نبوی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ فَرَضَ زَكَاةَ الْفِطْرِ عَلَى الصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ، وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثَى مِمَّنْ تَمُونُونَ»

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر (فطرانہ) ہر چھوٹے، بڑے اور مرد وعورت، جن کے تم نان ونفقے کے ذمہ دار ہو، پر فرض کیا ہے۔''[2]

▲ حمل میں جو بچہ ہے اس کا صدقۂ فطر ادا کرنا مستحب ہے۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا یہی عمل تھا۔

▲ اگر کسی نے کسی دوسرے شخص کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھا لی لیکن اس دوسرے شخص نے ذمے دار کی اجازت کے بغیر اپنا صدقۂ فطر خود ہی ادا کر دیا تو وہ کافی ہوگا کیونکہ اصل میں ادا کرنے والے پر فرض تھا نہ کہ ذمے دار پر۔ اگر کسی شخص نے ایسے شخص کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کیا جس کا نفقہ اس کے ذمے نہ تھا تو یہ جائز ہے بشرطیکہ اس کی اجازت ہو، اگر اس کی اجازت کے بغیر ادا کیا گیا تو وہ ادا نہیں ہوگا۔

▲ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ابن قیم رحمہ اللہ کا وہ کلام نقل کریں جو انھوں نے صدقۂ فطر کی اجناس سے متعلق کیا ہے، چنانچہ موصوف فرماتے ہیں: ''حدیث میں پانچ اجناس، یعنی گندم، جو، کھجور، منقّی اور پنیر کا ذکر ہے۔ یہ اجناس اہل مدینہ کی عموماً خوراک تھی۔ اگر کسی علاقے کی خوراک ان اجناس کے علاوہ ہے تو وہ وہی اشیاء ایک صاع کی

[1] سنن أبي داود، الزكاة، باب زكاة الفطر، حديث: 1609. [2] سنن الدارقطني: 2/141,140، حديث: 2059,2058.

مقدار صدقۂ فطر ادا کریں گے، مثلاً: دودھ، گوشت یا مچھلی وغیرہ۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے جو درست ہے کیونکہ صدقۂ فطر کا مقصد عید کے روز مساکین کی خوراک کی ضرورت کو پورا کرنا ہے اور اس سے ان کی ہمدردی ہے، یہ مقصد اہل علاقہ کی خوراک میں مستعمل اشیاء کی ادائیگی ہی سے کماحقہ حاصل ہوسکتا ہے۔ بنا بریں صدقۂ فطر میں آٹا دینا بھی درست ہے اگرچہ اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں۔ پکی ہوئی روٹی یا تیار کھانا دینے میں اگرچہ مساکین کے لیے زیادہ فائدہ ہے اور اس میں ان کے لیے محنت و مشقت بھی ختم ہو جاتی ہے لیکن غلہ اور اناج بہتر ہے کیونکہ وہ ذخیرہ بھی ہوسکتا ہے۔"[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگرچہ حدیث شریف میں مقرر (پانچ) اجناس کا بیان ہے لیکن مناسب یہ ہے کہ صدقۂ فطر میں وہ جنس ادا کی جائے جو اس علاقے کے لوگوں کی عام خوراک ہو، مثلاً: چاول وغیرہ۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے بلکہ یہ اکثر علماء کا قول ہے جو صحیح ہے کیونکہ صدقات کے وجوب کا اصل مقصد فقراء و مساکین کی ہمدردی ہے۔"[2]

▲ صدقۂ فطر میں غلہ اور اجناس کے بدل میں اس کی نقد قیمت (روپے) دینا خلاف سنت ہے، لہٰذا کافی نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اور آپ کے صحابہ سے ایسا منقول نہیں کہ وہ صدقۂ فطر میں اجناس کی قیمت دیتے ہوں، چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "صدقۂ فطر میں نقد قیمت نہ دی جائے۔ کسی نے کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نقد قیمت دینے لینے کے قائل تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرمانے لگے: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے فرمان کو چھوڑ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں نے یوں کہا؟ حالانکہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (گندم، جو...... کا ایک صاع صدقۂ فطر) فرض قرار دیا ہے۔"[3]

▲ صدقۂ فطر مقررہ وقت میں مستحقین کے پاس خود یا کسی بااعتماد نائب کے ذریعے سے پہنچا دینا چاہیے۔ اگر کسی خاص مسکین کو صدقۂ فطر دینے کے لیے جا نہ سکا یا اسے اس تک پہنچانے والا کوئی شخص بھی نہ ملا تو وہ کسی اور مسکین یا فقیر کو دے دے۔

ملاحظہ: بعض لوگ اس موقع پر ایک غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ اس طرح کہ صدقۂ فطر ایسے شخص کے سپرد کر دیتے ہیں جو مستحق شخص کی طرف سے نائب و ذمہ دار نہیں ہوتا۔ صدقۂ فطر ایسے شخص کے حوالے کرنا درست نہیں، چنانچہ اس مسئلے پر توجہ دلانا نہایت ضروری ہے۔

[1] إعلام الموقعين: 15/3. [2] مجموع الفتاوىٰ: 43/13، بتصرف يسير. [3] المغني والشرح الكبير: 671/2. یہ ایک موقف ہے جبکہ دوسرا موقف یہ بھی ہے کہ صدقۃ الفطر میں قیمت بھی دی جاسکتی ہے۔ (ع۔و)

زکاۃ کی ادائیگی کا بیان

احکام زکاۃ میں سے سب سے اہم حکم زکاۃ کے مصارف شرعیہ کو جاننا ہے تاکہ زکاۃ اپنے موقع ومحل یا مستحق شخص تک پہنچ جائے اور ادا کرنے والا اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے۔

میرے مسلمان بھائی! جب مال میں زکاۃ واجب ہو جائے تو اس کی ادائیگی وجوب کے ساتھ ہی بلا تاخیر کر دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ میں ''آتُوا'' امر کا صیغہ ہے جو فوراً ادائیگی کا متقاضی ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

«مَا خَالَطَتِ الصَّدَقَةُ مَالًا قَطُّ إِلَّا أَهْلَكَتْهُ»

''جب زکاۃ مال کے ساتھ مل جاتی ہے (اسے نکال کر ادا نہیں کیا جاتا) تو وہ سارے مال کو تباہ کر دیتی ہے۔''[1]

اس روایت کی روشنی میں مال کی تباہی سے بچنے کے لیے زکاۃ جلد از جلد الگ کر کے ادا کر دینی چاہیے۔ علاوہ ازیں مساکین وفقراء کی ضروریات اس امر کی متقاضی ہیں کہ مالِ زکاۃ مستحقین تک فوراً پہنچا دیا جائے۔ تاخیر میں ان کا نقصان ہے، نیز ممکن ہے کہ زکاۃ فرض ہونے کے بعد اس کی ادائیگی میں سستی کرنے والا کسی رکاوٹ یا موت کا شکار ہو جائے اور فرض قرض بن جائے۔ مالِ زکاۃ کی جلد ادائیگی زکاۃ ادا کرنے والے کے بخل سے پاک اور اس کے ذمے دار ہونے کی علامت ہے اور یہ چیز رب تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے حصول کا سبب ہے۔

بنا بریں جب زکاۃ فرض ہو جائے تو اسے فوراً نکال کر ادا کر دینا چاہیے، البتہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر تاخیر ہو سکتی ہے، مثلاً: زکاۃ ادا کرنے والے کا خیال ہو کہ چند دن کی تاخیر سے مال زکاۃ زیادہ ضرورت مند شخص تک پہنچ جائے گا یا اس وقت اس کے پاس مال موجود نہ ہو وغیرہ۔

▲ بچے اور مجنون کے مال میں زکاۃ واجب ہے کیونکہ دلائل میں عموم ہے، استثنا کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کے مال کے سرپرست زکاۃ کی ادائیگی کے ذمے دار ہیں کیونکہ یہ حق بوجہ نیابت ان کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

▲ زکاۃ نکالتے وقت نیت کرنا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''[2] اور ادائیگی زکاۃ ایک عمل ہے۔

---

[1] [ضعيف] المسند للإمام الحميدي: 115/1، حديث: 237، وهداية الرواة...... :254/2، حديث: 1733. [2] صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ......، حديث: 1.

▲ افضل اور بہتر یہ ہے کہ صاحب مال خود زکاۃ تقسیم کرے تا کہ اسے یقین ہو جائے کہ زکاۃ مستحق لوگوں تک پہنچ گئی ہے، البتہ اس کے لیے وہ کسی با اعتماد شخص کو اپنا نمائندہ بھی بنا سکتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا خلیفہ خود تقسیم کرنے کے لیے زکاۃ طلب کرے تو اسے یا اس کے نمائندے کے حوالے کر دینی چاہیے۔

▲ زکاۃ کی ادائیگی کے وقت ادا کرنے والا اور وصول کرنے والا دونوں دعائیہ کلمات کہیں، مثلاً: زکاۃ دینے والا کہے: اَللّٰھُمَّ! اجْعَلْھَا مَغْنَمًا وَّلَا تَجْعَلْھَا مَغْرَمًا ''اے اللہ! اسے باعث غنیمت بنا، باعث نقصان نہ بنانا۔''[1]

اور زکاۃ وصول کرنے والا یوں کہے:

«آجَرَكَ اللهُ فِيمَا أَعْطَيْتَ، وَجَعَلَهَا لَكَ طَهُورًا، وَبَارَكَ لَكَ فِيمَا أَبْقَيْتَ»

''جو تم نے دیا ہے اللہ تمھیں اس کا اجر دے اور جو تمھارے پاس ہے اس میں برکت کرے اور تمھارے لیے اسے ذریعۂ پاکیزگی بنائے۔''[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾

''(اے نبی!) ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے (تا کہ) اس کے ذریعے سے انھیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں اور ان کے لیے دعا کیجیے۔''[3]

سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی (رضی اللہ عنہ) کا بیان ہے کہ جب کوئی قوم آپ ﷺ کے پاس مال زکاۃ لے کر آتی تو آپ ﷺ اسے یوں دعا دیتے: اَللّٰھُمَّ! صَلِّ عَلَیْھِمْ ''اے اللہ! ان پر رحمت فرما۔''[4]

▲ اگر کوئی شخص محتاج ہو اور زکاۃ لینا اس کا معمول ہو تو اسے زکاۃ دیتے وقت یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہ مال زکاۃ ہے تا کہ اسے تکلیف نہ ہو، البتہ اگر کسی محتاج شخص کا زکاۃ وصول کرنا معمول نہیں تو اسے مالِ زکاۃ دیتے وقت آگاہ کر دیا جائے۔

▲ بہتر صورت یہ ہے کہ زکاۃ دینے والا مالِ زکاۃ اپنے محلے یا شہر میں تقسیم کرے، البتہ کسی شرعی مصلحت اور ضرورت کے پیش نظر دوسرے شہر منتقل کر سکتا ہے، مثلاً: کسی کے محتاج رشتے دار دوسرے شہر میں رہتے ہوں یا اس کے اپنے شہر کے فقراء کی نسبت دوسرے زیادہ حاجت مند ہوں۔ عہد نبوی میں مختلف اطراف سے مالِ زکاۃ

---

① (موضوع) سنن ابن ماجه، الزكاة، باب ما يقال عند إخراج الزكاة؟ حديث: 1797، وإرواء الغليل: 343/3، حديث: 852. ② الأم للشافعي: 316/2، وشرح النووي على صحيح مسلم: 259/17. ③ التوبة 103:9. ④ صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية، حديث: 4166، وصحيح مسلم، الزكاة، باب الدعاء لمن أتى بصدقة، حديث: 1078.

مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آتا تھا جسے آپ ﷺ مستحق مہاجرین اور انصار میں تقسیم کر دیتے تھے۔

مسلمانوں کے امیر پر لازم ہے کہ مسلمانوں کے ظاہری مال، یعنی جانور، غلہ اور پھل وغیرہ کی زکاۃ کی وصولی کے لیے اپنے نمائندے روانہ کرے کیونکہ نبی ﷺ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مالِ زکاۃ کی ادائیگی میں سست لوگ سستی نہ کریں گے اور اگر کوئی وجوب زکاۃ سے ناواقف ہوگا تو اسے مسائل کا علم ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں اس میں لوگوں کے لیے سہولت ہے اور فرض کی ادائیگی میں ان کے ساتھ تعاون بھی ہے۔

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ زکاۃ فرض ہو جانے کے بعد اس کی ادائیگی میں جلدی کرے اور اس میں بلا وجہ تاخیر نہ کرے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، البتہ ایک سال کی پیشگی زکاۃ ادا کر دینا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے دو سال کی زکاۃ وصول کی تھی (اس میں ایک سال کی زکاۃ پیشگی تھی۔)[1]

جمہور علماء کے نزدیک پیشگی زکاۃ کی وصولی اس شرط پر ہے کہ جب وجوب کا سبب قائم ہو چکا ہو۔ اس میں جانور، غلہ، سونا، چاندی اور سامان تجارت وغیرہ سب کی زکاۃ کا حکم یکساں ہے بشرطیکہ اسے نصاب زکاۃ اور اس کی ملکیت حاصل ہو۔ پیشگی زکاۃ نہ لینا بہتر ہے تاکہ آدمی دائرۂ اختلاف سے نکل جائے۔ واللہ أعلم.

زکاۃ کے مستحق اور غیر مستحق افراد کا بیان

قرآن مجید میں آٹھ مصارف زکاۃ بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○﴾

"زکاۃ تو صرف فقیروں اور مسکینوں اور ان اہلکاروں کے لیے ہے جو اس (کی وصولی) پر مقرر ہیں اور ان کے لیے جن کی دلداری مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے اور قرضہ داروں (کے قرض اتارنے) کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں، (یہ) اللہ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔"[2]

[1] صحيح البخاري، الزكاة، باب قول الله تعالى: ﴿وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾، حديث: 1468، وصحيح مسلم، الزكاة، باب في تقديم الزكاة ومنعها، حديث: 983. [2] التوبة 9:60.

مال زکاۃ ادا کرنے کے یہی مذکورہ مقامات ہیں ان کے علاوہ بالا جماع کوئی اور مصرف نہیں ہے۔ سیدنا زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ لَمْ يَرْضَ بِحُكْمِ نَبِيٍّ وَّلَا غَيْرِهِ فِي الصَّدَقَاتِ حَتَّى حَكَمَ فِيهَا هُوَ، فَجَزَّأَهَا ثَمَانِيَةَ أَجْزَاءٍ»

''اللہ تعالیٰ نے زکاۃ کے آٹھ مصارف خود ہی بیان کر دیے ہیں اور اس بارے میں اپنے نبی یا کسی اور شخص کی مداخلت پسند نہیں فرمائی۔''[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کو فرمایا:

«فَإِنْ كُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْأَجْزَاءِ أَعْطَيْتُكَ حَقَّكَ»

''اگر تو (بھی) ان آٹھ مصارف میں سے ہے تو میں تجھے مالِ زکاۃ دے دیتا ہوں۔''[2]

واضح رہے کہ اس فرمان کا موقع محل یہ ہے کہ جب بعض منافقین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صدقات و زکاۃ کی تقسیم کے بارے میں اعتراض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ تقسیم اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی ہے اور اسی نے اس کا حکم اور فیصلہ صادر فرمایا ہے اور خود ہی اس کا ذمہ لیا ہے اور کسی دوسرے کو اس کی تقسیم کا اختیار نہیں دیا۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر آٹھ مصارف موجود ہوں تو زکاۃ ان میں تقسیم کی جائے۔ اگر تمام مصارف موجود نہ ہوں تو جتنے موجود ہوں، ان میں تقسیم کر دی جائے۔ اگر کوئی بھی مصرف موجود نہ ہو تو جہاں موجود ہو وہاں پہنچا دی جائے۔''[3]

نیز شیخ موصوف فرماتے ہیں: ''مالِ زکاۃ اس شخص کو دینا چاہیے جو موحد اور نیک ہو تاکہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زکاۃ اسی لیے فرض کی ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ تعاون ہو، جو فقراء و مساکین وغیرہ نماز ادا نہیں کرتے انھیں تب تک زکاۃ نہ دی جائے جب تک وہ توبہ کر کے نماز کی ادائیگی کا التزام نہیں کرتے۔''

▲ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ان آٹھ مصارف کے علاوہ کسی اور جگہ پر مالِ زکاۃ اور صدقات خرچ نہ کیا جائے، مثلاً: مساجد و مدارس کی تعمیر کے لیے کیونکہ آیت میں کلمہ إِنَّمَا حصر کا فائدہ دیتا ہے، ان آٹھ کے لیے ثابت کرتا ہے اور ان کے سوا سے اس کی نفی کرتا ہے، لہٰذا مصارف یہی آٹھ ہیں، ان کے علاوہ اور نہیں۔ ان مصارف کی دو قسمیں ہیں:

---

[1] سنن أبي داود، الزكاة، باب من يعطى من الصدقة وحد الغنى، حديث: 1630. [2] سنن أبي داود، الزكاة، باب من يعطى من الصدقة وحد الغنى، حديث: 1630. [3] الفتاوى الكبرى لابن تيمية، الاختيارات العلمية: 373/5.

پہلی قسم: ضرورت مند مسلمان۔

دوسری قسم: وہ لوگ جنھیں مال دینا اسلام کی تقویت کا باعث ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝﴾

''زکاۃ تو صرف فقیروں اور مسکینوں اور ان اہلکاروں کے لیے ہے جو اس (کی وصولی) پر مقرر ہیں اور ان کے لیے جن کی دلداری مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے اور قرضہ داروں (کے قرض اتارنے) کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں، (یہ) اللہ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔''[1]

اس آیت میں صرف آٹھ مصارف کا تذکرہ ہے جہاں مال زکاۃ خرچ ہونا چاہیے۔ ان کے علاوہ کسی اور مصرف میں مال زکاۃ خرچ کرنا جائز نہیں۔ اب ان مصارف کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

① فقراء: فقراء، مساکین سے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے فقراء کا ذکر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ الأهم فالأهم سے ابتدا کرتا ہے، پھر درجہ بدرجہ دوسروں کا ذکر کیا ہے۔

فقراء وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی معیشت اور گزران کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہیں پاتے اور ان میں کمانے کی ہمت و طاقت بھی نہیں ہوتی یا انھیں کچھ مال ملتا ہے تو وہ نہایت معمولی ہوتا ہے، لہٰذا ایسے لوگوں کو اس قدر زکاۃ دی جائے کہ ایک سال تک ان کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں۔

② مساکین: مساکین، فقراء سے بہتر حالت میں ہوتے ہیں۔ مسکین وہ شخص ہے جسے مالی آمدن تو ہو لیکن اس سے اس کا گزارا بہت مشکل سے ہو۔ ایسے شخص کو مالِ زکاۃ میں سے اس قدر دیا جائے کہ اس کی ایک سال کی ضروریات پوری ہو جائیں۔

③ زکاۃ جمع کرنے والے: خلیفۃ المسلمین کے حکم سے جو لوگ زکاۃ جمع کرتے ہیں، اس کی نگرانی کرتے ہیں اور مستحقین پر تقسیم کرنے کا بندوبست کرتے ہیں، اسی مالِ زکاۃ سے ان لوگوں کی اجرت اور معاوضہ دیا جائے۔ اگر امیر بیت المال میں سے ان کی تنخواہ مقرر کر دے تو مالِ زکاۃ میں سے مال وصول کرنا ان کے لیے جائز نہیں جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے کہ حکومت کی جانب سے تنخواہیں بھی مقرر ہیں اور اس کے علاوہ بھی زکاۃ کے مال میں سے کچھ مراعات حاصل کر لیتے ہیں، چنانچہ مالِ زکاۃ میں سے حصہ لینا ان پر حرام ہے کیونکہ انھیں اپنے کام کا معاوضہ دوسری

① التوبۃ 60:9.

طرف سے مل رہا ہے۔

④ تالیف قلوب: اس مصرف سے متعلق دو قسم کے لوگ ہیں:

① وہ کافر شخص جو اسلام کی طرف راغب ہو اور اس کے اسلام قبول کرنے کی امید و توقع ہو۔ ایسے شخص کو زکاۃ دے دی جائے تاکہ اسلام کی طرف اس کا میلان زیادہ ہو جائے یا وہ کافر جس کو مال دینے سے اس کے شر سے یا اس کی وجہ سے دوسروں کی شرارتوں اور فتنوں سے مسلمان محفوظ ہوتے ہوں۔

② کسی نومسلم کے ایمان کو مضبوط کرنے کے لیے اسے زکاۃ دینا درست ہے۔ اسی طرح اگر اسے زکاۃ دینے سے اس جیسے دوسرے غیر مسلم کو اسلام کی رغبت پیدا ہونے کی امید ہو تو بھی اس نومسلم کو زکاۃ دے دی جائے۔

اسی طرح جن اغراض و مقاصد میں اسلام اور اہل اسلام کو فائدہ ہو وہ سب اس مصرف میں شامل اور داخل ہیں۔ واضح رہے اس مصرف میں صدقات وزکاۃ کا مال تب صرف کیا جائے جب اس کی شدید ضرورت ہو ورنہ اس سے صرف نظر کیا جائے جیسا کہ حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم نے تالیف قلوب کا مصرف ختم کر دیا تھا کیونکہ اس وقت اس کی ضرورت نہ تھی۔

⑤ غلام اور لونڈیاں آزاد کرنا: اس مصرف میں وہ لوگ شامل ہیں جو غلام مکاتب ہوں، یعنی جنھوں نے آزادی کے لیے اپنے مالکوں سے اپنی قیمت دینے کا معاہدہ کر لیا ہو لیکن ان کے پاس اس قیمت کی ادائیگی کے لیے تھوڑا مال ہو یا بالکل نہ ہو۔ ایسے شخص کو مالِ زکاۃ سے دیا جائے تاکہ وہ آزادی حاصل کر سکے۔

اسی طرح کوئی شخص مال زکاۃ میں سے کسی غلام کو اس کے مالک سے خرید کر آزاد کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی قیدی کے ذمے کوئی فدیہ یا دیت ہو تو وہ ادا کر کے اسے رہائی دلا سکتا ہے۔ یہ بھی گردن کو (قید سے) چھڑانا ہی ہے۔

⑥ غارم: غارم سے مراد مقروض ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:

① غارم لغیرہ: اس سے مراد وہ شخص ہے جس نے دیکھا کہ دو شخصوں یا دو قبیلوں یا دو بستیوں کے درمیان خون یا مال کے معاملے میں شدید نزاع پیدا ہو چکا ہے جو آگے چل کر سخت عداوت و دشمنی بلکہ لڑائی کا سبب بن سکتا ہے۔ اس شخص نے فریقین میں فتنے کو مٹانے اور مصالحت پیدا کرنے کی خاطر مداخلت کی جو عظیم نیکی کا کام ہے، اس کام میں اس نے مال کی ادائیگی کی ذمے داری قبول کر لی۔ ایسے شخص کی مالِ زکاۃ سے مدد کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس میں اس کی حوصلہ افزائی بھی ہے اور ایسے عظیم کام کرنے کی دوسروں کو ترغیب بھی ہے تاکہ فتنے اور فساد کا سد باب ہو۔ شارع علیہ السلام نے تو ایسے شخص کے لیے ایسی عظیم غرض کی خاطر کسی سے

سوال کرنے کی بھی اجازت دی ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا قبیصہ رضی اللہ عنہ سے، جب اس نے اپنی اس طرح کی ذمہ داری میں مقروض ہونے کا ذکر کیا، کہا:

«أَقِمْ حَتَّى تَأْتِيَنَا الصَّدَقَةُ فَنَأْمُرَ لَكَ بِهَا»

''آپ یہیں (مدینہ میں) قیام کریں، ہمارے پاس صدقہ و زکاۃ کا مال آئے گا تو ہم آپ کو دلوا دیں گے۔''[1]

② غارم لنفسہ: ایک شخص اپنے آپ کا فدیہ دے کر کفار کی ماتحتی سے نکلنا چاہے یا کسی شخص پر اس قدر قرضہ ہے جسے وہ ادا نہ کر سکتا ہو تو ایسے لوگوں کی زکاۃ کے مال سے مدد کی جائے تاکہ وہ اپنی مشکل سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

⑦ فی سبیل اللہ: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و قتال میں مصروف ہیں اور ان کو بیت المال سے کوئی تنخواہ وغیرہ نہیں ملتی، ایسے لوگوں کی بھی مالِ زکاۃ سے مدد کی جائے۔ واضح رہے قرآن مجید میں جہاں کلمہ ''فی سبیل اللہ'' مطلق طور پر استعمال ہوا ہے تو اس سے مراد جہاد و قتال ہی ہے،[2] چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾

''بے شک اللہ (تعالیٰ) ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ جہاد کرتے ہیں۔''[3]

نیز ارشاد باری ہے:

﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور تم لڑو اللہ کی راہ میں۔''[4]

⑧ مسافر: ایسا مسافر جس کا مال وخرچ دوران سفر ختم ہو جائے یا کسی وجہ سے ضائع یا گم ہو جائے۔ یہ مسافر اس قدر مالِ زکاۃ لے سکتا ہے جس سے وہ اپنی منزل تک اور پھر واپس گھر تک پہنچ جائے۔ مسافر کے حکم میں مہمان بھی داخل ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے ہے۔

اگر مسافر، مجاہد، مقروض یا مکاتب نے اپنی ضروریات کی خاطر مال زکاۃ لیا لیکن ضرورت پوری ہو جانے کے بعد کچھ مال بچ گیا تو ان پر لازم ہے کہ اسے اپنے پاس نہ رکھیں کیونکہ انھوں نے جو کچھ لیا تھا، اس کے مطلقاً مالک نہیں ہو سکتے تھے، وہ تو کسی سبب کی وجہ سے بقدر ضرورت مال کے مالک ہوئے، لہٰذا جب وہ سبب ختم ہو گیا تو استحقاق بھی نہ رہا۔

① صحیح مسلم، الزکاۃ، باب من تحل له المسألة، حدیث: 1044. ② تفصیل کے لیے دیکھیے أبحاث هيئة كبار العلماء: 61/1، ومسند أحمد: 56/3. ③ الصف 4:61. ④ البقرة 190:2.

▲ مذکورہ آٹھ مصارف میں سے کسی ایک مصرف میں زکاۃ کا سارا مال دیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾

''اور اگر تم اسے پوشیدہ پوشیدہ مسکینوں کو دے دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔''[1]

علاوہ ازیں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو جب آپ ﷺ نے یمن روانہ کیا تو فرمایا:

«أَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ»

''ان کے علم میں لاؤ کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے مالوں میں زکاۃ فرض کی ہے جو ان کے مال دار لوگوں سے وصول کی جائے گی اور ان کے نادار لوگوں پر خرچ کی جائے گی۔''[2]

گزشتہ آیت وروایت میں صرف ایک صنف (فقراء) کا ذکر ہوا ہے۔ اس بنا پر ایک صنف کو سارا مال زکاۃ دینا جائز ہے۔

▲ زکاۃ دینے والا اپنا سارا مالِ زکاۃ ایک شخص کو بھی دے سکتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے قبیلہ بنو زریق کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنا مال زکاۃ سلمہ بن صخر رضی اللہ عنہ کو دے دیں۔[3]

نیز رسول ﷺ نے سیدنا قبیصہ رضی اللہ عنہ کو کہا تھا:

«أَقِمْ حَتّٰى تَأْتِيَنَا الصَّدَقَةُ، فَنَأْمُرَ لَكَ بِهَا»

''ہمارے پاس (مدینہ میں) ٹھہرو، ہمارے پاس صدقہ وزکاۃ کا مال آئے گا تو ہم تجھے دلوا دیں گے۔''[4]

ان دونوں روایتوں سے واضح ہوا کہ مالِ زکاۃ آٹھ مصارف میں سے کسی ایک مصرف پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔

▲ محتاج اقرباء، یعنی ان نادار رشتے داروں کو مال زکاۃ دینا مستحب ہے جن کے نان ونفقہ کی ذمہ داری مالِ زکاۃ دینے والے پر نہ ہو۔ اس میں زیادہ قربی زیادہ حق رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«صَدَقَتُكَ . . . وَعَلٰى ذِي الْقُرْبَى الرَّحِمِ ثِنْتَانِ: صَدَقَةٌ وَّصِلَةٌ»

''تیرا رشتے دار کو صدقہ دینا، صدقہ ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔''[5]

---

① البقرة 2:271. ② صحيح البخاري، الزكاة، باب وجوب الزكاة، حديث: 1395، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدعاء إلى الشهادتين وشرائع الإسلام، حديث: 19. ③ سنن أبي داود، الطلاق، باب في الظهار، حديث: 2213، ومسند أحمد: 37/4. ④ صحيح مسلم، الزكاة، باب من تحل له المسألة، حديث: 1044. ⑤ [ضعيف] جامع الترمذي، الزكاة، باب ما جاء في الصدقة على ذي القرابة، حديث: 658، ومسند أحمد: 214/4 واللفظ له.

▲ بنو ہاشم (یعنی آل عباس، آل علی، آل جعفر، آل عقیل، آل حارث اور آل ابولہب) کو صدقہ و زکاۃ دینا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَنْبَغِي لِآلِ مُحَمَّدٍ إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ»

''بے شک صدقہ (زکاۃ) آل محمد ﷺ کے لیے جائز نہیں یہ لوگوں (کے مال) کا میل ہے۔''[1]

▲ کسی ایسی محتاج عورت کو زکاۃ دینا درست نہیں جو مال دار خاوند کے نکاح میں ہو اور وہ اسے نان ونفقہ دیتا ہو۔ اسی طرح کسی ایسے فقیر کو بھی مالِ زکاۃ نہ دیا جائے جس کا قریبی سر پرست مال دار ہو اور وہ اس پر خرچ کرتا ہو۔ یہ لوگ اخراجات میسر ہونے کی وجہ سے مال زکاۃ کے حقدار نہیں ہیں۔[2]

▲ اگر کسی شخص کے اعزہ واقارب کا نان ونفقہ اس کے ذمے ہو تو اسے ان کو مال زکاۃ دینا جائز نہیں ورنہ سمجھا جائے گا کہ یہ شخص اپنا اصل مال بچانا چاہتا ہے جو اس کے لائق نہیں، البتہ اگر اس پر کسی کے اخراجات لازم نہیں بلکہ وہ ہمدردی کی وجہ سے ادا کر رہا ہے تو وہ اس پر مالِ زکاۃ خرچ کر سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے ان یتیم بھتیجوں کے بارے میں سوال کیا جو اس کے زیر پرورش ہیں کہ کیا انھیں زکاۃ کا مال دے دے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں'' یعنی دے دو۔[3]

▲ اپنے باپ، دادا یا اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کو زکاۃ دینا جائز نہیں۔

▲ اپنی بیوی کو زکاۃ دینا جائز نہیں کیونکہ اس کا نان ونفقہ خاوند کے ذمے ہے۔ اگر کوئی بیوی کو زکاۃ دے گا تو سمجھا جائے گا کہ وہ اپنا مال بچا رہا ہے۔

▲ ہر مسلمان کو چاہیے کہ زکاۃ دینے سے پہلے دیکھ لے کہ وہ شخص واقعی مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو شخص آئے انھوں نے مالِ زکاۃ طلب کیا۔ آپ ﷺ نے ان کے وجود پر نگاہ دوڑائی تو انھیں باہمت اور طاقتور محسوس کیا تو فرمایا:

«إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا وَلَا حَظَّ فِيهَا لِغَنِيٍّ وَّلَا لِقَوِيٍّ مُّكْتَسِبٍ»

''اگر تم چاہو تو میں تمھیں مالِ زکاۃ دے دیتا ہوں لیکن یاد رکھو! مالدار اور کمانے والے طاقتور شخص کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔''[4]

---

① صحیح مسلم، الزکاۃ، باب ترك استعمال آل النبي ﷺ علی الصدقة، حدیث: 1072. ② یہ مسئلہ بلا دلیل ہے۔ ③ صحیح البخاري، الزکاۃ، باب الزکاۃ علی الزوج والأیتام في الحجر، حدیث: 1466. ④ سنن أبي داود، الزکاۃ، باب من یعطی من الصدقة وحد الغنی، حدیث: 1633، وسنن النسائي، الزکاۃ، باب مسألة القوي المکتسب، حدیث: 2599.

نفلی صدقات کا بیان

کتاب وسنت میں مال کی فرض زکاۃ کے ساتھ نفلی صدقات کی ترغیب بھی ہے اور اس کے لیے کوئی وقت بھی مقرر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مجید کی متعدد آیات میں اس طرف توجہ دلائی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ﴾

''اور مال سے محبت کے باوجود اُسے رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور گردنیں چھڑانے کے لیے خرچ کرے۔''[1]

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

''اور تم صدقہ کرو تو یہ تمھارے لیے بہت ہی بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔''[2]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾

''کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے، پھر اللہ اس کے لیے وہ مال بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے؟''[3]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيتَةَ السُّوءِ»

''صدقہ رب تعالیٰ کے غضب کو ختم کر دیتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔''[4]

صحیح حدیث میں ہے:

«سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ . . . ، رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ»

[1] البقرة 2:177. [2] البقرة 2:280. [3] البقرة 2:245. [4] [ضعيف] جامع الترمذي، الزكاة، باب ما جاء في فضل الصدقة، حديث: 664.

''جس روز کوئی سایہ نہ ہوگا اللہ تعالیٰ سات (قسم کے) افراد کو اپنے عرش کا سایہ نصب کرے گا (ان میں سے ایک شخص وہ ہوگا) جس نے اس قدر چھپا کر صدقہ دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہوا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔''[1]

اس مضمون کی اور بھی بہت سی روایات ہیں۔

▲ سراً (چھپا کر) صدقہ دینا افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾

''اور اگر تم اسے پوشیدہ پوشیدہ مسکینوں کو دے دو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صورت ریا کاری سے پاک ہے، البتہ اگر صدقے کے اظہار میں کوئی خاص مصلحت اور فائدہ ہو (مثلاً: کسی کا صدقہ دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس کی اقتدا کریں گے) تو کوئی مضائقہ نہیں۔

▲ صدقہ دل کی خوشی سے اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر دینا چاہیے، محتاج پر احسان جتلانا مقصد نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾

''اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا پہنچا کر برباد نہ کرو! جس طرح وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرے۔''[3]

▲ تندرستی اور صحت کی حالت میں صدقہ کرنا افضل ہے۔ آپ ﷺ سے سوال ہوا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

«أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيحٌ شَحِيحٌ وَّتَخْشَى الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنٰى»

''تو اس حالت میں صدقہ کرے کہ تو تندرست اور ضرورت مند ہو تنگ دستی کا خوف رکھتا ہو اور غنا کا متمنی ہو۔''[4]

▲ حرمین شریفین (مکہ و مدینہ) میں صدقہ دینا افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝﴾ ''پھر تم خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیروں کو بھی کھلاؤ۔''[5]

---

[1] صحيح البخاري، الزكاة، باب الصدقة باليمين، حديث: 1423، وصحيح مسلم، الزكاة، باب فضل إخفاء الصدقة، حديث: 1031. [2] البقرة 2:271. [3] البقرة 2:264. [4] صحيح البخاري، الزكاة باب فضل صدقة الشحيح الصحيح، حديث: 1419، وصحيح مسلم، الزكاة، باب بيان أن أفضل الصدقة......، حديث: 1032. [5] الحج 22:28.

▲ ماہ رمضان المبارک میں بھی صدقہ کرنا افضل ہے۔سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ أَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ ، وَكَانَ أَجْوَدَ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ حِينَ يَلْقَاهُ جِبْرِيلُ . . . فَإِذَا لَقِيَهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ أَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ الْمُرْسَلَةِ»

''رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے بڑھ کر سخی تھے۔اور آپ ﷺ (رمضان کے مہینے میں) اس وقت زیادہ سخاوت کرتے جب جبریل علیہ السلام ملاقات کے لیے آتے تھے۔جب جبریل علیہ السلام ملاقات کے لیے آتے تو آپ ﷺ کی سخاوت کی رفتار تیز ہوا سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔''[1]

▲ جب لوگوں کے اوقات وحالات مشکل ہوں تو اس وقت صدقہ کرنا سب سے بہتر ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝﴾

''یا بھوک والے دن کھانا کھلانا، کسی رشتہ دار یتیم کو، یا خاکسار مسکین کو۔''[2]

▲ دور والوں کی نسبت اقارب اور پڑوسیوں کو صدقہ دینا افضل ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی بہت سی آیات میں صدقات وخیرات میں اقرباء کا حق مقرر کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ ''اور رشتے داروں کا حق ادا کرتے رہو۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِينِ صَدَقَةٌ وَّهِيَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ : صَدَقَةٌ وَّصِلَةٌ»

''مسکین پر صدقہ صرف ایک صدقہ ہے اور رشتہ دار پر صدقہ کرنا دوہرا اجر ہے، صدقہ اور صلہ رحمی کا۔''[4]

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے:

«. . . أَجْرَانِ : أَجْرُ الْقَرَابَةِ وَأَجْرُ الصَّدَقَةِ»

''......رشتے دار کو صدقہ دینے سے دوگنا اجر ہے، قرابت کا اجر اور صدقے کا اجر۔''[5]

▲ مال میں زکاۃ کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں، مثلاً: اقرباء سے ہمدردی، بھائیوں کی صلہ رحمی کے لیے مال دینا،

① صحيح البخاري، الصوم، باب أجود ما كان النبي ﷺ يكون في رمضان، حديث : 1902. ② البلد 90:14-16. ③ بني إسرآءيل 17:26. ④ [ضعيف] جامع الترمذي، الزكاة، باب ما جاء في الصدقة على ذي القرابة، حديث : 658، وسنن النسائي، الزكاة، باب الصدقة على الأقارب، حديث : 2583 ومسند أحمد: 4/214. ⑤ صحيح البخاري، الزكاة، باب الزكاة على الزوج والأيتام في الحجر، حديث : 1466، وصحيح مسلم، الزكاة، باب فضل النفقة ◄◄

سائل کی مدد کرنا، کسی ضرورت مند کو اس کی مطلوبہ چیز عاریتاً دے دینا، کسی تنگ دست کو قرض کی وصولی میں مہلت دینا، کسی قرض خواہ کو قرض دینا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ۝﴾

''اوران کے اموال میں سوالی اور محروم (نہ مانگنے والے) شخص کا حق (حصہ) ہوتا تھا۔''[1]

- کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، مہمان کی مہمان نوازی کرنا، برہنہ شخص کو لباس دینا، پیاسے کو پلانا، یہ سارے کام واجب ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ قیدیوں کا فدیہ دے کر انھیں چھڑانا بھی مسلمانوں پر واجب ہے اگرچہ اس کے لیے ان کا تمام مال خرچ ہو جائے۔
- اگر مال کے حصول (یا اس کی تقسیم) کے وقت وہاں فقراء و مساکین موجود ہوں تو ان پر بھی صدقہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَءَاتُواْ حَقَّهُۥ يَوۡمَ حَصَادِهِۦ﴾ ''اوران (پھلوں) میں جو حق واجب ہے وہ ان کے کاٹنے کے دن دیا کرو۔''[2]

اور فرمایا:

﴿وَإِذَا حَضَرَ ٱلۡقِسۡمَةَ أُوْلُواْ ٱلۡقُرۡبَىٰ وَٱلۡيَتَٰمَىٰ وَٱلۡمَسَٰكِينُ فَٱرۡزُقُوهُم مِّنۡهُ وَقُولُواْ لَهُمۡ قَوۡلٗا مَّعۡرُوفٗا ۝﴾

''اور جب تقسیم کے وقت قرابت دار، یتیم اور مساکین آ جائیں تو تم اس میں سے تھوڑا بہت انھیں بھی دے دو اور ان سے نرمی سے بولو۔''[3]

میرے بھائی! یہ دین اسلام کے محاسن اور اس کی خوبیاں ہیں۔ اسلام، ہمدردی، رحمت، باہمی تعاون اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بھائی چارے کا نام ہے۔ یہ کس قدر اچھا دین ہے۔ اس کے احکام کتنے ہی محکم اور اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے دین میں بصیرت دے اور احکام شریعت کی پیروی و تمسک کی توفیق دے، بے شک وہی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

◄◄ والصدقة على الأقربين......، حديث: 1000. [1] الذّٰريٰت 19:51. [2] الأنعام 141:6. [3] النسآء 8:4.

باب 4

روزوں کے مسائل

رمضان کے روزوں کی فرضیت اور وقت کا بیان

ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھنا اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ فرائض میں سے ایک فریضہ ہے جو دین اسلام سے بدیہی اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے دلائل کے علاوہ اجماع بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر صوم (روزہ رکھنا) اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ (روزے) گنتی کے چند دن ہیں، پھر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر لے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو اس کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے، پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے (زیادہ) نیکی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے اور تمھارا روزہ رکھنا تمھارے لیے کہیں بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی واضح اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی دلیلیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔“[1]

[1] البقرۃ 2:183-185.

واضح رہے کہ آیت مذکورہ میں ﴿ كُتِبَ ﴾ کے معنی ہیں "فرض کیا گیا۔" اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ فَلْيَصُمْهُ ﴾ میں روزہ رکھنے کا حکم آیا ہے جو فرض ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔" اور آپ ﷺ نے ان میں ماہ رمضان المبارک کا روزہ رکھنا بھی ذکر فرمایا ہے۔[1]

الغرض رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت اور فضیلت میں بہت سی مشہور اور صحیح احادیث وارد ہیں۔ علاوہ ازیں تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں اور ان کا منکر کافر ہے۔

✍ روزے کی مشروعیت میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے نفس انسانی کو ردی خیالات اور رذیل اخلاق سے پاک کیا جائے اور اس کا تزکیہ اور تطہیر ہو۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے حصول سے انسانی بدن کے وہ رخنے تنگ ہو جاتے ہیں جن کے ذریعے سے شیطان انسان کے جسم میں سرایت کرتا ہے کیونکہ

«إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ»

"شیطان خون کی طرح انسان کے رگ و پے میں چلتا ہے۔"[2]

جب کوئی شخص خوب کھا پی لیتا ہے تو اس کا نفس خواہشات کی پیروی میں آگے بڑھنا چاہتا ہے جس سے انسان کی قوت ارادی کمزور پڑ جاتی ہے، عبادات میں رغبت کم ہو جاتی ہے جبکہ روزہ اس کے برعکس کیفیت پیدا کرتا ہے۔

روزہ دنیا کے حصول کی تمنا اور اس کی فاسد خواہشات کو کم کرتا ہے، آخرت کی طرف رغبت پیدا کرتا ہے، مساکین کے ساتھ ہمدردی اور ان کے دکھ درد کا احساس دلاتا ہے کیونکہ روزے دار روزے کی حالت میں بھوک اور پیاس کی تکالیف کا ذائقہ خود چکھتا ہے۔ یاد رہے عربی زبان میں روزے کو صَوم کہتے ہیں جس کے شرعی معنی ہیں "نیت کر کے کھانے، پینے اور جماع وغیرہ سے رکنا۔" نیز بے حیائی اور نافرمانی کی باتوں اور کاموں سے رکنا اس میں شامل ہے۔

✍ روزے کا وقت صبح صادق کے طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] صحيح البخاري، الإيمان، باب دعاؤكم إيمانكم......، حديث: 8، وصحيح مسلم، الإيمان، باب أركان الإسلام ودعائمه العظام، حديث: 16. [2] صحيح البخاري، الاعتكاف، باب هل يدرأ المعتكف عن نفسه؟ حديث: 2039.

﴿ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾

''اس لیے اب تم ان سے ہم بستری کر سکتے ہو اور اللہ نے تمھارے لیے جو لکھ رکھا ہے وہ تلاش کرو اور کھاؤ اور پیو حتیٰ کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے واضح (روشن) ہو جائے، پھر تم روزے کو رات تک پورا کرو۔''[1]

▲ جب ماہ رمضان کے شروع ہونے کا علم ہو جائے تو اس کے روزوں کی فرضیت شروع ہو جاتی ہے۔ ماہ رمضان کے شروع ہونے کا علم تین طریقوں سے ہوتا ہے۔

پہلا طریقہ رمضان المبارک کا چاند دیکھنے سے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ ''چنانچہ جو شخص اس مہینے کو پائے تو وہ اس کا روزہ رکھے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

صُومُوا لِرُؤْيَتِهٖ ''رمضان کا چاند دیکھ کر روزے رکھو۔''[3]

لہٰذا جس نے رمضان کا چاند دیکھ لیا اس پر روزہ رکھنا فرض ہے۔

دوسرا طریقہ چاند دیکھنے کی شہادت سے۔ جب رمضان المبارک کے چاند دیکھنے کی شہادت یا خبر مل جائے تو ماہ رمضان کا آغاز سمجھے۔ اس کے لیے ایک ایسے شخص کی گواہی کافی ہے جو عاقل، بالغ اور معتبر ہو۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے:

«تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ فَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ»

''لوگوں نے ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کی، چنانچہ مجھے نظر آ گیا تو میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو خبر دی کہ مجھے چاند نظر آ گیا ہے تو آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔''[4]

تیسرا طریقہ ماہ شعبان کے تیس دن مکمل ہونے سے۔ انتیس شعبان کا سورج غروب کے بعد مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہ آئے تو تیس دن مکمل ہونے پر ماہ رمضان کا آغاز ہو جائے گا کیونکہ اسلامی مہینہ تیس دنوں سے

[1] البقرة 2:187. [2] البقرة 2:185. [3] صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ:[إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا]، حديث: 1909. [4] سنن أبي داود، الصيام، باب في شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان، حديث: 2342.

زیادہ نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا الشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُونَ، فَلَا تَصُومُوا حَتَّى تَرَوْهُ، وَلَا تُفْطِرُوا حَتَّى تَرَوْهُ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوا لَهُ»

''مہینہ انتیس دنوں کا ہوتا ہے جب چاند دیکھو تب روزے رکھو اور چاند دیکھ کر روزے چھوڑ دو۔ اگر بادل وغیرہ ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کر لو۔''[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔[2]

- روزہ ہر اس شخص پر فرض ہے جو مسلمان، عاقل، بالغ ہو اور اس کی طاقت رکھتا ہو۔ کافر شخص پر روزہ نہ فرض ہے اور نہ اس کی طرف سے درست۔ اگر وہ دوران رمضان میں توبہ کر کے مسلمان ہو جائے تو باقی ایام کے روزے رکھے اور حالت کفر کے گزشتہ ایام کی قضا اس پر لازم نہیں۔
- چھوٹے بچے پر روزہ فرض نہیں۔ اگر سمجھ دار چھوٹا بچہ روزہ رکھے گا تو اس کے حق میں وہ روزہ نفلی ہوگا۔
- پاگل اور دیوانے شخص پر روزہ فرض نہیں۔ اگر وہ دیوانگی کی حالت میں روزہ رکھے گا تو درست نہ ہوگا کیونکہ اس میں نیت شامل نہیں ہوئی جو ضروری تھی۔
- عاجز، مریض اور مسافر پر عجز و سفر کی حالت میں روزہ رکھنا فرض نہیں۔ جب مرض اور سفر کی حالت ختم ہو جائے تو دونوں شخص چھوٹ جانے والے روزوں کی قضا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾

''تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اور دنوں میں گنتی کو پورا کر لے۔''[3]

- روزہ رکھنے کا حکم الٰہی مقیم، مسافر، تندرست، مریض اور پاکیزہ، حائضہ، نفاس والی عورت، بے ہوش شخص سب کو شامل ہے۔ ان سب پر فرض ہے کہ عذر ختم ہونے پر چھوٹ جانے والے روزے رکھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا خطاب ان لوگوں کو بھی شامل ہے۔ اور یہ خطاب اسی لیے ہے تاکہ وہ اس کی فرضیت کا عقیدہ رکھیں اور اس کی قضا یا ادا کرنے کا عزم بالجزم رکھیں۔ بعض لوگوں کو اس ماہ رمضان میں روزوں کو ادا کرنے کا حکم ہے اور وہ ایسے لوگ ہیں جو تندرست اور مقیم ہیں۔ اور بعض لوگوں کو قضا کا حکم ہے اور وہ حائضہ اور نفاس والی عورت یا وہ مریض شخص ہے جو روزے کو ادا کرنے پر قادر نہیں، البتہ قضا پر قادر ہے۔ بعض لوگوں کو ماہ رمضان میں روزہ رکھنے یا نہ رکھنے (دونوں)

[1] صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال......، حديث: 1080. [2] صحيح مسلم، الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال......، حديث: 1081. [3] البقرة 2:184.

کا اختیار ہے اور وہ مسافر شخص ہے یا ایسا مریض ہے جسے روزہ رکھنے میں مشقت تو ہے لیکن مرنے یا بیماری کے بڑھنے کا اسے ڈر نہیں۔

جس شخص نے کسی عذر کی بنا پر روزہ چھوڑ دیا، پھر دن کے کسی حصے میں اس کا عذر جاتا رہا، مثلاً: دن کے کسی حصے میں مسافر سفر سے واپس آ گیا یا حائضہ یا نفاس والی عورت دن کے کسی حصے میں پاک ہو گئی، کوئی کافر مسلمان ہو گیا، مجنون کو افاقہ ہوا یا بچہ بالغ ہو گیا تو یہ تمام لوگ دن کے بقیہ حصے میں کھانے پینے سے رکے رہیں اور روزے کی قضا بھی دیں۔[1] اسی طرح دن کے کسی حصے میں مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ آج تو رمضان المبارک کا پہلا روزہ ہے جو ہم نے (بوجہ مغالطہ) نہیں رکھا تو یہ لوگ بقیہ دن کھانے پینے سے رکے رہیں اور اس دن کی قضا ماہ رمضان المبارک کے بعد دیں۔

روزے کے ابتدائی اور آخری وقت کا بیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْـَٔـٰنَ بَٰشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾

''تمھارے لیے روزے کی رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ صحبت کرنا حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے جان لیا کہ بے شک تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے، چنانچہ اس نے تم پر توجہ فرمائی اور تمھیں معاف کر دیا، اس لیے اب تم ان سے ہم بستری کر سکتے ہو اور اللہ نے تمھارے لیے جو لکھ رکھا ہے وہ تلاش کرو اور کھاؤ اور پیو حتیٰ کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے واضح (روشن) ہو جائے، پھر تم روزے کو رات تک پورا کرو۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک رخصت دی ہے، یعنی اس میں ابتدائے اسلام کا وہ ایک مشکل حکم ختم کر دیا گیا جس کی بنا پر روزہ افطار کر لینے کے بعد عشاء کی نماز یا اس سے پہلے

[1] مؤلف ﷾ کا یہ موقف محل نظر ہے کیونکہ جن پر ابتدائے دن میں روزہ فرض نہیں ہوا ان پر دن کے آخری حصے میں امساک ضروری قرار دینا کیسے درست ہے جبکہ وہ قضا بھی ادا کریں گے (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: المحلی لابن حزم: 241/6)

[2] البقرۃ 187:2.

سونے تک کھانے پینے اور بیوی سے مباشرت کرنے کی اجازت تھی۔ سونے کے بعد یا عشاء کی نماز ادا کر لینے کے بعد ان میں سے کوئی کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر بات ہے یہ پابندی سخت تھی اور اس پر عمل مشکل تھا، لہٰذا مذکورہ بالا آیت نے یہ پابندی ختم کر دی، تب لوگ بہت خوش ہوئے کہ ان کے رب نے انھیں رات کے ہر حصے میں طلوع فجر تک کھانے پینے اور جماع کرنے کی اجازت دے دی ہے۔[1]

اس آیت کریمہ سے روزے کے ابتدائی اور آخری وقت کی حد بندی بھی واضح ہو گئی کہ روزے کا ابتدائی وقت صبح صادق کے طلوع ہونے سے ہے جبکہ آفتاب غروب ہونے پر اس کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَسَحَّرُوا فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً» ''سحری کھاؤ کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔''[2]

علاوہ ازیں سحری کھانے کی ترغیب میں بہت سی روایات آئی ہیں اگرچہ پانی کا گھونٹ ہی کیوں نہ ہو، نیز طلوع فجر کے قریب (تاخیر سے) سحری کھانا مستحب ہے۔

اگر کوئی شخص طلوع فجر سے پہلے بیدار ہوا ہو اور وہ جنبی ہو یا اس وقت حائضہ عورت حیض سے پاک ہوئی ہو تو وہ پہلے سحری کھائیں اور روزہ رکھیں اور پھر غسل کریں۔

▲ بعض لوگ رات کا اکثر حصہ جاگ کر گزارتے ہیں، پھر وہ طلوع فجر سے چند گھنٹے قبل سحری کھا کر سو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ایسا کر کے درج ذیل غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں:

① یہ لوگ وقت سے پہلے روزہ رکھ لیتے ہیں۔

② اکثر نماز فجر باجماعت ادا نہیں کرتے۔ اس طرح فرض نماز باجماعت چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں۔

③ کبھی یہ لوگ نماز فجر اس حد تک مؤخر کر دیتے ہیں کہ طلوع آفتاب کے بعد ادا کرتے ہیں جو گناہ اور جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝﴾

''چنانچہ ان نمازیوں کے لیے تباہی (اور ویل نامی جہنم کی جگہ) ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔''[3]

▲ فرض روزے کی نیت رات کے وقت کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی نے رات کو روزہ رکھنے کی نیت کر لی لیکن وہ

---

① تفسير ابن كثير، البقرة 187:2. ② صحيح البخاري، الصوم، باب بركة السحور من غير إيجاب، حديث: 1923.
③ الماعون 5,4:107.

طلوع آفتاب کے بعد بیدار ہوا تو وہ کھانے پینے سے رک جائے تو، ان شاء اللہ، اس کا روزہ درست ہوگا۔

▲ جب مشاہدے یا غالب گمان (اذان وغیرہ سننے) سے سورج غروب ہونے کا یقین ہو جائے تو روزہ کھولنے میں جلدی کرنا مستحب ہے۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَّا عَجَّلُوا الْفِطْرَ»

''جب تک لوگ روزہ جلدی افطار کرتے رہیں گے تب تک وہ خیر و بھلائی کے ساتھ رہیں گے۔''[1]

نیز فرمایا:

«قَالَ اللهُ تَعَالٰى : أَحَبُّ عِبَادِي إِلَيَّ أَعْجَلُهُمْ فِطْرًا»

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے محبوب ترین بندے وہ ہیں جو روزہ جلدی افطار کرتے ہیں۔''[2]

▲ مسنون یہ ہے کہ تازہ کھجوروں سے روزہ افطار کیا جائے۔ اگر وہ میسر نہ ہوں تو خشک کھجوریں ہو جائیں ورنہ پانی پر اکتفا کیا جائے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُفْطِرُ عَلٰى رُطَبَاتٍ قَبْلَ أَنْ يُّصَلِّيَ ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ رُطَبَاتٌ فَعَلٰى تَمَرَاتٍ ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ حَسَا حَسَوَاتٍ مِّنْ مَّاءٍ»

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز (مغرب) ادا کرنے سے پہلے تازہ کھجوروں سے روزہ افطار کرتے۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو خشک کھجوریں کھالیتے تھے وگرنہ پانی کے چند گھونٹوں پر اکتفا کر لیتے تھے۔''[3]

اگر کھجوریں نہ ملیں اور پانی بھی نہ ہو تو کھانے پینے کی جو چیز ملے اس سے افطار کر لیں۔

▲ یہاں ایک اہم بات کی طرف توجہ مبذول کروانا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ بعض لوگ افطاری کے لیے دسترخوان پر بیٹھ جاتے ہیں اور شام کا کھانا مکمل طور پر کھا کر اٹھتے ہیں، پھر وہ نماز مغرب باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد میں نہیں جاتے۔ اس طرح یہ لوگ باجماعت نماز چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف اجر عظیم سے محروم ہوتے ہیں بلکہ خود کو سزا کے لائق بناتے ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ روزہ افطار کریں اور ادائیگی نماز کے لیے مسجد کی طرف نکل جائیں اور نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھائیں۔

▲ روزہ افطار کرنے سے پہلے کوئی بھی پسندیدہ دعا کرنا مستحب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① صحيح البخاري، الصوم، باب تعجيل الإفطار، حديث: 1957. ② [ضعيف] جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في تعجيل الإفطار، حديث: 700. ③ سنن أبي داود، الصيام، باب ما يفطر عليه، حديث: 2356، وجامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء مايستحب عليه الإفطار، حديث: 696، ومسند أحمد: 164/3.

«إِنَّ لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرِهِ لَدَعْوَةً مَّا تُرَدُّ» ''افطاری کے وقت روزے دار کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔''[1]

علاوہ ازیں یہ مسنون دعا بھی پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ! لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ»

''اے اللہ! میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے رزق کے ساتھ افطار کیا۔''[2]

جب آپ ﷺ روزہ افطار کر لیتے تو یہ کلمات کہتے:

«ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللهُ»

''پیاس ختم ہوگئی، آنتیں تر ہوگئیں اور، ان شاء اللہ، اجر محفوظ ہوگیا۔''[3]

ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ روزہ رکھنے اور افطار کرنے کے مسائل سیکھے تاکہ وہ مسنون طریقے سے روزہ رکھ سکے، اس کا روزہ درست ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں عمل مقبول ہو۔ یہ چیز نہایت اہم کاموں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْأٰخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا﴾

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (ﷺ) میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ کو یاد کرتا ہے۔''[4]

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا جاننا ہر مسلمان شخص پر ضروری ہے تاکہ وہ ان سے اجتناب کرے۔ وہ اشیاء درج ذیل ہیں:

جماع کرنا: اگر روزے کے دوران میں اپنی بیوی سے جماع کر لے تو اس کا روزہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس دن کی قضا دینا پڑتی ہے جس دن جماع کیا گیا۔ علاوہ ازیں اس گناہ کا اس پر کفارہ بھی ہے کہ وہ ایک گردن (غلام یا لونڈی) آزاد کرے۔ اگر یہ کام نہ کر سکے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ اگر کسی عذر کی وجہ سے یہ بھی نہ کر سکے تو ساٹھ مساکین کو مناسب (علاقے میں رائج) کھانا کھلائے یا ہر مسکین کو نصف صاع (ایک کلو 50 گرام) کھانا دے۔

① [ضعيف] سنن ابن ماجه، الصيام، باب في الصائم لا ترد دعوته، حديث: 1753، وإرواء الغليل: 4/41، حديث: 921. ② [ضعيف] سنن أبي داود، الصيام، باب القول عند الإفطار، حديث: 2358. ③ سنن أبي داود، الصيام، باب القول عند الإفطار، حديث: 2357. ④ الأحزاب 33:21.

منی کا اخراج بوسہ لینے، چھونے، بار بار دیکھنے یا مشت زنی کے سبب اگر منی خارج ہوگئی تو اس کا روزہ ضائع اور باطل ہو جائے گا۔ جس روز اس نے یہ کام کیا اس دن کی قضا دے گا، البتہ اس پر کفارہ نہیں کیونکہ کفارہ جماع کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔[1]

اگر نیند کی حالت میں احتلام ہوگیا تو اس کے ذمے نہ قضا ہے اور نہ کفارہ کیونکہ اس میں اس کا اختیار شامل نہ تھا، البتہ اس پر غسل کرنا فرض ہے۔

قصداً کھانا پینا قصداً، یعنی ارادہ کر کے کھانے پینے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾

''تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے، پھر رات تک روزے کو پورا کرو۔''[2]

البتہ اگر کسی شخص نے بھول کر کچھ کھا پی لیا تو اس کا روزہ متاثر نہ ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے:

«إِذَا نَسِيَ فَأَكَلَ وَشَرِبَ فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللهُ وَسَقَاهُ»

''جس کسی نے بھول کر کچھ کھا پی لیا تو وہ اپنا روزہ (جاری رکھ کر) مکمل کرے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے۔''[3]

ناک کے ذریعے سے پیٹ میں پانی وغیرہ پہنچانے (سعوط) سے بھی روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ رگ کے ذریعے سے پیٹ میں غذا پہنچانے (ڈرپ لگوانے) سے یا جسم میں خون پہنچانے سے بھی روزہ فاسد اور ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح غذا کے لیے ٹیکہ بھی روزے کو ختم کر دیتا ہے۔ بیماری وغیرہ کے لیے ٹیکہ لگوانے سے اجتناب کرنا بہتر ہے تاکہ روزہ شک وشبے سے بھی محفوظ رہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلٰى مَا لَا يَرِيبُكَ»

''جس میں تجھے تردد اور شک ہو اسے چھوڑ کر وہ صورت اختیار کر جس میں تجھے تردد اور شک نہ ہو۔''[4]

---

[1] دیکھیے: المغني والشرح الكبير: 49/3. [2] البقرة 2:187. [3] صحيح البخاري، الصوم، باب الصائم إذا أكل أو شرب ناسيًا، حديث: 1933، وصحيح مسلم، الصيام، باب أكل الناسي وشربه وجماعه لا يفطر، حديث: 1155. [4] صحيح البخاري، البيوع، باب تفسير المشبهات، قبل حديث: 2052 معلقًا، وجامع الترمذي، صفة القيامة، باب حديث اعقلها وتوكل، حديث: 2518.

سینگی لگوانا اور فصد کروانا: سینگی لگوانے، فصد کروانے یا کسی مریض کو دینے کے لیے خون نکلوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، البتہ اگر تجزیہ یا تجربہ کے لیے تھوڑا سا خون نکالا گیا تو روزے پر اس کا اثر نہ ہوگا اور روزہ قائم رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی ایسی صورت میں بدن سے خون نکل آیا جس سے روزے دار کا اپنا اختیار نہیں بلکہ وہ مجبور ہے تو اس سے بھی روزہ نہ ٹوٹے گا، مثلاً: نکسیر کا پھوٹنا، کسی زخم سے خون کا نکل آنا یا دانت نکلوانے سے خون کا نکلنا وغیرہ۔

قے آنا: اگر قصداً اور ارادۃً قے لانے کی صورت پیدا کی گئی تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، البتہ اگر خود بخود قے آ گئی تو روزہ قائم رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ فَلَيْسَ عَلَيْهِ قَضَاءٌ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ عَمَدًا، فَلْيَقْضِ»

''جسے خود بخود قے آ گئی اس پر روزے کی قضا نہیں اور جس نے قصداً قے کی تو وہ قضا دے۔''[1]

- روزے دار کو روزے کی حفاظت کرتے ہوئے سرمہ ڈالنے اور آنکھوں میں دوائی کے قطرے وغیرہ ڈالنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔[2]
- وضو کرتے ہوئے کلی کرتے یا ناک میں پانی چڑھاتے وقت مبالغہ نہ کیا جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«وَبَالِغْ فِي الْاِسْتِنْشَاقِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِمًا»

''(وضو کرتے وقت) ناک میں پانی خوب چڑھاؤ مگر جب تم روزے کی حالت میں ہو (تو ایسا مت کرو۔)''[3]

اس کی وجہ یہ ہے کہ ناک کے ذریعے سے پانی پیٹ تک پہنچ جاتا ہے۔

- دن کے شروع یا آخر میں مسواک کرنے سے روزے پر کچھ اثر نہیں پڑتا بلکہ روزے دار لیے مسواک کرنا مستحب اور پسندیدہ ہے۔
- اگر گرد و غبار یا مکھی وغیرہ اڑ کر حلق تک پہنچ جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔
- روزے دار کو جھوٹ، غیبت، چغلی، گالی گلوچ سے بہر صورت بچنا چاہیے۔ اگر اس سے کوئی شخص گالی گلوچ

---

① سنن أبي داود، الصيام، باب الصائم يستقيء عامدًا، حديث: 2380، وجامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء فيمن استقاء عمداً، حديث: 720 واللفظ له.

② مصنف نے اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی جبکہ صحیح یہی ہے کہ سرمہ، دوائی ڈالنا جائز ہے۔ (صارم)

③ سنن أبي داود، الطهارة، باب في الاستنثار، حديث: 142، وجامع الترمذي، الصوم، باب ما جاء في كراهية مبالغة الاستنشاق للصائم، حديث: 788.

کرے تب بھی وہ (دومرتبہ) کہہ دے: إِنِّي صَائِمٌ ''میں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔''[1]

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں کھانا پینا چھوڑ دینا آسان ہوتا ہے لیکن ان کے لیے، جن برے، نکمے اور غلیظ اقوال و افعال کے وہ عادی ہوتے ہیں، ان کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ بنا بریں بعض سلف صالحین کا قول ہے: ''آسان ترین روزہ کھانے پینے کا چھوڑ دینا ہے۔''

ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرے۔ اپنے رب کی عظمت و بزرگی کا خیال رکھے اور یہ ایمان و یقین رکھے کہ وہ ہر وقت اور ہر حال میں اپنے مالک کی نگاہ میں ہے، نیز روزے کو فاسد اور ضائع کرنے والی اور اس کے ثواب میں کمی کرنے والی چیزوں سے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کرے تاکہ اس کا روزہ صحیح اور مقبول ہو۔

▲ روزے دار کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور قرآن مجید کی تلاوت میں خود کو مشغول رکھے۔ کثرت سے نوافل پڑھے۔ سلف صالحین کا یہ انداز تھا کہ جب وہ روزہ رکھتے تو زیادہ سے زیادہ وقت مساجد میں گزارتے اور کہتے: اب ہم اپنے روزوں کی حفاظت کریں گے اور کسی کی غیبت نہ کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ»

''جس روزے دار نے حالت روزہ میں جھوٹی باتیں کرنی اور ان پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے سے کوئی سروکار نہیں۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ نہ رکھنے کی حالت میں جائز خواہشات کو چھوڑ دینے سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب اس وقت ہوتا ہے جب انسان ان چیزوں کو چھوڑتا ہے جو اس کے رب نے ہر حال میں حرام کی ہیں، مثلاً: جھوٹ، ظلم اور لوگوں کے خون، مال اور عزت میں ظلم و زیادتی کرنا وغیرہ۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصَّائِمُ فِي عِبَادَةٍ، مَا لَمْ يَغْتَبْ مُسْلِمًا أَوْ يُؤْذِهِ»

''روزہ دار حالت عبادت میں ہوتا ہے جب تک وہ کسی مسلمان کی غیبت نہیں کرتا یا اسے تکلیف نہیں

---

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب فضل الصوم، حديث: 1894. [2] صحيح البخاري، الصوم، باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم، حديث: 1903.

دیتا۔''[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا صَامَ مَنْ ظَلَّ يَأْكُلُ لُحُومَ النَّاسِ»

''اس نے روزہ نہیں رکھا جو (غیبت کرکے) لوگوں کا گوشت کھاتا ہے۔''[2]

لہٰذا جب روزے دار کے لیے ضروری ہے کہ روزے کی حالت میں ان اشیاء سے اجتناب کرے جو روزہ نہ رکھنے کی حالت میں جائز ہیں، (مثلاً: کھانا، پینا یا جماع کرنا) تو جو اشیاء ہر حال میں حرام ہیں انھیں ترک کرنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہے تاکہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہو جو روزے کا پورا پورا حق ادا کرنے والے ہیں۔

روزے کی قضا کے احکام

جس شخص نے شرعی عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھا یا توڑ دیا یا کسی حرام کام، مثلاً: جماع وغیرہ کے ارتکاب سے روزہ فاسد اور ضائع کرلیا تو اس پر قضا لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ ''......اور دنوں میں گنتی کو پورا کرلے۔''[3]

قضا کی ادائیگی میں جلدی کرنا مستحب ہے تاکہ ذمے داری ختم ہو جائے، نیز قضا میں تسلسل قائم کرنا مستحب ہے کیونکہ قضا ادا کے مطابق ہوتی ہے۔ قضا کو فوراً ادا کرے، اگر فوراً ادا نہیں کرسکا تو آئندہ ادا کرنے کا عزم بالجزم ہونا چاہیے۔ اگر پھر بھی کسی وجہ سے تاخیر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ روزے کی ادائیگی کے وقت میں خاصی وسعت ہے۔ جب واجب کی ادائیگی کے وقت میں وسعت و گنجائش ہو تو اس میں عزم کے باوجود تاخیر کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اس کی قضا متفرق طور پر دینا بھی جائز ہے، البتہ اگر کسی نے سارا سال روزوں کی قضا نہ دی حتی کہ ماہ شعبان کے صرف اس قدر دن رہ گئے جس قدر اس پر قضا کے روزے تھے تو اب چونکہ وقت نہایت تنگ ہے، اس لیے اب تسلسل سے قضا دینا اس پر بالاتفاق لازم ہے۔ دوسرے رمضان کے بعد قضا جائز نہیں الا یہ کہ کوئی خاص شرعی عذر ہو۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

«كَانَ يَكُونُ عَلَيَّ الصَّوْمُ مِنْ رَمَضَانَ، فَمَا أَسْتَطِيعُ أَنْ أَقْضِيَهُ إِلَّا فِي شَعْبَانَ»

[1] [ضعيف] مسند الفردوس للديلمي: 411/2، حديث :3825، و ضعيف الجامع الصغير وزيادته، حديث :3528.

[2] [ضعيف] ضعيف الجامع الصغير و زيادته، حديث :5083، والسلسلة الضعيفة، حديث :4451. [3] البقرة 184:2.

''میرے ذمے رمضان کے روزوں کی قضا ہوتی تو میں شعبان سے پہلے قضا نہیں دے سکتی تھی۔''[1]

صحیح مسلم کی روایت میں راوی کے وضاحتی الفاظ یہ ہیں:

«وَذٰلِكَ لِمَكَانِ رَسُولِ اللهِ ﷺ» ''اور یہ رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ہوتا تھا۔''[2]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ روزے کی قضا میں وقت کی خاصی وسعت ہے۔ آئندہ رمضان شروع ہونے سے پہلے پہلے قضا دی جاسکتی ہے۔

▲ اگر قضا میں اس قدر تاخیر ہوگئی کہ اگلا ماہ رمضان بھی شروع ہوگیا تو وہ شخص موجودہ رمضان کے روزے رکھے جبکہ گزشتہ رمضان کے چھوٹے ہوئے روزے بعد میں رکھے۔ اگر یہ تاخیر کسی شرعی عذر کی وجہ سے ہوئی ہے تو صرف روزوں کی قضا دے اور اگر کوئی شرعی عذر نہ تھا تو وہ قضا بھی دے اور بطور کفارہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔[3]

▲ اگر کسی شخص کے ذمے رمضان کے روزوں کی قضا تھی لیکن اگلا رمضان آنے سے پہلے ہی وہ فوت ہوگیا تو اس کے ذمے کچھ نہیں کیونکہ جس وقت وہ فوت ہوا اس وقت قضا میں تاخیر جائز تھی۔ اگر وہ رمضان جدید کے بعد فوت ہوگیا تو اگر قضا کی تاخیر کا سبب کوئی شرعی عذر (مرض یا سفر) تھا تو اس کے ذمے بھی کوئی روزہ نہیں۔ اور اگر بغیر عذر کے رمضان جدید آگیا تو اس کے ترکہ سے ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کا کھانا بطور کفارہ لازم ہے۔

▲ اگر کوئی شخص مرگیا اور اس کے ذمے کسی کفارے کے روزے تھے، مثلاً: ظہار کے کفارہ کے واجب روزے تھے یا حج تمتع میں قربانی نہ کرنے کی وجہ سے روزے واجب تھے تو میت کی طرف سے روزے نہ رکھے جائیں بلکہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا جائے جو اس کے ترکہ سے ادا ہو کیونکہ یہ ایسے روزے تھے جن کی زندگی میں نیابت نہیں ہوسکتی تھی، لہٰذا موت کے بعد بھی نیابت درست نہیں۔ یہ قول اکثر اہل علم کا ہے۔

▲ اگر کوئی شخص فوت ہوگیا اور اس کے ذمہ نذر کے روزے تھے تو مستحب یہ ہے کہ اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے کیونکہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے:

«جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّ أُمِّي مَاتَتْ وَعَلَيْهَا صَوْمُ نَذْرٍ، أَفَأَصُومُ عَنْهَا؟ قَالَ: أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلٰى أُمِّكِ دَيْنٌ فَقَضَيْتِيهِ أَكَانَ

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب متى يقضى قضاء رمضان، حديث : 1950، وصحيح مسلم، الصيام، باب جواز تأخير قضاء رمضان ما لم يجئ رمضان آخر......، حديث : 1146. [2] صحيح مسلم، الصيام، باب جواز تأخير قضاء رمضان......، حديث:1146. [3] المغني والشرح الكبير : 86,85/4. یہ مسئلہ بلا دلیل ہے، قضا لازم ہے مزید بطور کفارہ مساکین کو کھانا دینا لازم نہیں۔ دیکھیے اللباب: 294. (ع۔و)

يُؤَدِّي ذٰلِكِ عَنْهَا؟ قَالَتْ: نَعَمْ، قَالَ: فَصُومِي عَنْ أُمِّكِ»

''نبی ﷺ کی خدمت میں ایک عورت آئی اور کہا: میری ماں فوت ہوگئی ہے اور اس کے ذمے نذر کے روزے تھے تو کیا میں اس کی طرف سے وہ روزے رکھوں؟ آپ نے فرمایا: اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو اس کو ادا کر دیتی تو وہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟ تو اس عورت نے کہا: ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھ۔''[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میت کی طرف سے نذر کے روزے رکھے جائیں۔ اصلی فرض روزے نہ رکھے جائیں یہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا مسلک ہے۔ حضرت ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے۔ علاوہ ازیں دلیل و قیاس بھی اس کا مقتضی ہے کیونکہ شریعت کے کسی حکم سے نذر واجب نہ تھی بلکہ بندے نے خود ہی اپنے آپ پر ضروری قرار دے لی جو فرض کا درجہ پا گئی۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے نذر کو قرض کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور روزے کو اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے فرض قرار دیا ہے جو اسلام کا ایک رکن ہے۔ اس میں کسی حال میں بھی نیابت کا دخل نہیں جس طرح کلمۂ شہادت اور نماز میں نیابت درست نہیں بلکہ ان سے مقصود بندے کا خود اطاعت کرنا اور وہ حق عبادت ادا کرنا ہے جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا اور اس کا حکم دیا ہے، لہٰذا اسے کسی دوسرے کی طرف سے نہ ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی طرف سے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے یہ امام احمد اور اسحاق رحمہما اللہ وغیرہ کا مسلک ہے اور یہی درست ہے۔ نذر کا ذمہ اس نے خود اٹھایا ہے، لہٰذا موت کے بعد اسے ولی ادا کرے، البتہ رمضان المبارک کے روزے عاجز اور معذور شخص پر فرض نہیں بلکہ عاجز کے لیے ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔ باقی رہی روزوں کی قضا تو وہ صرف قدرت والے شخص پر ہے عاجز پر نہیں، اس لیے عاجز کی موت کے بعد ولی پر قضا بھی نہیں، ہاں! نذر وغیرہ کے روزے احادیث صحیحہ کی روشنی میں بالاتفاق میت کی طرف سے رکھے جائیں۔''

بڑھاپے اور بیماری میں روزے کے احکام

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ماہ رمضان کے روزے فرض قرار دیے ہیں جو حضرات معذور نہیں وہ انھیں وقت پر

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب من مات وعليه صوم، حديث: 1953، وصحيح مسلم، الصيام، باب قضاء الصوم عن الميت، حديث: 1148 واللفظ له.

ادا کریں جبکہ معذور افراد قضا دیں، بشرطیکہ دوسرے دنوں میں قضا کی طاقت رکھتے ہوں۔ یہاں ایک تیسری قسم کے افراد بھی ہیں جو ادا کی طاقت رکھتے ہیں نہ قضا کی۔ اس قسم میں وہ شخص داخل ہے جو بہت زیادہ بوڑھا ہو یا وہ مریض جس کے تندرست ہونے کی کوئی امید نہ ہو۔ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ تخفیف فرمائی ہے کہ وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''[1]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾

''اور اس کی طاقت رکھنے والے فدیہ میں ایک مسکین کو کھانا دیں۔''[2]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''اس آیت کا حکم اس بوڑھے مرد اور عورت کے لیے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔''[3]

لیکن جس نے کسی عارضی عذر کی بنا پر روزہ چھوڑا جیسے مسافر یا وہ مریض جس کے تندرست ہونے کی کوئی امید ہو یا حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت جسے اپنے وجود یا اپنے بچے کی کمزوری کا خوف ہو یا حیض ونفاس والی عورت ہو، ان تمام پر روزے کی قضا لازم ہے۔ جس قدر ان کے روزے چھوٹ جائیں گے اسی قدر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر قضا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾

''ہاں جو بیمار ہو یا مسافر ہو اسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنی چاہیے۔''[4]

▲ وہ مریض جسے روزہ رکھنے سے تکلیف ہو یا وہ مسافر، جس سفر میں اس کے لیے قصر کرنا جائز ہو، ان کا روزہ چھوڑنا مسنون عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھی کے حق میں فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾

''ہاں جو بیمار ہو یا مسافر ہو تو اسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنی چاہیے۔''[5]

یعنی وہ روزہ چھوڑ دے اور جتنے روزے چھوڑے ہیں ان کی گنتی کے برابر بعد میں روزے رکھ لے، جسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

① البقرة 286:2. ② البقرة 184:2. ③ صحيح البخاري، التفسير، باب قوله تعالى:﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ......﴾، حديث: 4505. ④ البقرة 185:2. ⑤ البقرة 185:2.

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ ”اللہ کا ارادہ تمھارے ساتھ آسانی کا ہے، سختی کا نہیں۔“[1]

جب نبیٔ کریم ﷺ کو دو کاموں میں سے کسی ایک کے کرنے کا اختیار ملتا تو آپ ﷺ آسان کام اختیار کرتے۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے:

«لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ» ”سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں۔“[2]

▲ اگر مسافر یا مریض، جس کے لیے روزہ رکھنا مشکل ہو، نے روزہ رکھ لیا تو کراہت کے باوجود ان کا روزہ درست ہوگا، البتہ حائضہ اور نفاس والی عورت کے لیے روزہ رکھنا حرام ہے۔

▲ بچے کو دودھ پلانے والی اور حاملہ جتنے روزے چھوڑے گی، دوسرے دنوں میں ان کی قضا دے۔ جس نے بچے کی پرورش کے پیش نظر روزے چھوڑ دیے تو وہ روزوں کی قضا کے ساتھ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کے کھانے کا کفارہ بھی دے۔[3]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا: ”سیدنا ابن عباس وغیرہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا فتویٰ ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی دونوں عورتیں اپنے بچوں کے بارے میں اگر کوئی خوف و خطرہ محسوس کریں تو وہ روزے چھوڑ دیں اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ ان کا کھانا کھلانا روزوں کی ادا کے طور پر ہوگا، نیز ان پر چھوٹ جانے والے روزوں کی قضا بھی لازم ہے۔“[4]

▲ کسی شخص کو ہلاکت اور موت سے بچانے کی خاطر روزہ توڑا جا سکتا ہے، مثلاً: اگر کوئی پانی میں ڈوب رہا ہے تو اس کو بچانے کی خاطر نہر، دریا وغیرہ میں کود جانا۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”روزہ چھوڑنے کے چار اسباب ہیں: ① سفر ② مرض ③ حیض یا ④ روزہ رکھنے سے کسی کی ہلاکت کا خوف ہو جیسے دودھ پلانے والی یا حاملہ عورت یا غرق ہونے والے کو بچانا۔“

▲ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ فرض روزے کی نیت رات ہی کو کرے، مثلاً: رمضان المبارک کا روزہ، کفارے کا روزہ، نذر کا روزہ وغیرہ۔ نیت کا طریقہ یہ ہے کہ دل میں ارادہ کرے کہ وہ صبح رمضان کا یا اس کی قضا کا روزہ رکھے گا یا صبح کو نذر یا کفارے کا روزہ رکھے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

① البقرة 2:185. ② صحيح البخاري، الصوم، باب قول النبي ﷺ لمن ظلل عليه ......، حديث: 1946، وصحيح مسلم، الصيام، باب جواز الصوم والفطر في شهر رمضان للمسافر ......، حديث: 1115.

③ مؤلف ﷾ کا یہ مسئلہ بلا دلیل ہے، حاملہ اور مرضعہ دوسرے دنوں میں ان روزوں کی قضا دے۔ اگر اس کی طاقت نہیں رکھتی تو پھر ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ دیکھیے اللباب، ص: 285. (ع۔و)

④ إعلام الموقعين: 3/190.

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِیءٍ مَّا نَوٰی»

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ ملے گا۔''[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ لَّمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهُ»

''جس شخص نے طلوع فجر سے پہلے پہلے رات کو روزہ رکھنے کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں۔''[2]

اس روایت کی روشنی میں فرض روزے کی نیت رات کو کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی دن چڑھے بیدار ہوا اور اس نے طلوع فجر کے بعد کچھ نہ کھایا پیا، پھر اس نے روزے کی نیت کر لی تو اس کا روزہ نہ ہوگا، البتہ نفلی روزہ اس طرح رکھا جا سکتا ہے۔

▲ نفلی روزے کی نیت دن کو ہو سکتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ایک روز میرے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور پوچھا:

«هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟ فَقُلْنَا: لَا! قَالَ: فَإِنِّي إِذَنْ صَائِمٌ»

''کھانے کے لیے کچھ ہے؟ میں نے کہا: نہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تب میرا روزہ ہے۔''[3]

اس روایت سے ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے روزے کی حالت میں نہ تھے تبھی تو کھانا طلب کیا۔ اور اس حدیث میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ نفلی روزے کی نیت میں صبح تک تاخیر کرنا جائز ہے، اسی طرح یہ بھی واضح ہوا کہ عدم جواز کی روایات فرض روزے کے ساتھ خاص ہیں۔

▲ نفلی روزے کی نیت دن کے وقت تب درست ہے جب نیت سے پہلے روزے کے منافی کام، یعنی فجر ثانی کے بعد کچھ کھایا پیا وغیرہ نہ ہو ورنہ روزہ نہ ہوگا۔

---

[1] صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي......، حديث: 1، وصحيح مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ: إنما الأعمال بالنية......، حديث: 1907. [2] السنن الكبرى للبيهقي: 203/4، وسنن النسائي، الصيام، ذكر اختلاف الناقلين لخبر حفصة في ذلك، حديث: 2333 عن حفصة رضي الله عنها. [3] صحيح مسلم، الصيام، باب جواز صوم النافلة بنية من النهار قبل الزوال......، حديث: 1154.

باب 5

حج کے مسائل

حج کی فرضیت واہمیت

حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ ﴾

''اللہ نے ان لوگوں پر جو اس کی طرف راہ پا سکتے ہوں اس گھر کا حج فرض کر دیا ہے اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ (اس سے بلکہ) تمام دنیا سے بے پرواہ ہے۔''[1]

اس آیت کریمہ میں کلمہ ﴿عَلَى﴾ سے حج کی فرضیت واضح ہوتی ہے، نیز آیت کے آخری کلمات: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ﴾ میں تارک حج کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بھی حج کی فرضیت اور اس کی تاکید خوب واضح ہوتی ہے...... بنابریں جو شخص حج کی فرضیت کا عقیدہ نہیں رکھتا وہ بالا جماع کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا:

﴿ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ ''اور لوگوں میں حج کی منادی کر دے۔''[2]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ مَّلَكَ زَادًا وَّرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلٰى بَيْتِ اللهِ وَلَمْ يَحُجَّ، فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَّمُوتَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا»

''جس شخص کے پاس بیت اللہ تک پہنچانے کے لیے زاد راہ اور سواری ہو لیکن اس نے حج نہ کیا تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ یہودی یا عیسائی ہو کر مر جائے۔''[3]

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ، وَحَجِّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا»

[1] آل عمران 3:97. [2] الحج 22:27. [3] [ضعيف] جامع الترمذي، الحج، باب ما جاء من التغليظ في ترك الحج، حديث: 812.

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: کلمۂ شہادت کہنا، نماز قائم کرنا، زکاۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا[1] اور بیت اللہ کا حج کرنا بشرطیکہ وہاں جانے کی طاقت ہو۔''[2]

واضح رہے کہ بیت اللہ تک جانے کی طاقت سے مراد بیت اللہ تک پہنچنے اور واپس اپنے گھر آنے تک خرچ اور سواری کے بندوبست کا ہونا ہے۔

◄ حج کی مشروعیت میں حکمت، اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کی ہے:

﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ○ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ○﴾

''تاکہ وہ اپنے منافع کے لیے حاضر ہوں اور معلوم ایام میں (ذبح کرتے وقت) ان چوپائے مویشیوں پر اللہ کا نام پڑھیں جو اللہ نے انھیں دیے ہیں' پھر تم (خود بھی) ان کا گوشت کھاؤ اور کھلاؤ بھوکے فقیر کو۔ پھر چاہیے کہ وہ اپنا میل کچیل دور کریں اور چاہیے کہ اپنی نذریں پوری کریں اور چاہیے کہ قدیم گھر (بیت اللہ) کا طواف کریں۔''[3]

یاد رہے کہ اس آیت میں جن منافع کا ذکر ہے وہ بندوں کو حاصل ہوتے ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان چیزوں سے مستغنی ہے۔

◄ حج کی فرضیت کو نماز، زکاۃ اور روزے سے مؤخر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ نماز دین کا ستون ہے اور وہ ایک دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی ہے، پھر نماز کے بعد زکاۃ کی فرضیت ہے کیونکہ متعدد مقامات پر نماز اور زکاۃ کو ملا کر بیان کیا گیا ہے، پھر روزہ ہے جو ہر سال ہی آ جاتا ہے لیکن حج زندگی میں صرف ایک بار فرض ہے اور وہ بھی تب جب طاقت ہو۔

◄ جمہور علماء کے قول کے مطابق دین اسلام میں حج نو ہجری کو فرض ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے سن دس ہجری میں ایک ہی حج (حجۃ الوداع) کیا تھا جبکہ عمرے چار کیے تھے۔

◄ حج اور عمرہ کرنے کا مقصد ان مقامات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے جہاں اس کی عبادت کرنے کا حکم خاص

[1] صحيح البخاري، الإيمان، باب دعاؤكم إيمانكم......، حديث :8 ، وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان أركان الإسلام ودعائمه العظام، حديث : 16 . [2] صحيح مسلم، الإيمان، باب السؤال عن أركان الإسلام، حديث : 12، وسنن النسائي، الصيام، باب وجوب الصيام، حديث :2093 . [3] الحج 22:28،29.

ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ وَبَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَرَمْيُ الْجِمَارِ لِإِقَامَةِ ذِكْرِ اللهِ»

''بیت اللہ کا طواف، صفا ومروہ کی سعی اور جمروں کی رمی اللہ کے ذکر کی صورتیں ہیں۔''[1]

اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ حج فرض ہے اور دین اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ حج کی طاقت رکھنے والے شخص پر زندگی میں ایک بار حج کرنا فرض ہے۔ اور ہر سال حج مسلمانوں پر مجموعی طور پر فرض کفایہ ہے، البتہ ہر شخص کے لیے زندگی بھر میں ایک بار فرض حج ادا کر لینے کے بعد دوبارہ حج کرنا نفل ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک ''عمرہ'' فرض ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا کیا عورتوں پر جہاد کرنا فرض ہے تو آپ نے فرمایا:

«نَعَمْ! عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لَّا قِتَالَ فِيهِ: اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ»

''ہاں! ان پر ایسا جہاد فرض ہے جس میں لڑائی نہیں اور وہ حج اور عمرہ کرنا ہے۔''[2]

اس روایت کی بنا پر عورتوں پر عمرہ فرض ہے تو مردوں پر بالاولیٰ فرض ہے، نیز رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میرا باپ اس قدر بوڑھا ہے کہ وہ حج اور عمرہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ سفر کرنے کے قابل ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«حُجَّ عَنْ أَبِيكَ وَاعْتَمِرْ» ''تم اپنے باپ کی طرف سے حج اور عمرہ کرو۔''[3]

ہر مسلمان پر زندگی میں ایک بار حج اور عمرہ کرنا فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْحَجُّ مَرَّةً، فَمَنْ زَادَ فَهُوَ تَطَوُّعٌ» ''حج عمر میں ایک بار ہے جس نے زیادہ کیے وہ نفلی ہیں۔''[4]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوا، فَقَالَ رَجُلٌ: أَكُلَّ عَامٍ؟

---

[1] [ضعيف] سنن أبي داود، المناسك، باب في الرمل، حديث: 1888، وجامع الترمذي، الحج، باب ما جاء كيف ترمى الجمار؟ حديث: 902. [2] سنن ابن ماجه، المناسك، باب الحج جهاد النساء، حديث: 2901، ومسند أحمد: 75/6 و165 وفي صحيح البخاري معناه، الحج، باب فضل الحج المبرور، حديث: 1520. [3] سنن أبي داود، المناسك، باب الرجل يحج عن غيره، حديث: 1810، وجامع الترمذي، الحج باب منه ما جاء في الحج عن الميت، حديث: 930، ومسند أحمد: 4/10-12. [4] سنن أبي داود، المناسك، باب فرض الحج، حديث: 1721، ومسند أحمد: 291/1.

يَارَسُولَ اللهِ! . . . فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: لَوْ قُلْتُ: نَعَمْ، لَوَجَبَتْ، وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ»

''اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے۔ تم حج کرو۔ ایک شخص نے کہا: کیا ہر سال؟ اے اللہ کے رسول! ..... تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا اور تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔''[1]

◄ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ جب اس پر حج فرض ہو جائے تو حتی الامکان اسے ادا کرنے میں جلدی کرے اگر وہ بلا عذر تاخیر کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«تَعَجَّلُوا إِلَى الْحَجِّ يَعْنِي الْفَرِيضَةَ فَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَا يَدْرِي مَا يَعْرِضُ لَهُ»

''فرضی حج کے لیے جلدی روانہ ہو جاؤ، تمھیں نہیں معلوم کب کوئی حادثہ پیش آ جائے۔''[2]

◄ حج کے فرض ہونے کی پانچ شرائط ہیں: اسلام، عقل، بلوغت، آزادی اور استطاعت۔ جس شخص میں یہ پانچ شرائط موجود ہوں تو اس پر حج فرض ہے جسے حتی الامکان جلد ادا کرنا چاہیے۔

◄ بچے کا حج یا عمرہ نفلی ہوگا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ''ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک بچہ پیش کیا اور کہا: کیا اس کا حج ہو جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: [نَعَمْ! وَلَكِ أَجْرٌ] ''ہاں! اور تیرے لیے اجر ہے۔''[3]

اہل علم کا اس امر پر اجماع ہے کہ اگر بچے نے بلوغت سے قبل حج کر لیا تو بلوغت کے بعد بشرطِ استطاعت اس پر حج کرنا فرض ہوگا، پہلا حج یا عمرہ کافی نہ ہوگا۔

◄ اگر بچہ سمجھ بوجھ نہ رکھتا ہو تو اس کا سرپرست اسے احرام باندھے، اس کی طرف سے نیت کرے، اسے ممنوعات احرام سے بچائے اور اسے اٹھا کر طواف و سعی کرے، عرفہ، مزدلفہ اور منیٰ میں اپنے ساتھ رکھے اور اس کی طرف سے جمرات کی رمی وغیرہ کرے۔

◄ اگر بچہ سمجھ بوجھ رکھتا ہو تو وہ اپنے ولی کی اجازت سے خود نیت کرے اور جس قدر مناسک حج خود ادا کر سکتا ہو ادا

---

[1] صحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، حديث: 1337. [2] صحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، حديث: 1337، ومسند أحمد: 314/13 واللفظ له. [3] صحيح مسلم، الحج، باب صحة حج الصبي وأجر من حج به، حديث: 1336.

کرے اور جن کی ادائیگی سے قاصر ہو انھیں اس کا ولی ادا کرے، مثلاً: جمرات کی رمی وغیرہ۔ اگر بچہ چلنے سے عاجز ہو تو اسے سواری پر یا اٹھا کر طواف وسعی کروائی جائے۔

تمام وہ کام جو بچہ، سمجھ دار یا غیر سمجھ دار خود کر سکتا ہے وہ خود ہی کرے، جیسے عرفات میں ٹھہرنا، منیٰ میں راتیں گزارنا وغیرہ۔ یہ کام اگر دوسرا کوئی کرے گا تو درست نہ ہوگا اور بچے کے لیے ممنوعات وہی ہیں جو کسی بڑے کے لیے ہیں۔

▲ حج کرنے کی استطاعت شرعاً اس شخص کو حاصل ہے جو جسمانی اور مادی اعتبار سے ادا کر سکتا ہو، یعنی سواری پر سوار ہو سکتا ہو، سفر کی مشکلات برداشت کر سکتا ہو، حج کے لیے جانے اور آنے کا خرچہ برداشت کر سکتا ہو، اہل وعیال کا خرچہ بھی پورا کر سکتا ہو، نیز راستہ محفوظ ہو، جان کا خطرہ نہ ہو۔

▲ اگر کسی کے پاس مال ہے لیکن جسمانی قوت نہیں، مثلاً: بہت بوڑھا ہے یا اسے کوئی مرض لاحق ہے جس میں صحت مند ہونے کی امید نہیں ہے تو لازم ہے کہ وہ کسی مسلمان کو اپنا نائب بنا کر حج یا عمرہ کے لیے روانہ کرے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خثعم قبیلے کی ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے باپ پر حج فرض ہو چکا ہے لیکن وہ اس قدر بوڑھا ہے کہ سواری پر جم کر بیٹھ نہیں سکتا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«نَعَمْ! وَذٰلِكَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ»

''ہاں! (اس کی طرف سے حج کرو) اور یہ حجۃ الوداع کے وقت تھا۔''[1]

▲ حج وعمرے میں کسی کی نیابت (حج بدل) کرنے والے کے لیے لازم ہے کہ اس نے پہلے خود اپنا حج کیا ہو کیونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، آپ ﷺ نے ایک شخص کو سنا وہ کہہ رہا تھا: میں شبرمہ کی طرف سے حاضر ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا:

«حَجَجْتَ عَنْ نَّفْسِكَ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: حُجَّ عَنْ نَّفْسِكَ ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ»

''کیا تو نے خود حج کیا ہے؟'' اس نے کہا: نہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے خود اپنا حج کر، پھر شبرمہ کی طرف سے حج کر۔''[2]

[1] صحيح البخاري، الحج، باب وجوب الحج وفضله ......، حديث: 1513، وصحيح مسلم، الحج، باب الحج عن العاجز لزمانة وهرم ونحوهما أوللموت، حديث: 1334. [2] سنن أبي داود، المناسك، باب الرجل يحج عن غيره، حديث: 1811، والسنن الكبرى للبيهقي: 4/336.

حج بدل کرنے والے (نائب) کو اس قدر اخراجات دیے جائیں کہ وہ آسانی سے سفر میں آنے جانے کی تمام ضروریات پوری کر سکے۔ کسی کو اجرت پر حج کے لیے روانہ کرنا درست نہیں۔ اسی طرح حج بدل کو مال کی کمائی کا ذریعہ بنانا بھی درست نہیں بلکہ نائب کا مقصود و مطلوب یہ ہو کہ وہ اپنے بھائی کو دینی نفع دینا چاہتا ہے، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بیت اللہ کا حج کرے گا، حج کے مقامات کی زیارت کرے گا۔ اس کا حج صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہو گا نہ کہ دنیا کے لیے۔ اگر اس نے محض مال کے حصول کی خاطر حج کیا تو وہ صحیح نہ ہو گا۔

عورت پر حج فرض ہونے کی شرائط اور اس کی نیابت کے احکام

ہر مسلمان مرد اور عورت پر حج کرنا اس وقت فرض ہو جاتا ہے جب وہ تمام شرائط موجود ہوں جن کا ذکر گزشتہ باب میں ہو چکا ہے، البتہ عورت کے لیے ایک مزید شرط یہ ہے کہ دوران سفر اس کا خاوند یا کوئی محرم ساتھ ہو کیونکہ عورت کے لیے خاوند یا محرم کے بغیر حج یا کوئی اور سفر کرنا جائز نہیں۔ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ، وَلَا يَدْخُلُ عَلَيْهَا رَجُلٌ إِلَّا وَمَعَهَا مَحْرَمٌ»

''کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے اور کسی عورت کے پاس کوئی آدمی اس وقت تک نہ جائے جب تک اس کا کوئی محرم موجود نہ ہو۔''[1]

ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا میں جہاد کرنے کے لیے لشکر کے ساتھ جا رہا ہوں اور میری بیوی حج کے لیے جانا چاہتی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''تم اپنی بیوی کے ساتھ جاؤ۔''[2] صحیحین کی روایت یوں ہے: میری بیوی حج کے لیے روانہ ہو چکی ہے اور میرا نام فلاں غزوہ کے مجاہدین میں لکھا جا چکا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ» ''جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ حج میں شریک ہو جاؤ۔''[3]

[1] صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، حديث: 1862، ومسند أحمد: 222/1و346. [2] صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، حديث: 1862. [3] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب من اكتتب في جيش فخرجت امرأته حاجة......، حديث: 3006، وصحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، حديث: 1341 واللفظ له.

صحیح مسلم میں ہے:

«لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، تُسَافِرُ مَسِيرَةَ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ، إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ عَلَيْهَا»

''کسی مومنہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ محرم کے بغیر ایک دن رات کا سفر کرے۔''[1]

ان مذکورہ روایات سے واضح ہوا کہ محرم کے بغیر عورت کا سفر کرنا حرام ہے، وہ سفر حج کا ہو یا حج کے علاوہ کا ہو۔ اس حکم کا مقصد خود عورت کو یا اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے فتنہ وفساد کے امکان کو روکنا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾[2] میں عورت کے لیے محرم کا ہونا بھی سبیل میں شامل ہے۔ اور جس عورت کا محرم نہ ہو تو نہ خود اس پر حج کرنا فرض ہے اور نہ کسی کو اپنی طرف سے حج کروانا فرض ہے۔''[3]

▲ عورت کے محرم سے مراد اس کا خاوند یا اس کا وہ قریبی مرد ہے جس کے ساتھ نسب کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے نکاح کرنا حرام ہے، مثلاً: عورت کا بھائی، باپ، چچا، بھتیجا اور ماموں وغیرہ یا کسی اور شرعی سبب سے نکاح حرام ہو، جیسے رضاعی بھائی یا نکاح کی وجہ سے محرم بننے والا مرد ہو، مثلاً: ماں کا خاوند یا خاوند کا بیٹا۔ صحیح مسلم میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُسَافِرَ سَفَرًا يَّكُونُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فَصَاعِدًا إِلَّا وَمَعَهَا أَبُوهَا أَوِ ابْنُهَا أَوْ زَوْجُهَا أَوْ أَخُوهَا أَوْ ذُومَحْرَمٍ مِّنْهَا»

''جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ وہ اپنے باپ، بیٹے، خاوند، بھائی یا کسی اور محرم کے بغیر تین دن یا زیادہ کا سفر کرے۔''[4]

▲ سفر میں محرم کے جملہ اخراجات عورت کے ذمہ ہوں گے، چنانچہ عورت پر حج فرض ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنے محرم کے سفر حج (میں آنے جانے) کے تمام اخراجات ادا کرنے کی استطاعت رکھتی ہو۔

▲ جس عورت نے حج کے لیے محرم کا بندوبست کر لیا، پھر عورت کی مالی استطاعت کے باوجود کسی وجہ سے وہ محرم شریک سفر نہ ہو سکا تو وہ اس محرم کی شرکت کا انتظار کرے، پھر اگر وہ عورت مایوس ہو جائے تو حج بدل کے لیے کسی کو

---

[1] صحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، حديث: 1339. [2] آل عمران 3:97. [3] شرح منتهى الإرادات: 3/428. [4] صحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، حديث: 1340.

اپنا نائب بنا کر روانہ کر دے۔

◣ جس شخص پر حج فرض ہو چکا تھا، پھر وہ حج ادا کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تو اس کے اصل مال، یعنی ترکہ سے اس قدر رقم الگ کر لی جائے جو حج کے لیے کافی ہو۔ اس سے میت کی طرف سے کسی کو حج کے لیے روانہ کیا جائے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری والدہ نے حج کرنے کی نذر مانی تھی تو وہ حج کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئی تو کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«نَعَمْ! حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَتَهُ؟ اِقْضُوا اللهَ فَاللهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ»

''ہاں! اس کی طرف سے حج کرو، پھر فرمایا: اگر تمھاری والدہ پر کسی کا قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کرتی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا قرض بھی ادا کرو اور اللہ کا قرض ادا کرنا زیادہ لائق ہے۔''[1]

اس روایت سے واضح ہوا کہ جو شخص فوت ہو گیا اور اس پر حج کرنا فرض تھا تو اس کی اولاد یا ولی میت کی طرف سے حج کرے یا کسی اور شخص کو میت کی طرف سے حج کے لیے بھیج دے۔ جس طرح ورثاء کی ذمہ داری ہے کہ میت کے اصل مال سے اس کا قرض ادا کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرض بھی میت کے مال سے ادا کرنا ضروری ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ اس کا قرض اصل مال ہی سے ادا کیا جائے۔ ایک اور روایت میں ہے: ''میری بہن نے حج کی نذر مانی تھی۔''[2]

سنن دارقطنی کی ایک روایت میں ہے: ''میرے والد فوت ہو گئے ہیں، ان پر حج فرض تھا۔''[3]

ان روایات سے واضح ہوا کہ میت کی زندگی میں جو حج فرض ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہو یا خود نذر مان کر فرض کر لیا ہو، بہر صورت فرض ایک قرض ہے جو ادا کیا جائے گا، خواہ میت نے اس کو ادا کرنے کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

◣ اگر کسی شخص نے کسی کو اپنا نائب بنا کر حج کے لیے بھیجا تو گویا اس نے خود حج کیا، حج کرنے والا بمرتبہ وکیل ہے، لہٰذا نائب بھیجنے والے کی طرف سے نیت کرے، اس کی طرف سے تلبیہ کہے، اس کی طرف سے قربانی کی نیت کرے۔ نام نہ بھی لے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر اس کا نام و نسب معلوم نہ ہو تو دل میں یہ نیت کر لے کہ میں اس شخص

① صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب الحج والنذور عن الميت...... ، حديث : 1852. ② مسند أحمد : 240/1و345. ③ [ضعيف] سنن الدارقطني :260/2، حديث :2586.

کی طرف سے حج کر رہا ہوں جس نے مجھے حج کا خرچ دیا ہے، یہی نیت کافی ہوگی۔

▲ والدین وفات پا چکے ہوں یا زندہ ہوں لیکن حج کرنے کی ہمت نہ رکھتے ہوں تو ان کے لیے حج کرنا مستحب ہے۔ اس میں والدہ کو مقدم رکھا جائے کیونکہ حسن سلوک کی وہ زیادہ حق دار ہے۔

حج کی فضیلت اور اس کی تیاری کرنا

حج کی بہت زیادہ فضیلت اور اس کا بہت اجر و ثواب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُورَةِ ثَوَابٌ إِلَّا الْجَنَّةُ»

”حج اور عمرہ کرتے رہو کیونکہ یہ دونوں تنگ دستی اور گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتے ہیں جیسے بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل کو ختم اور صاف کر دیتی ہے۔ حج مبرور کا اجر جنت ہی ہے۔“[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم جہاد کرنا افضل عمل سمجھتی ہیں تو کیا ہم جہاد کے لیے نہ نکلیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَكِنَّ أَفْضَلُ الْجِهَادِ حَجٌّ مَبْرُورٌ»

”تمھارے (عورتوں کے) لیے سب سے افضل جہاد حج مبرور ہے۔“[2]

واضح رہے ”حج مبرور“ سے مراد ایسا حج ہے جس میں کسی گناہ کے عمل کی آمیزش نہ ہو، کتاب و سنت کے احکام کے مطابق ہو، نیز حج مبرور کو ”حج مقبول“ بھی کہا گیا ہے۔

▲ جب کسی کا حج کے لیے جانے کا پختہ عزم و ارادہ بن جائے تو وہ اولاً تمام معاصی سے توبہ کرے اور اگر بندوں کے حقوق غصب کیے ہیں تو انھیں معذرت کے ساتھ واپس لوٹائے، لوگوں کی امانتیں اور عاریتاً لی ہوئی اشیاء اور لیے ہوئے قرضے ادا کرے۔ کسی پر ظلم و زیادتی کی ہو تو اس سے معافی مانگے۔ کوئی وصیت کرنی ہو تو تحریری وصیت کر

① جامع الترمذي، الحج، باب ما جاء في ثواب الحج والعمرة، حديث: 810. ② صحيح البخاري، الجهاد، باب فضل الجهاد والسير، حديث: 2784.

دے۔ جن حقوق کو ادا نہیں کر سکا ان کی ادائیگی کے لیے کسی کو اپنا نائب مقرر کر دے، اپنے اہل وعیال اور جن کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ہے واپس آنے تک کے جملہ اخراجات کا بندوبست کر کے بے فکر کرے۔ پوری کوشش کرے کہ یہ خرچ حلال کی کمائی سے ہو اور سفر کے لیے زادراہ لے جو اسے کافی ہو تا کہ کسی کے آگے دست سوال نہ بڑھائے۔ زادراہ حلال اور پاک ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَنفِقُوا مِن طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾

''اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی میں سے خرچ کرو۔''[1]

سفر میں کوئی ایسا شریک سفر تلاش کرے جو نیک ہو، سفر اور مناسک حج کی ادائیگی میں معاون ہو اور راہنما ہو، کہیں بھول چوک ہو جائے تو اصلاح کر دے۔

▲ نیت کا درست اور صحیح ہونا ضروری ہے۔ ایک مسلمان حج کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول سمجھے، وہ نرمی اور حسن اخلاق کو اپنائے، جھگڑا کرنے، لوگوں کو راستوں میں تنگ کرنے سے اجتناب کرے، اپنی زبان کو گالی، غیبت اور تمام ان امور سے محفوظ رکھے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔

مواقیتِ حج کا بیان

''مواقیت'' میقات کی جمع ہے۔ میقات کا لغوی معنیٰ ''حد'' ہے جب کہ شریعت کی اصطلاح میں ''عبادت کی جگہ یا اس کا وقت'' ہے۔ مواقیت حج کی دو قسمیں ہیں: ① زمانیہ، یعنی جن کا تعلق زمانے اور وقت سے ہے اور ② مکانیہ، یعنی جن کا تعلق مکان اور جگہ سے ہے۔

مواقیت زمانیہ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں موجود ہے:

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُومٰتٌ ۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾

''حج کے مہینے معلوم ومقرر ہیں، چنانچہ جو شخص ان میں حج لازم کر لے تو وہ شہوانی باتوں، گناہ کرنے اور لڑائی جھگڑا کرنے سے بچتا رہے۔''[2]

اور حج کے مہینے یہ ہیں: شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی دس ایام جو شخص ان مہینوں میں حج کے لیے احرام

① البقرة 2:267. ② البقرة 2:197.

باندھ لے تو اسے ان تمام برے اور مذموم اقوال وافعال سے بچنا چاہیے جو حج وعمرہ میں خلل اور خرابی پیدا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسے نیکی وخیر کے امور میں مشغول رہنا چاہیے اور تقوے کا التزام کرنا چاہیے۔

مواقیت مکانیہ، یعنی وہ مقامات جنھیں حج اور عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ جانے والا شخص احرام کے بغیر عبور نہیں کرسکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان مقامات کی نشاندہی خود فرمائی ہے، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

«وَقَّتَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ، وَلِأَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ، وَلِأَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ، وَلِأَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ، هُنَّ لَهُمْ وَلِمَنْ أَتٰى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِهِنَّ مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، وَمَنْ كَانَ دُونَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ، حَتّٰى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ»

''رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کے لیے ذو الحُلَیفہ، اہل شام کے لیے جُحفہ، اہل نجد کے لیے قرن المنازل، اہل یمن کے لیے یلملم کو میقات مقرر کیا جو لوگ ان علاقوں میں رہتے ہوں ان کے لیے یہی میقات ہیں، البتہ جو حج یا عمرہ کرنے والا ان مذکورہ علاقوں میں سے کسی علاقے کا باشندہ نہ ہو تو وہ ان مواقیت میں سے جس میقات کے پاس سے گزرے وہاں سے احرام کی نیت کرے۔ اور جو شخص ان مواقیت کے اندر رہتا ہو تو وہ جہاں سے چلے وہاں ہی سے احرام باندھ لے حتی کہ اہل مکہ مکے سے احرام باندھیں۔''[1]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَمُهَلُّ أَهْلِ الْعِرَاقِ مِنْ ذَاتِ عِرْقٍ» ''اہل عراق کی میقات ذاتِ عرق ہے۔''[2]

ان مواقیت کی تعیین میں حکمت یہ ہے کہ بیت اللہ عظمت وشان والا مقام ہے تو مکہ مکرمہ ایک قلعے کا درجہ رکھتا ہے جبکہ حرم کو ''ممنوعہ علاقہ'' قرار دیا۔ اور حرم (مکہ) سے مراد وہ مواقیت ہیں جن کو حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے بیت اللہ کی تعظیم کی خاطر حالت احرام کے بغیر عبور کرنا جائز نہیں۔

مواقیت میں سے سب سے دور میقات ذو الحلیفہ مدینے کا میقات ہے اس کے اور مکے کے درمیان دس دن پیدل (420 کلومیٹر تقریباً) کی مسافت ہے۔

اہل شام اور مصر اور تمام مغرب سے آنے والوں کا میقات جُحفہ (رابغ شہر کے قریب) ہے۔ اس کے اور

[1] صحيح البخاري، الحج، باب مُهل أهل مكة للحج والعمرة، حديث : 1524، وصحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، حديث : 1181. [2] صحيح مسلم، الحج، باب مواقيت الحج، حديث : 1183.

مکے کے درمیان تین مراحل، یعنی تین دن کا پیدل سفر ہے۔

اہل یمن کا میقات یلملم ہے جسے آج کل السعدیہ کہتے ہیں، اس کا اور مکے کا درمیانی فاصلہ دو مرحلے ہے۔

اہل نجد کا میقات قرن المنازل مکے سے دو مرحلے پر ہے جسے آج کل السیل کہتے ہیں۔

اہل عراق اور تمام مشرق سے آنے والوں کے لیے ''ذات عرق'' میقات ہے جو کہ مکے سے دو مرحلے پر واقع ہے۔

▲ یہ مذکورہ مواقیت ان حضرات کے لیے ہیں جو وہاں رہتے ہیں یا ان مواقیت کے قریب رہتے ہیں اور جو ان کے علاوہ لوگ ہیں وہ جب ان مواقیت میں سے کسی میقات کے پاس سے گزریں تو وہاں سے احرام باندھیں بشرطیکہ وہ حج یا عمرے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

▲ جو شخص میقات کے اندر رہتا ہے تو وہ حج اور عمرے کے لیے احرام کی نیت اپنی رہائش گاہ سے کرے۔ اور اہل مکہ میں سے جو حج کرنا چاہے تو وہ مکہ مکرمہ ہی سے احرام باندھ کر نیت کرے۔ اسے حج کے احرام کے لیے قریب ترین حِلّ پر جانے کی ضرورت نہیں، البتہ عمرے کے احرام کے لیے کسی قریب ترین حِلّ پر جائے۔[1]

▲ اگر کسی شخص کا ان مواقیت میں سے کسی میقات پر گزر نہ ہو تو جب اسے علم ہو کہ وہ کسی قریب ترین میقات کے برابر پہنچ چکا ہے تو وہاں سے احرام کی نیت کرے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''بس یہی دیکھ لو کہ تم اپنے قریب ترین میقات کے برابر آ چکے ہو تو احرام کی نیت کر لو۔''[2]

▲ حج اور عمرے کے لیے ہوائی جہاز پر جانے والے مسافر کو چاہیے کہ سوار ہونے سے پہلے نہا دھو کر احرام کے کپڑے پہن لے، جب وہ میقات کے برابر آئے تو احرام کی نیت کرے اور جہاز ہی میں تلبیہ کہنا شروع کر دے۔ بعض حجاج کرام ہوائی جہاز یا بحری جہاز سے اتر کر جدہ یا بحرہ کے مقام پر احرام باندھتے ہیں، حالانکہ اس قدر تاخیر کرنا ان کے لیے قطعاً جائز نہیں کیونکہ جدہ یا بحرہ نہ کوئی میقات ہیں اور نہ احرام کا مقام۔ وہاں احرام باندھنا صرف ان کے لیے جائز ہے جو وہاں کے رہنے والے ہیں یا جو وہاں سے حج یا عمرہ کی نیت کر کے چلتے ہیں۔ اور جو ان کے

---

[1] مطالعۂ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مکے میں رہنے والے مسافر کے لیے ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ نے حکم دیا تھا۔ اور حدیث وَأَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ ''اہل مکہ مکہ سے احرام باندھیں۔'' میں حج اور عمرہ دونوں کا حکم مقیم کو ہے۔ وہ مستقل اقامت پذیر ہو یا مسافر ہو لیکن مدت سفر سے زیادہ دن ٹھہرنے کی وجہ سے مقیم ہو، لہٰذا وہ حج اور عمرہ دونوں کا احرام اپنی رہائش گاہ سے باندھ سکتے ہیں چاہے وہ حرم کے اندر ہو۔ (صارم)

[2] صحيح البخاري، الحج،باب ذات عرق لأهل العراق، حديث :1531.

علاوہ ہیں اگر ان میں سے کسی نے جدہ سے احرام باندھا تو اس نے واجب کو ترک کیا (جو کہ میقات سے احرام باندھنا تھا،) لہٰذا اس پر فدیہ لازم ہے۔ اس غلطی کا ارتکاب بہت سے لوگ کرتے ہیں، اس لیے ہم نے اس پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

بعض لوگ احرام کے لیے غسل ضروری سمجھتے ہیں، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہم جہاز میں غسل وغیرہ نہیں کر سکتے، لہٰذا جب جدہ ائر پورٹ پر اتریں گے تو غسل کر کے احرام باندھ لیں گے۔ ان حضرات کو علم ہونا چاہیے کہ احرام کا مطلب ''نیت کے ساتھ مناسک حج میں داخل ہونا اور احرام کے ممنوعات سے حتی الامکان بچنا ہے۔'' باقی رہا غسل اور خوشبو کا استعمال تو یہ اعمال سنت کا درجہ رکھتے ہیں، نیز یہ کام جہاز میں سوار ہونے سے پہلے آسانی سے ہو سکتے ہیں بلکہ ان کے بغیر بھی احرام کی نیت کر لی جائے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ ایسا شخص میقات کے برابر ہونے پر یا اس سے تھوڑی دیر پہلے احرام کی نیت کرے اور اپنی سیٹ پر بیٹھا تلبیہ کہتا رہے۔ واضح رہے کہ میقات کا علم جہاز کے عملے سے پوچھ کر ہو سکتا ہے یا وہ اندازہ اور کوشش کر کے معلوم کر لے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس نے حسب طاقت واجب ادا کر دیا، اگر اس نے اس کے بارے میں سستی اور لاپروائی کی تو وہ خطا کا مرتکب ہوگا اور بغیر عذر کے واجب کا تارک ہوگا جس سے اس کے حج اور عمرے میں نقص واقع ہوگا۔

▲ جس شخص نے احرام کے بغیر ہی میقات کو عبور کر لیا تو وہ واپس لوٹے اور میقات پر آ کر احرام باندھے کیونکہ یہ ایسا واجب ہے جس کا تدارک ممکن ہے، لہٰذا اس کا ترک جائز نہیں۔ اگر وہ واپس نہ لوٹا اور جدہ وغیرہ ہی سے احرام باندھ لیا تو اس پر ایک سالم بکری، اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ بطور فدیہ ہے جسے وہ خود نہ کھائے بلکہ حرم کے مساکین میں تقسیم کر دے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ دینی امور کو اہمیت دے کہ ہر عبادت کو مسنون طریقے سے ادا کرے، انھی میں سے حج عمرے کا احرام ہے۔ مقررہ میقات پر احرام کی نیت کرے اور احرام باندھے، بغیر احرام کے میقات عبور نہ کرے۔

احرام باندھنے کا طریقہ

مناسک حج میں سب سے پہلا اہم کام احرام باندھنا ہے جو حج میں داخل ہونے کی نیت ہے۔ احرام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سے مسلمان اپنے آپ پر ہر وہ چیز حرام کر لیتا ہے جو احرام سے پہلے مباح تھی، جیسے: نکاح کرنا، خوشبو لگانا، ناخن تراشنا، حجامت بنوانا یا عام معمول کا لباس پہننا وغیرہ۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”کوئی شخص محض دل کی نیت اور ارادے سے مُحرِم نہیں ہوتا۔ ارادہ تو اس وقت ہی شامل ہو گیا تھا جب وہ اپنے شہر سے چل پڑا تھا بلکہ نیت کے ساتھ ایسا قول و عمل بھی ضروری ہے جس سے وہ محرم قرار پائے (اور وہ تلبیہ و احرام باندھنا ہے۔)“[1]

▲ حج کے لیے احرام باندھنے سے قبل درج ذیل چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ حج جیسی عظیم عبادت کا استقبال شایانِ شان طریقے سے ہو سکے۔

غسل کرنا: رسول اللہ ﷺ نے احرام کے لیے غسل کیا تھا۔ غسل سے بدن کی طہارت و نظافت خوب طرح سے ہو جاتی ہے اور بدبو کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال احرام کے وقت غسل کرنا مطلوب و مقصود ہے حتی کہ حیض یا نفاس کا دوران ہو تو بھی عورت غسل کرے کیونکہ نبی ﷺ نے سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو ایام نفاس کے دوران میں غسل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی غسل کا حکم دیا حالانکہ ان کے ایام حیض جاری تھے۔ اس غسل میں حکمت یہ ہے کہ نظافت حاصل ہو اور بدبو کا ازالہ ہو، نیز حیض اور نفاس والی عورت کی ناپاکی و پلیدی میں تخفیف ہو جائے۔

حجامت بنوانا: جب احرام باندھنے کا ارادہ ہو تو مستحب یہ ہے کہ جسم کی خوب اور اچھی طرح صفائی کر لی جائے۔ بڑھی ہوئی مونچھیں، بغلیں اور زیر ناف بال صاف کر لیے جائیں تاکہ احرام کے دنوں میں اس صفائی کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اگر احرام باندھنے سے پہلے ایسی مخصوص صفائی کی ضرورت نہ ہو تو اسے رہنے دیا جائے کیونکہ یہ چیز احرام کا حصہ نہیں بلکہ یہ کام ایک ضرورت کی وجہ سے ہے۔

خوشبو کا استعمال: احرام باندھنے سے پہلے جو خوشبو میسر ہو اسے استعمال کیا جائے، مثلاً: کستوری، پرفیوم، عرق گلاب یا کسی خوشبودار لکڑی کی دھونی وغیرہ۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

«كُنْتُ أُطَيِّبُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ حِينَ يُحْرِمُ وَلِحِلِّهِ قَبْلَ أَنْ يَطُوفَ بِالْبَيْتِ»

”رسول اللہ ﷺ کو احرام باندھنے سے قبل میں خوشبو لگاتی اور جب آپ ﷺ احرام کھول دیتے تو بیت اللہ کا طواف (طواف زیارت) کرنے سے پہلے بھی آپ کو خوشبو لگاتی۔“[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اگر محرم احرام باندھنے سے پہلے اپنے بدن پر خوشبو لگانا چاہے تو اچھا اور بہتر ہے لیکن اسے کسی کو حکم نہیں دینا چاہیے کیونکہ نبی ﷺ نے خود ایسا کیا تھا لیکن لوگوں کو اس کا حکم نہیں دیا

① مجموع الفتاوی لابن تیمیة: 108/26. ② صحیح البخاري، الحج، باب الطیب عند الإحرام......، حدیث: 1539.

تھا۔''[1]

احرام کے کپڑے پہننا: مُحرم مرد کو چاہیے کہ وہ احرام کی چادریں پہننے سے پہلے اپنے جسم پر موجود سلا ہوا لباس قمیص، شلوار وغیرہ اتار دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا دو سفید اور صاف ستھری چادریں، یعنی ازار اور اوپر والی چادر بطور احرام باندھ لے۔ سفید کے علاوہ اور کوئی رنگ دار احرام بھی ہو سکتا ہے جو رنگ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ انسان زینت سے دور رہے اور خشوع و خضوع اور عاجزی کی حالت میں رہے اور اسے یاد رہے کہ وہ ہر وقت حالت احرام میں ہے تا کہ احرام کے ممنوعات سے بچا رہے، نیز اسے موت اور لباس کفن یاد رہے اور روز قیامت کو اٹھنا اور حشر و نشر وغیرہ ذہن نشین رہے۔

▲ احرام کی نیت کرنے سے پہلے سلا ہوا لباس اتار دینا سنت ہے اور احرام کی نیت کے بعد اتارنا واجب ہے۔ اگر کسی نے سلا ہوا لباس پہنے ہوئے احرام کی نیت کی تو اس کا احرام درست ہے، البتہ نیت کے بعد اسے اتار دے۔

▲ احرام سے قبل کوئی مخصوص نماز نہیں ہے، البتہ اگر کسی فرض نماز کا وقت ہو تو اسے ادا کر کے احرام کی نیت کر لے کیونکہ رسول اللہ ﷺ (ذوالحلیفہ میں) ظہر کی نماز ادا کر کے سواری پر سوار ہوئے تھے اور تلبیہ کہنا شروع کیا تھا۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھ کر احرام کی نیت کی تھی اس کے لیے کوئی الگ اور خاص نماز ادا نہیں کی تھی۔''[2]

▲ یہاں ہم ایک مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ کئی حجاج کرام یہ سمجھتے ہیں کہ میقات کے مقام پر بنی ہوئی مسجد میں جانا اور اس کے اندر احرام باندھنا ضروری ہے۔ اس خیال کی بنا پر مرد اور عورتیں مسجد کی طرف بھاگتے ہیں۔ مسجد میں اچھا خاصا رش ہو جاتا ہے۔ کئی لوگ مسجد کے اندر ہی کپڑے اتارتے اور احرام کے کپڑے پہنتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے کی کوئی دلیل نہیں۔ اصل چیز میقات سے احرام باندھنا ہے۔ زمین کا کوئی مخصوص حصہ نہیں۔ مسجد کے اندر یا باہر جہاں بھی آسانی ہو احرام کے لیے وہی جگہ درست ہے بلکہ اس موقع پر محفوظ اور الگ جگہ زیادہ مناسب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ مساجد نہ تھیں اور نہ یہ احرام باندھنے کی خاطر بنائی گئی ہیں بلکہ یہ مساجد وہاں قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کے لیے ہیں تا کہ وہ نماز ادا کر سکیں۔

▲ حج کرنے والے شخص کو اختیار ہے کہ وہ تمتع، قران یا افراد میں سے جس قسم کا حج کرنا چاہے کر سکتا ہے۔[3]

---

① مجموع الفتاویٰ: 234/13. ② زاد المعاد: 107/2.
③ البتہ احادیث میں حج تمتع اور قران کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ دیکھیے حجۃ النبي ﷺ للألباني رحمہ اللہ.

حجِ تمتع | حج تمتع یہ ہے کہ کوئی حج کے مہینوں میں اولاً عمرے کا احرام باندھے، پھر عمرہ کر کے احرام کھول دے اور اسی سال حج کا احرام باندھے۔

حجِ اِفراد | حج افراد یہ ہے کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھے اور حج مکمل ہونے تک اسی احرام میں رہے۔ اس میں عمرہ شامل نہیں ہوتا۔

حجِ قِران | حج قران یہ ہے کہ حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھا احرام باندھا جائے یا اولاً عمرے کا احرام باندھے، پھر طوافِ عمرہ سے پہلے پہلے حج کی نیت بھی اس میں شامل کر لے۔

الغرض حج قران کرنے والا میقات سے دونوں (حج اور عمرہ) کی نیت کر کے احرام باندھے یا عمرے کا طواف شروع کرنے سے پہلے ہی حج کی نیت کر لے تو دونوں طرح درست ہے۔ یہ شخص حج اور عمرے (دونوں) کا ایک ہی طواف اور سعی کرے گا۔

مُتَمَتِّع اور قارن دونوں پر قربانی لازم ہے۔ اگر وہ مسجد حرام کے پاس رہنے والے نہ ہوں۔ حج کی ان تینوں قسموں میں سے افضل قسم حج تمتع ہے۔ اس کے حق میں بہت سے دلائل ہیں۔

▲ جب حج کی کسی بھی قسم کی نیت کر کے احرام باندھا جائے تو اس کے بعد تلبیہ کہنا شروع کر دینا چاہیے۔ تلبیہ بلند آواز سے اور زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے۔ کلمات تلبیہ یہ ہیں:

«لَبَّيْكَ! اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ! لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ! إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ»

ممنوعاتِ احرام کا بیان

کچھ کام ایسے ہیں جو حالت احرام میں مُحرِم پر حرام ہیں، ان سے اجتناب کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ کام نو (9) ہیں جو درج ذیل ہیں:

① بال مونڈنا یا کاٹنا: محرم کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنے بدن کے کسی بھی حصے سے بلا عذر شرعی بال مونڈے یا کاٹے یا اکھاڑے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾

’’اور اپنے سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی قربان گاہ تک نہ پہنچ جائے۔‘‘[1]

محرم کے لیے سر منڈوانے کی نہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ واضح حکم موجود ہے۔ اس نص شرعی کا اطلاق بالاتفاق جسم پر موجود تمام بالوں پر ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی سر کے بالوں کی طرح ہیں، نیز سر کے بالوں کی طرح ان کو زائل کرنے سے بھی زینت وصفائی حاصل ہوتی ہے جو احرام کی حالت کے منافی ہے کیونکہ ایک محرم کا پراگندہ بالوں والا اور غبار آلودہ ہونا اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے۔

اگر محرم کی آنکھ میں بال اُگ آئیں (جنھیں پڑبال کہتے ہیں) تو انھیں اکھاڑ دینے سے کوئی فدیہ لازم نہ آئے گا کیونکہ آنکھ بالوں کا محل نہیں، نیز وہ بال تکلیف کا باعث ہیں۔

② ہاتھ یا پاؤں کے ناخن کاٹنا: ہاتھ یا پاؤں کے ناخن کاٹنے منع ہیں، البتہ اگر کسی ناخن کا کچھ حصہ خود بخود ٹوٹ گیا، پھر محرم نے تکلیف کی وجہ سے باقی ناخن بھی کاٹ کر الگ کر دیا یا ناخن خود ہی ٹوٹ کر الگ ہو گیا تو اس پر کوئی فدیہ نہیں کیونکہ اس کے بارے میں مُحرم معذور ہے۔

اگر کسی نے جوئیں پڑ جانے یا دردِ سر وغیرہ کی وجہ سے سر منڈوالیا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾

’’پھر اگر کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ سر منڈوالے) تو فدیے میں روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔‘‘[2]

علاوہ ازیں سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میرے سر میں جوئیں پڑنے کی وجہ سے مجھے تکلیف تھی، چنانچہ مجھے اس حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا كُنْتُ أُرٰى أَنَّ الْجَهْدَ بَلَغَ مِنْكَ مَا أَرٰى، أَتَجِدُ شَاةً؟ فَقُلْتُ: لَا، فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ: ﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ قَالَ: صَوْمُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، أَوْ إِطْعَامُ سِتَّةِ مَسَاكِينَ، نِصْفَ صَاعٍ طَعَامًا لِّكُلِّ مِسْكِينٍ ـ وَفِي لَفْظٍ ـ أَوِ اذْبَحْ شَاةً»

’’میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ تمھیں اس قدر تکلیف ہو گی۔ تم بکری ذبح کرنے کی طاقت رکھتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں! تب آیت کریمہ ﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ ’’تو وہ فدیے میں روزے رکھے یا

[1] البقرة 2:196. [2] البقرة 2:196.

صدقہ دے یا قربانی کرے۔'' نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تین روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، ہر مسکین کو نصف صاع کھانا دو۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: یا ایک بکری ذبح کرو۔''[1]

▲ محرم کے لیے بالوں کو بیری وغیرہ کے پتے ڈال کر پانی سے دھونا جائز ہے۔[2] چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے احرام کی حالت میں اپنا سر مبارک دھویا تھا اور اسے آگے پیچھے سے اپنے دونوں ہاتھوں سے ملا بھی تھا۔[3]

شیخ تقی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''محرم احتلام کی صورت میں غسل جنابت کرے گا۔ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اسی طرح وہ غیر جنابت میں بھی غسل کر سکتا ہے۔''

③ سر ڈھانپنا: مرد کے لیے (حالت احرام میں) سر ڈھانپنا منع ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے محرم کو پگڑی اور ٹوپی والا کوٹ پہننے سے منع فرمایا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو چیز سر کے ساتھ لگتی ہو اور سر چھپانے کے کام آتی ہو، جیسے: پگڑی، کپڑا اور ٹوپی وغیرہ تو اس کا استعمال بالاتفاق ناجائز اور ممنوع ہے۔''[4]

واضح رہے پگڑی کی طرح سر پر کاغذ چپکانا، مٹی، مہندی لگانا یا رومال باندھنا سب کا ایک ہی حکم ہے۔ محرم خیمے، درخت یا گھر کے سائے میں ٹھہر سکتا ہے کیونکہ نبی ﷺ کے لیے خیمہ لگایا گیا تھا اور آپ ﷺ حالت احرام میں اس میں ٹھہرے تھے۔ اسی طرح محرم کے لیے چھتری کا سایہ حاصل کرنا جائز ہے۔ چھت والی بس میں سوار ہونا جائز ہے اور سر پر سامان اٹھانا (جس میں سر ڈھانپنا مقصد نہ ہو) درست ہے۔

④ سلا ہوا کپڑا پہننا: محرم مرد کے لیے پورے جسم یا جسم کے کچھ حصے پر سلا ہوا لباس پہننا منع ہے، مثلاً: قمیص، پگڑی، شلوار، موزے اور دستانے وغیرہ استعمال کرنا۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا کہ محرم کیا کچھ پہن سکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ الْقَمِيصَ، وَلَا الْعِمَامَةَ، وَلَا الْبُرْنُسَ، وَلَا السَّرَاوِيلَ، وَلَا

① صحيح البخاري، المُحصَر، باب الإطعام في الفدية نصف صاع، حديث: 1816، وصحيح مسلم، الحج، باب جواز حلق الرأس للمحرم إذا كان به أذى......، حديث: 1201 واللفظ له.

② اگر سر وغیرہ کو دھوتے یا کھجلاتے وقت جسم کے چند بال ٹوٹ کر گر جائیں تو اس صورت میں فدیہ نہیں۔ (الموطأ للإمام مالك: الحج، باب مايجوز للمحرم أن يفعله)

③ صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب الاغتسال للمحرم، حديث: 1840، وصحيح مسلم، الحج، باب جواز غسل المحرم بدنه ورأسه، حديث: 1205. ④ زاد المعاد لابن القيم: 243/2.

ثَوْبًا مَّسَّهُ وَرْسٌ وَّلَا زَعْفَرَانٌ، وَلَا الْخُفَّيْنِ»
’’محرم قمیص، پگڑی، کوٹ، شلوار اور ایسا کپڑا نہ پہنے جسے خوشبو ورس اور زعفران لگی ہو اور نہ وہ موزے پہنے۔‘‘[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’رسول اللہ ﷺ نے محرم کو قمیص، کوٹ، شلوار، موزے اور پگڑی کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ اور لوگوں کو منع فرمایا کہ محرم کے فوت ہونے پر اس کا سر ڈھانپا جائے۔ ایک شخص نے حالت احرام میں جبہ پہنا تھا تو آپ ﷺ نے اسے اتارنے کا حکم دیا۔ الغرض مذکورہ صورتوں میں سلے ہوئے لباس کا استعمال محرم کے لیے جائز نہیں، نہ خود پہنے نہ کسی دوسرے کو پہنائے۔ لباس پھٹا ہوا ہو یا سالم ہر صورت منع ہے۔ اسی طرح جبہ اور انڈر رویئر کا استعمال بھی درست نہیں۔‘‘[2]

اگر محرم کو پہننے کے لیے جوتا میسر نہ ہو تو موزے پہن لے یا ازار کے لیے چادر نہ ملے تو چادر ملنے تک شلوار پہن لے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو شلوار پہننے کی اس وقت تک اجازت دی تھی جب اسے چادر نہ مل سکی۔[3]

عورت حالت احرام میں جیسا لباس چاہے پہن لے کیونکہ اسے پردے کی شدید ضرورت ہوتی ہے، البتہ عورت برقعہ اور نقاب نہ پہنے۔ عرب عورتوں کا نقاب ایسا کپڑا تھا جسے وہ چہرے پر باندھتی تھیں اور اس میں دیکھنے کے لیے آنکھوں کے سامنے دو سوراخ ہوتے تھے۔ عورت اپنا چہرہ دوپٹے یا چادر سے بصورت گھونگھٹ ڈھانپ سکتی ہے۔

عورت دستانے نہ پہنے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تَنْتَقِبِ الْمُحْرِمَةُ وَلَا تَلْبَسِ الْقُفَّازَيْنِ» ’’محرم عورت نقاب نہ کرے اور دستانے نہ پہنے۔‘‘[4]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے تھے: ’’عورت کو نقاب اور دستانے پہننے سے جو منع کیا گیا ہے یہ دلیل ہے کہ عورت کا چہرہ مرد کے بدن کی طرح ہے سر کی طرح نہیں، لہٰذا عورت کے لیے چہرے کی مقدار کا خصوصی کپڑا استعمال کرنا ناجائز ہے، جیسے: نقاب یا برقعہ وغیرہ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ چادر وغیرہ سے بھی چہرہ نہ ڈھانپے اور یہی رائے درست ہے۔‘‘

عورت کے لیے مردوں سے اپنا چہرہ چھپانا نقاب اور برقعے کے سوا کسی چیز کے ذریعے سے واجب ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

«كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّونَ بِنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ مُحْرِمَاتٌ فَإِذَا حَاذَوْا بِنَا سَدَلَتْ إِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَّأْسِهَا عَلٰى وَجْهِهَا، فَإِذَا جَاوَزُونَا كَشَفْنَاهُ»

[1] صحيح البخاري، العلم، باب من أجاب السائل بأكثر مما سأله، حديث: 134، وصحيح مسلم، الحج، باب ما يباح للمحرم بحج أو عمرة لُبسُه ......؟ حديث: 1177 واللفظ له. [2] مجموع الفتاوىٰ: 111،110/26. [3] صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب إذا لم يجد الإزار فليلبس السراويل، حديث: 1843. [4] صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب ما ينهى من الطيب للمحرم والمحرمة، حديث: 1838.

''قافلے ہمارے پاس سے گزرتے اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالت احرام میں ہوتی تھیں۔ جب لوگ ہمارے سامنے آتے تو ہر ایک اپنے چہرے پر چادر کا کپڑا لٹکا لیتی جب وہ گزر جاتے تو ہم چہرہ کھول لیتی تھیں۔''[1]

کسی عورت کے چہرے پر لٹکتا ہوا کپڑا اگر چہرے کو لگ جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ صرف برقعے اور نقاب سے روکا گیا ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کپڑے سے چہرہ ڈھانپنے سے نہیں روکا گیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عورت کو یہ تکلیف نہ دی جائے کہ وہ کسی لکڑی یا ہاتھ وغیرہ کے ساتھ چہرے سے کپڑا ہٹا کر رکھے۔ نبی ﷺ نے اس کے چہرے اور ہاتھوں کو ایک ہی حکم میں رکھا ہے۔ عورت کے یہ دونوں اعضاء مرد کے جسم کے حکم میں ہیں نہ کہ اس کے سر کے حکم میں۔ رسول اللہ ﷺ کی زوجات محترمات اپنے چہروں پر کپڑا لٹکا لیتی تھیں اگر وہ چہرے کو لگتا تو اسے خاطر میں نہ لاتی تھیں۔'' نیز موصوف فرماتے ہیں: ''چہرہ ڈھانپتے ہوئے اگر کپڑا چہرے کے ساتھ لگ جائے تو بھی کوئی حرج نہیں جبکہ وہ نقاب اور برقعے کا استعمال نہ کرے۔''[2]

⑤ خوشبو لگانا: محرم کے لیے بدن یا کپڑے پر یا کھانے پینے کی اشیاء میں خوشبو کا استعمال حرام ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آدمی کو خوشبو دھو ڈالنے کا حکم دیا تھا۔[3] اور آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جسے سواری نے گرا کر مار ڈالا تھا:

«اِغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَّسِدْرٍ وَّكَفِّنُوهُ فِي ثَوْبَيْهِ وَلَا تَمَسُّوهُ بِطِيبٍ . . . »

''اسے بیری کے پتوں والے پانی سے غسل دینا اور احرام کے کپڑوں ہی میں دفن کرنا اور خوشبو نہ لگانا۔''[4]

محرم کو خوشبو کے استعمال سے روکنے میں شاید حکمت یہ ہے کہ وہ آسائش کی اشیاء اور دنیوی زینت اور اس کی لذتوں سے دور رہے اور آخرت کی طرف متوجہ رہے۔ حالت احرام میں خوشبو کا سونگھنا اور خوشبودار تیل استعمال کرنا بھی جائز نہیں۔

⑥ خشکی میں شکار کرنا: محرم کے لیے خشکی، یعنی جنگل و میدان میں کسی جانور کا شکار کرنا اور اسے قتل کرنا منع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ﴾

---

① [ضعيف] سنن أبي داود، المناسك، باب في المحرمة تغطي وجهها، حديث: 1833، ومسند أحمد: 30/6. ② مجموع الفتاوىٰ: 113,112/26. ③ صحيح البخاري، الحج، باب غسل الخلوق ثلاث مرات من الثياب، حديث: 1536. ④ صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب سنة المحرم إذا مات، حديث: 1851.

''اے ایمان والو! (وحشی) شکار کو قتل مت کرو، جب تم حالت احرام میں ہو۔''[1]

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا﴾

''اور خشکی کا شکار پکڑنا تمھارے لیے حرام کیا گیا ہے جب تک تم حالت احرام میں ہو۔''[2]

محرم کے لیے شکار کرنا، اس میں تعاون کرنا یا اسے ذبح کرنا منع ہے۔ اسی طرح اپنے ہی شکار کیے ہوئے سے کھانا یا جو جانور اس کے لیے شکار کیا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے کیونکہ یہ اس کے لیے مردار کی طرح ہے۔

سمندر و دریا کا شکار محرم پر حرام نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ﴾

''تمھارے لیے دریا (اور سمندر) کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا حلال ہے۔''[3]

اسی طرح گھریلو جانور: مرغی، بکری، گائے وغیرہ ذبح کرنا بھی حرام نہیں کیونکہ یہ شکار کرنے کے جانور نہیں۔ اور جن جانوروں کا گوشت کھانا حرام ہے اور وہ لوگوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں انھیں بھی قتل کرنا حرام نہیں، مثلاً: شیر، چیتا وغیرہ۔ اسی طرح اپنے مال و جان کی حفاظت کے لیے حملہ آور جانور کو قتل کرنا جائز ہے۔

اگر کوئی محرم حالت احرام میں ممنوعات میں سے کسی چیز کو کرنے میں مجبور ہو تو وہ کام کر لے لیکن فدیہ ادا کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾

''پھر تم میں سے جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (جس کی وجہ سے وہ سر منڈا لے) تو اس پر فدیہ ہے، خواہ روزے رکھ لے، خواہ صدقہ دے دے، خواہ قربانی کر لے۔''[4]

⑦ نکاح کرنا: محرم نہ خود کسی عورت سے نکاح کرے اور نہ ولی اور وکیل بن کر کسی کا نکاح کرے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ وَلَا يُنْكِحُ» ''محرم نہ خود نکاح کرے اور نہ کسی دوسرے کا نکاح کرائے۔''[5]

⑧ جماع کرنا: محرم کے لیے حالت احرام میں اپنی بیوی سے جماع کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ﴾

---

① المآئدة 5:95. ② المآئدة 5:96. ③ المآئدة 5:96. ④ البقرة 2:196. ⑤ صحيح مسلم، النكاح، باب تحريم نكاح المحرم وكراهة خطبته، حديث :1409.

”چنانچہ جس شخص نے ان (مہینوں) میں حج کو لازم کر لیا تو حج کے دوران میں وہ جنسی باتیں نہ کرے۔“[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿ رَفَثَ ﴾ سے مراد ”جماع“ ہے۔ جس شخص نے دس ذوالحجہ کو طواف افاضہ (طواف زیارت) سے پہلے پہلے جماع کر لیا تو اس کا حج فاسد ہو گیا۔ وہ حج کے بقیہ ارکان کی ادائیگی جاری رکھے اور آئندہ سال اس حج کی قضا دے اور ایک جانور ذبح کرے۔ اگر محرم نے دس ذوالحجہ کو طواف زیارت کے بعد جماع کیا تو اس کا حج فاسد نہ ہو گا بلکہ وہ ایک بکری بطور فدیہ ذبح کرے۔

⑨ مباشرت کرنا: جماع کے علاوہ بصورت شہوت معانقہ، بوس و کنار کرنا درست نہیں کیونکہ یہ چیزیں جماع کا سبب ہیں۔ مُحرم پر واجب ہے کہ وہ جماع، نافرمانی اور لڑائی کے کاموں سے اجتناب کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾

”چنانچہ جس شخص نے ان (مہینوں) میں حج کو لازم کر لیا تو حج کے دوران میں وہ جنسی باتیں نہ کرے، اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور کسی سے جھگڑا نہ کرے۔“[2]

آیت میں مذکور لفظ ﴿ رَفَثَ ﴾ سے مراد جماع یا جماع کے اسباب ہیں، مثلاً: مباشرت، بوس و کنار اور جماع کی باتیں کرنا وغیرہ اور ﴿ فُسُوقَ ﴾ سے مراد معصیت کے جملہ کام ہیں جو خاص طور پر حالت احرام میں بہت قبیح اور شدید ہیں کیونکہ محرم اطاعت و انکسار کی حالت میں ہوتا ہے۔ ﴿ جِدَالَ ﴾ سے مراد ساتھیوں کے ساتھ بے مقصد بحث و تکرار حتی کہ گالی گلوچ کرنا ہے، البتہ حق بات کی وضاحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر بحث و تکرار مستحسن ہے بلکہ اس کا تو حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ ”اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجیے۔“[3]

محرم کے لیے مسنون یہ ہے کہ وہ غیر مفید، بے مقصد اور دنیوی کلام کم از کم کرے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ»

”جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اچھی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔“[4]

① البقرة 2:197. ② البقرة 2:197. ③ النحل 16:125. ④ صحيح البخاري، الأدب، باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره، حديث: 6019,6018، و صحيح مسلم، الإيمان، باب الحث على إكرام الجار والضيف......، حديث: 47.

نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»

''آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ بے مقصد باتیں چھوڑ دے۔''[1]

◄ محرم تلبیہ، ذکر الٰہی، تلاوت قرآن، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھے اور وقت کو ضائع ہونے سے بچائے۔ رضائے الٰہی کے حصول میں مگن رہے، اجر و ثواب کا شوق رکھے، نیت خالص رکھے کیونکہ وہ احرام کی حالت میں ہے اور عظیم عبادت کی ادائیگی کے لیے اور مقدس و بابرکت مقامات کی زیارت کے لیے نکلا ہے۔

حج تمتع کا مختصر طریقہ: جب وہ مکہ مکرمہ پہنچ جائے تو اگر اس نے حج تمتع کی نیت کی ہے تو وہ عمرہ ادا کرے، یعنی بیت اللہ کے سات چکر لگائے، مقام ابراہیم پر دو رکعتیں ادا کرے، ممکن ہو تو مقام ابراہیم کے پیچھے اور قریب کھڑا ہو ورنہ مسجد حرام کی کوئی بھی جگہ درست ہے۔ پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے لیے جائے اور وہاں سات چکر لگائے۔ صفا سے شروع کرے اور آخری چکر مروہ پر ختم کرے۔ صفا سے مروہ تک جانے سے ایک چکر اور مروہ سے واپس آنے سے دوسرا چکر شمار ہوگا۔ طواف و سعی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور دعا جاری رکھے۔ سعی کے آخری چکر کے بعد مرد سر کے تمام بال کتروائے جبکہ عورت اپنے سر کی چوٹی سے ایک پور بال کاٹ لے۔

حجامت کے بعد (عمرہ کرنے والا) حالت احرام سے آزاد ہو گیا ہے۔ اب اس کے لیے وہ تمام کام جائز ہیں جو حالت احرام میں منع تھے، مثلاً: جماع کرنا، خوشبو لگانا، سلا ہوا لباس پہننا، ناخن تراشنا، مونچھیں کاٹنا اور بغلوں کے بال اکھاڑنا وغیرہ۔ اب وہ آٹھ ذوالحجہ تک حالت احرام سے آزاد ہی رہے گا، پھر آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ کر منیٰ کی جانب جائے۔ اس کی تفصیل اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حج قران کا مختصر طریقہ: جو شخص حج قران یا حج افراد کی نیت کر کے مکہ میں آیا ہو وہ طواف قدوم کرے اور اگر چاہے تو حج کی سعی سے بھی فارغ ہو جائے (تاکہ دس ذوالحجہ کو رش سے بچ جائے) اور وہ یوم النحر تک حالت احرام ہی میں رہے گا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یوم الترویہ اور یوم عرفہ کے کام

◄ میقات پر پہنچنے والا شخص حج کی تین اقسام میں سے کسی ایک قسم کا ارادہ کر کے احرام کی نیت کرے۔ حج کی تینوں

[1] جامع الترمذي، الزهد، باب حديث من حسن إسلام المرء......، حديث: 2317، ومسند أحمد: 201/1.

اقسام یہ ہیں:

حجِ اِفراد اس میں حاجی صرف حج کا احرام باندھتا ہے اور دس ذوالحجہ کو جمرات کی رمی تک وہ احرام ہی کی حالت میں رہے گا، دس ذوالحجہ کو سر منڈوائے گا، طواف افاضہ کرے گا اور صفا و مروہ کی سعی کرے گا اگر اس نے طواف قدوم کے ساتھ سعی نہ کی ہو۔

حجِ قِران اس میں حاجی حج اور عمرے کا احرام اکٹھا باندھتا ہے۔ اس میں باقی کام حجِ اِفراد والے ہی ہیں سوائے ہدی (قربانی) کے کہ وہ واجب ہوتی ہے۔

حجِ تمتع اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے حاجی میقات سے عمرے کا احرام باندھے، مکہ پہنچ کر طواف اور سعی کرے اور بال کٹوا کر حلال ہو جائے اور یوم الترویہ تک حلال رہے، پھر یوم الترویہ کو حج کا احرام باندھے۔ (حج تمتع میں بھی قربانی واجب ہے اور سعی حج افراد کی طرح ہے، یعنی سعی دو بار کرے گا۔)

حج کی تینوں اقسام میں سے حج تمتع افضل قسم ہے، حج افراد یا حجِ قران والا جو اپنے ساتھ قربانی نہیں لایا، اپنے حج کی نیت کو بدل کر حج تمتع کر سکتا ہے اور باقی اعمال وہ حج تمتع والے کی طرح کرے گا۔

◪ مکہ مکرمہ سے باہر یا اس کے قرب و جوار میں رہنے والا شخص (جس نے حج افراد یا قران کی نیت کی ہو) اپنی نیت بدل کر حج تمتع کر سکتا ہے۔ ایسا شخص عمرے سے فارغ ہو کر حالت احرام ختم کر دے، پھر یوم الترویہ، یعنی آٹھ ذوالحجہ کو حج کے لیے احرام باندھے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«فَحَلَّ النَّاسُ كُلُّهُمْ وَقَصَّرُوا، إِلَّا النَّبِيَّ ﷺ وَمَنْ كَانَ مَعَهُ هَدْيٌ، فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى مِنًى، فَأَهَلُّوا بِالْحَجِّ»

''سب نے احرام کھول دیے اور حجامت بنوالی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جو شخص قربانی لے کر آیا تھا انھوں نے حالت احرام کو قائم رکھا۔ جب یوم الترویہ آیا تو انھوں نے حج کا احرام باندھا اور منٰی کی جانب رواں دواں ہو گئے۔''[1]

◪ آٹھ ذوالحجہ کو حج کے لیے احرام اپنی رہائش گاہ ہی سے باندھا جائے۔ مکہ شہر میں رہائش ہو یا اس کے قرب و جوار میں ہو یا منٰی میں ہو۔ احرام باندھ کر (منٰی جانے سے پہلے) فوراً طواف کرنے کی ضرورت نہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب آٹھ ذوالحجہ ہو تو حاجی احرام باندھ لے اور وہی کام کرے جو

[1] صحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، حديث: 1218.

میقات پر کیے تھے۔ اگر چاہے تو مکہ سے احرام باندھ لے اور اگر چاہے تو مکہ سے باہر جا کر احرام باندھے۔ اور بات یہی درست ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بطحا سے احرام باندھا تھا جیسا کہ آپ نے انھیں حکم دیا تھا۔ سنت یہی ہے کہ جہاں کوئی ٹھہرا ہوا ہے وہیں سے احرام باندھے۔ اسی طرح اہل مکہ اپنی رہائش گاہوں سے احرام باندھیں گے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''جو مکہ شہر سے باہر رہتا ہے وہ اپنی رہائش گاہ سے احرام باندھے حتی کہ مکہ والے مکہ سے احرام باندھیں۔''[1] ابن قیم رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔[2]

▲ احرام باندھنے کے بعد تلبیہ کہنے میں خود کو مشغول رکھے۔ وقتاً فوقتاً آواز بلند تلبیہ کہتا رہے اور عید کے روز جمرۂ عقبہ کی رمی تک تلبیہ جاری رکھے۔

▲ آٹھ تاریخ کو منیٰ پہنچ جائے۔ افضل یہ ہے کہ زوال آفتاب سے پہلے پہلے منیٰ کی طرف نکل جائے اور وہاں ظہر کی نماز ادا کرے اور باقی نمازیں اگلے دن کی فجر تک وہیں ادا کرے اور نو ذوالحجہ کی رات بھی منیٰ میں گزارے۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

«... وَرَكِبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَصَلَّى بِهَا الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ، ثُمَّ مَكَثَ قَلِيلاً حَتَّى طَلَعَتِ الشَّمْسُ»

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بھی) سوار ہو کر منیٰ پہنچ گئے اور وہاں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور اگلے دن کی فجر کی نماز ادا کی، پھر تھوڑی دیر اور ٹھہرے حتی کہ سورج طلوع ہو گیا۔''[3]

آٹھ تاریخ سے پہلے یا بعد میں احرام باندھ لینا بھی جائز ہے۔ منیٰ میں نو ذوالحجہ کی رات گزارنا اور وہاں پانچ نمازیں ادا کرنا سنت ہے واجب نہیں۔

▲ نو ذوالحجہ کو طلوع آفتاب کے بعد منیٰ سے عرفات کی جانب چلیں۔ عرفہ کا سارا میدان ٹھہرنے کی جگہ ہے سوائے وادی عُرنہ کے۔ حاجی عرفات میں جس مقام پر بھی کھڑا ہو جائے، درست ہے۔

واضح رہے حکومت سعودیہ نے عرفہ کے میدان کی حد بندی علامات اور تحریروں کے ساتھ کر دی ہے جو شخص وہاں چلا گیا اسے چاہیے کہ ان حدود کا خیال رکھے تا کہ اس کا ''وقوف عرفہ'' رہ نہ جائے۔

▲ جب سورج ڈھل جائے تو لوگ ظہر اور عصر کو ملا کر ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ قصر کر کے نمازیں ادا کریں۔ عرفہ، مزدلفہ اور منیٰ میں چار رکعتوں والی نماز قصر کی جائے گی، البتہ عرفہ اور مزدلفہ میں نمازیں جمع اور قصر

① مجموع الفتاوی: 26/128، 129. ② زاد المعاد: 2/233. ③ صحیح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، حدیث: 1218.

کریں جبکہ منیٰ میں جمع نہ کریں صرف قصر کریں اور ہر نماز وقت پر ادا کریں کیونکہ یہاں جمع کی ضرورت نہیں۔

▲ جب حجاج کرام عرفہ میں ظہر کے وقت ظہر اور عصر کی نمازیں قصر اور جمع کر کے ادا کر لیں تو پھر میدان عرفات میں داخل ہو کر ذکر و دعا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانے میں مصروف ہو جائیں۔ ضروری نہیں کہ وہ جبل رحمت کے قریب ہوں یا اسے دیکھتے ہوں یا دعا میں اسے سامنے رکھیں بلکہ کعبہ کی طرف رخ کرنا چاہیے۔[1]

▲ میدان عرفات میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ دعا، تضرع اور توبہ کرنے میں مشغول رکھیں۔ مسلسل اسی حالت میں رہیں۔ اس موقع پر سوار، پیدل، چلتے، رکتے وقت، اٹھتے یا لیٹتے ہوئے دعا کریں۔ واضح رہے اس موقع پر ماثور اور مسنون دعائیں کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«خَيْرُ الدُّعَاءِ دُعَاءُ يَوْمِ عَرَفَةَ، وَخَيْرُ مَا قُلْتُ أَنَا وَالنَّبِيُّونَ مِنْ قَبْلِي : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»

"سب سے افضل دعا یوم عرفہ کی دعا ہے اور سب سے افضل بات وہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے کہی، وہ ہے:[لا إله ......] اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہی (تمام اختیارات) اسی کے ہے اور ہر طرح کی حمد (وثنا) بھی اس کی ہے اور وہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔"[2]

▲ غروب آفتاب تک ذکر و دعا میں مصروف رہیں۔ غروب آفتاب سے قبل میدان عرفہ کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اگر کوئی اس میدان سے باہر نکل جائے تو اسے فوراً واپس آ جانا چاہیے ورنہ ایک سالم بکری کا فدیہ واجب ہوگا جسے ذبح کر کے حرم کے مساکین میں تقسیم کیا جائے گا یا پھر گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ بطور فدیہ قربانی دینا ہوگا۔[3]

▲ وقوفِ عرفہ کا وقت (صحیح قول کے مطابق) زوال آفتاب سے لے کر دس ذوالحجہ کی ساری رات، یعنی طلوع فجر تک ہے۔ جس نے دن کے وقت وقوف کیا اس پر واجب ہے کہ وہ غروب آفتاب تک وہاں رہے، البتہ جس نے رات کے وقت وقوف کیا تو اسے وہ کافی ہوگا اگرچہ ایک لحہ ہی کیوں نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ لَيْلَةَ جَمْعٍ قَبْلَ أَنْ يُصَلِّيَ الصُّبْحَ فَقَدْ أَدْرَكَ الْحَجَّ»

---

[1] جبل رحمت کے قریب ہونا اور اس کی جانب منہ کرنا مسنون ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے میدان عرفہ میں وقوف کیا تو جبل رحمت کے قریب ہوئے اور ذکر و دعا کے وقت اسے اور کعبہ کو سامنے رکھا تھا۔ (صارم)

[2] جامع الترمذي، الدعوات، باب في دعاء يوم عرفة، حديث : 3585. [3] دیکھیے المغني والشرح الكبير : 442,441/3.

"جس نے رات کے کسی حصہ میں مزدلفہ میں صبح کی نماز سے پہلے پہلے وقوف کرلیا اس نے حج پالیا۔"[1]

▲ وقوفِ عرفہ حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے بلکہ سب سے بڑا رکن ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

«اَلْحَجُّ عَرَفَةُ» "حج عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے۔"[2]

مقام وقوف وہ سارا میدان عرفہ ہے جس کی حد بندی کر دی گئی ہے، چنانچہ جو اس سے باہر رہا اس کا حج نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان اعمال واقوال کی توفیق دے جو اسے پسند ہوں۔

مزدلفہ کی طرف روانگی اور وہاں رات گزارنا منیٰ کی طرف روانگی اور عید کے دن کے کام

حجاج کرام غروب آفتاب کے بعد عرفہ سے مزدلفہ کی طرف سکون و وقار کے ساتھ روانہ ہو جائیں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيلاً حَتَّى غَابَ الْقُرْصُ، وَأَرْدَفَ أُسَامَةَ خَلْفَهُ، وَدَفَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَقَدْ شَنَقَ لِلْقَصْوَاءِ الزِّمَامَ حَتَّى إِنَّ رَأْسَهَا لَيُصِيبُ مَوْرِكَ رَحْلِهِ وَيَقُولُ بِيَدِهِ الْيُمْنَى: أَيُّهَا النَّاسُ! السَّكِينَةَ السَّكِينَةَ»

"رسول اللہ ﷺ نے عرفہ میں وقوف کیا حتی کہ آفتاب غروب ہو گیا اور تھوڑی سی زردی چلی گئی، پھر سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو اپنے پیچھے سواری پر سوار کیا اور مزدلفہ کی طرف چل پڑے۔ آپ ﷺ نے اپنی اونٹنی قصواء کی لگام اس قدر کھینچی ہوئی تھی کہ اس کا سر کجاوے کے ساتھ لگ رہا تھا اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اشارہ کر کے فرما رہے تھے: لوگو! اطمینان کے ساتھ چلو، اطمینان کے ساتھ چلو۔"[3]

اس روایت کی روشنی میں حجاج کرام کو چاہیے کہ سکون و وقار کے ساتھ اور ہر ایک سے اچھا برتاؤ کرتے ہوئے میدان عرفات سے مزدلفہ کی جانب چلیں۔ چلتے وقت اپنے بھائیوں پر کوئی تنگی و مشکل نہ ڈالیں، رش اور بھیڑ پیدا نہ

① سنن النسائي، المناسك، باب فرض الوقوف بعرفة، حديث: 3019، ومسند أحمد: 309/4 واللفظ له. ② سنن النسائي، المناسك، باب الوقوف بعرفة، حديث: 3019، ومسند أحمد: 309/4. ③ صحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ، حديث: 1218.

کریں، اپنی گاڑیوں کے ذریعے سے لوگوں کو خوف و پریشانی میں مبتلا نہ کریں۔ کمزور، عمر رسیدہ اور پیدل چلنے والوں کا خاص خیال رکھیں۔

◄ ہر حاجی کو چاہیے کہ وہ عرفات سے مزدلفہ کی طرف جاتے وقت خود کو ذکر و استغفار میں مشغول رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''پھر تم اس جگہ سے لوٹو جس جگہ سے سب لوگ لوٹتے ہیں اور اللہ سے طلبِ بخشش کرتے رہو، یقیناً اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔''[1]

مزدلفہ کا معنیٰ ''قریب'' ہے۔ حجاج کرام عرفات سے واپسی پر یہاں آ کر منیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں، اس وجہ سے اس میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں۔ اس مقام کو لوگوں کے جمع ہونے کی وجہ سے جَمْعٌ بھی کہتے ہیں، نیز اس جگہ کو ''مشعر حرام'' بھی کہا جاتا ہے۔[2]

◄ جب حاجی مزدلفہ پہنچ جائے تو وہاں مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں جمع کرے اور انھیں ایک اذان اور دو تکبیروں کے ساتھ قصر کر کے ادا کرے، یعنی پہلے مغرب اور پھر عشاء کی نماز کجاوے اتارنے سے قبل ادا کرے جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ آئے اور مغرب و عشاء کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا کیں۔''[3]

◄ پھر مزدلفہ میں رات گزارے حتی کہ صبح کو وہاں فجر کی نماز ادا کرے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

«ثُمَّ اضْطَجَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ حَتَّى طَلَعَ الْفَجْرُ، فَصَلَّى الْفَجْرَ حِينَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ بِأَذَانٍ وَّإِقَامَةٍ»

''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم (مغرب اور عشا کی نماز پڑھ کر) لیٹ گئے حتی کہ فجر طلوع ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اذان و اقامت کے ساتھ نماز فجر ادا کی۔''[4]

جیسا کہ ابھی گزر چکا کہ مزدلفہ کو ''مشعر حرام'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ میدان عرفات اور بطنِ مُحَسِّر کے درمیان واقع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«وَكُلُّ الْمُزْدَلِفَةِ مَوْقِفٌ، وَارْفَعُوا عَنْ بَطْنِ مُحَسِّرٍ»

---

① البقرة 2:199. ② المغني والشرح الكبير :450/3. ③ صحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ ، حديث : 1218. ④ صحيح مسلم، الحج، باب حجة النبي ﷺ ، حديث : 1218.

''مزدلفہ کی ساری جگہ ٹھہرنے کے لیے ہے، البتہ وادی مُحَسِّر میں نہ ٹھہرو۔''①

▲ مسنون یہ ہے کہ حاجی مزدلفہ میں رات گزارے۔ جب فجر طلوع ہو جائے تو وہاں اول وقت میں نماز فجر ادا کرے، پھر کافی روشنی ہونے تک ذکر و دعا میں مشغول رہے، پھر طلوع آفتاب سے پہلے ہی منیٰ کی طرف روانہ ہو جائے۔

▲ کمزور افراد، یعنی عورتوں اور بچوں وغیرہ کے لیے جائز ہے کہ وہ (دسویں رات کا) چاند غروب ہونے کے بعد مزدلفہ سے منیٰ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اسی طرح جو حضرات باہمت ہیں لیکن ان کو کمزور افراد کی ذمہ داری سونپی گئی ہے وہ بھی نصف رات کے بعد ان کمزور افراد کے ساتھ مزدلفہ سے روانہ ہو سکتے ہیں، البتہ جن کے ساتھ کمزور افراد نہ ہوں وہ طلوع فجر سے پہلے روانہ نہ ہوں بلکہ فجر کی نماز مزدلفہ میں ادا کریں اور صبح روشن ہونے تک وہیں ٹھہرے رہیں۔

▲ مزدلفہ میں رات گزارنا حج کے واجبات میں سے ایک اہم واجب ہے، چنانچہ جو شخص نصف رات سے پہلے وہاں پہنچ جائے اس کے لیے وقوف مزدلفہ ترک کرنا جائز نہیں۔ اور جو شخص نصف رات کے بعد وہاں پہنچے تو وہ بھی وہاں رک جائے اگرچہ اس کا وقوف چند لمحات ہی کیوں نہ ہو۔ اسے چاہیے کہ طلوع فجر تک وہاں رہے حتی کہ نماز فجر ادا کرے اور پھر دعا میں مشغول ہو جائے۔

(امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے) مغنی میں لکھا ہے: ''جو شخص نصف رات کے بعد مزدلفہ میں پہنچا اس پر کچھ فدیہ نہیں اگرچہ اس نے رات کے نصف اول کا کوئی حصہ نہیں پایا، اس لیے وہ واجب کے ترک کا مرتکب قرار نہیں پائے گا۔''②

▲ اگر معذور افراد مزدلفہ میں رات نہ گزاریں تو ان کے لیے جائز ہے، مثلاً: ایسا مریض جسے ہسپتال پہنچانے کی ضرورت ہو یا جس کسی نے مریض کی تیمارداری کرنی ہو یا جس نے جانوروں کو پانی پلانا یا انھیں چرانا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے چرواہوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اونٹ چرانے کی وجہ سے مزدلفہ میں رات نہ گزاریں۔

▲ طلوع آفتاب سے پہلے پہلے حاجی منی کی جانب روانہ ہو جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عہد جاہلیت میں لوگ مزدلفہ سے اس وقت روانہ ہوتے جب سورج طلوع ہو جاتا اور کہا کرتے تھے:

«أَشْرِقْ ثَبِيرُ! كَيْمَا نُغِيرُ، وَكَانُوا لَا يُفِيضُونَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، فَخَالَفَهُمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَأَفَاضَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ»

① سنن ابن ماجه، المناسك، باب الموقف بعرفات، حديث: 3012. ② المغني والشرح الكبير: 452/3.

''اے ثبیر پہاڑ! روشن ہو جا تا کہ ہم (منیٰ کی طرف) پلٹیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کی مخالفت کرتے ہوئے طلوع آفتاب سے پہلے ہی منیٰ کی جانب روانہ ہو گئے۔''[1]

▲ مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے سکون و اطمینان اور وقار کو ملحوظ رکھے۔ جب وادی محسر میں پہنچے تو تیزی سے چلے۔

▲ منیٰ پہنچنے سے پہلے جمرات کی رمی کے لیے اگر حاجی راستے ہی سے کنکریاں اٹھا لے تو بہتر ہے۔ اگر مزدلفہ یا منیٰ یا کسی اور جگہ سے کنکریاں لے لے تو بھی جائز ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

«قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ غَدَاةَ الْعَقَبَةِ وَهُوَ عَلٰى نَاقَتِهِ: اُلْقُطْ لِي حَصًى، فَلَقَطْتُّ لَهُ سَبْعَ حَصَيَاتٍ هُنَّ حَصَى الْخَذْفِ فَجَعَلَ يَنْفُضُهُنَّ فِي كَفِّهِ وَيَقُولُ: أَمْثَالُ هٰؤُلَاءِ فَارْمُوا، ثُمَّ قَالَ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ! إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ»

''رسول اللہ نے دس ذوالحجہ کی صبح کو سواری پر بیٹھے بیٹھے مجھے فرمایا: ''مجھے کنکریاں چن دو۔'' تب میں نے سات کنکریاں چن دیں جو انگلیوں کے پوروں میں آسکتی تھیں۔ آپ ﷺ انھیں ہاتھ میں لے کر حرکت دے رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ ایسی ہی کنکریاں مارو، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! دین میں غلو کرنے سے بچو، بے شک پہلے لوگوں کو دین میں غلو نے تباہ کر دیا تھا۔''[2]

لہٰذا کنکری کا حجم لوبیے کے برابر چنے کے دانے سے ذرا بڑا ہونا چاہیے۔

▲ کنکریوں کے بغیر کسی اور چیز سے رمی جائز نہیں اور نہ بڑے بڑے پتھر استعمال کیے جائیں کیونکہ نبی ﷺ نے چھوٹے چھوٹے پتھر (کنکریاں) استعمال کیے تھے۔ اور فرمایا:

«لِتَأْخُذُوا مَنَاسِكَكُمْ» ''مجھ سے احکام حج سیکھو۔''[3]

▲ جب حاجی منیٰ میں پہنچ جائے اور جمرۂ عقبہ، جو آخری اور مکہ کی طرف ہے، جسے بڑا جمرہ بھی کہا جاتا ہے، کے قریب ہو جائے تو اسے طلوع آفتاب کے بعد ایک ایک کر کے سات کنکریاں مارے۔ اس جمرے کو کنکریاں مارنے

---

[1] صحيح البخاري، الحج، باب متى يدفع من جمع، حديث :1684 بدون لفظ : كَيْمَا نُغِيرُ، وسنن ابن ماجه، المناسك، باب الوقوف بجمع، حديث : 3022 واللفظ له. [2] سنن النسائي، المناسك ، باب التقاط الحصى، حديث: 3059، وسنن ابن ماجه، المناسك ، باب قدر حصى الرمي، حديث : 3029 واللفظ له. [3] صحيح مسلم، الحج، باب استحباب رمي جمرة العقبة يوم النحر راكباً ...... ، حديث : 1297.

کا آخری وقت غروب آفتاب ہے۔[1]

▲ ہر کنکری کا جمرہ کے حوض میں گرنا ضروری ہے، پھر وہ حوض میں رہے یا حوض میں پڑ کر باہر گر جائے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یاد رہے کنکریاں مارنے کا اصل مقام حوض ہے وہ بلند ستون نہیں جو دور سے نظر آتا ہے۔ ستون تو ایک علامت ہے جو دور سے کنکریاں مارنے والوں کی سہولت کی خاطر مقرر کی گئی ہے۔ بنا بریں حاجی کو چاہیے کہ وہ ستون کو نشانہ بنانے کے بجائے جمرہ کے حوض میں کنکری پھینکنے کی کوشش کرے کیونکہ یہی رمی کا محل و مقام ہے۔ اگر کسی نے جمرہ کے ستون کو نشانہ بنا کر کنکری ماری لیکن وہ حوض کے اوپر سے نہ گزری بلکہ ادھر ادھر نکل گئی تو وہ شمار نہ ہوگی۔[2]

▲ کمزور اور معذور افراد آدھی رات کے بعد کنکریاں مار سکتے ہیں۔ اگر کمزوروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی نصف رات کے بعد کنکریاں مار لیں گے تو جائز ہے لیکن افضل نہیں۔[3]

▲ مسنون یہی ہے کہ منیٰ پہنچتے ہی کوئی اور کام کیے بغیر سب سے پہلے جمرۂ عقبہ کو کنکریاں ماری جائیں یہ کام ''تحیۂ منیٰ'' ہے۔

▲ ہر کنکری پھینکتے وقت اللہ اکبر کہے اور ساتھ یہ کلمات کہے: اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْهُ حَجًّا مَّبْرُورًا وَّذَنْبًا مَّغْفُورًا ''اے اللہ اس حج کو مقبول بنا اور گناہ معاف کر دے۔''[4] یوم النحر، یعنی دس ذوالحجہ کو صرف جمرۂ عقبہ ہی کو کنکریاں ماری جائیں۔

▲ جمرۂ عقبہ کی رمی کے بعد قربانی کرے۔ اگر وہ متمتع یا قارن ہے تو اس پر قربانی کرنا واجب ہے ورنہ مستحب ہے۔ وہ قربانی خریدے، اسے خود ذبح کرے، اس کا گوشت تقسیم کرے اور اس کا کچھ حصہ اپنے لیے بھی رکھ لے۔

▲ پھر سر منڈوائے یا بال کٹوائے، البتہ منڈانا افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

---

① صحیح بخاری کی روایت کے مطابق دس ذوالحجہ کے دن جمرۂ عقبہ کو کنکریاں مارنے کا افضل وقت طلوع آفتاب سے لے کر زوال آفتاب تک ہے۔ (صارم)

② شدید رش کی وجہ سے ہر ایک شخص کی کنکری کا جمرہ کے حوض میں گرنا مشکل ہے، اس لیے کوشش کے باوجود اگر کنکری حوض میں نہ گر سکی تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ قبول کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (صارم)

③ آپ ﷺ نے کمزور افراد کو رات کے وقت مزدلفہ سے منیٰ کی جانب روانہ کر دیا تھا لیکن انھیں حکم دیا تھا کہ طلوع آفتاب کے بعد کنکریاں ماریں۔ سنن أبي داود، المناسك، باب التعجيل من جمع، حديث :1940، 1941.

④ یہ کلمات حضرت عبداللہ بن عمر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں۔ مسند أحمد: 427، والدعاء للطبراني، حديث: 881. (صارم)

﴿مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ﴾

''(اگر اللہ نے چاہا تو تم یقیناً پورے امن وامان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے) سر منڈواتے ہوئے اور سر کے بال کترواتے ہوئے......''[1]

میں سر منڈانے کا ذکر پہلے ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے:

«حَلَقَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي حَجَّتِهِ» ''آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سر مبارک کو منڈایا تھا۔''[2]

نیز ''آپ ﷺ نے سر منڈانے والوں کے حق میں تین بار دعائے رحمت فرمائی ہے بال کٹوانے والوں کے لیے ایک بار دعا کی۔''[3]

جو شخص بال کٹوائے وہ سارے سر سے کٹوائے، سر کے کچھ حصے یا ایک جانب کے بال کٹوانا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ﴾

میں سارے سر کا ذکر ہے۔[4]

عورت کے لیے بال کاٹنا ہی ضروری ہے، منڈانا جائز نہیں، یعنی وہ ایک پور کے برابر بال کاٹ لے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ الْحَلْقُ إِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ»

''عورتوں کے لیے سر منڈانا نہیں بلکہ ان پر بال کٹانا لازم ہے۔''[5]

بال مونڈنے یا کٹوانے کے ساتھ ساتھ مسنون یہ ہے کہ وہ ناخن اور مونچھیں کاٹے، بغلوں اور زیر ناف بالوں کو صاف کرے، البتہ داڑھی مونڈنا یا اسے کاٹنا جائز نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے اور اسے مونڈنے یا کترانے سے منع کیا ہے۔[6] بنا بریں ایک مسلمان کو رسول اللہ ﷺ کے حکم کی اطاعت کرنی چاہیے اور جس سے روکا جائے اس سے رک جانا چاہیے۔ حاجی تو عبادت میں مصروف ہوتا ہے، لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ کے احکام کی زیادہ پابندی کرنی چاہیے۔

[1] الفتح 27:48. [2] صحيح البخاري، الحج، باب الحلق والتقصير عند الإحلال، حديث: 1726، وصحيح مسلم، الحج، باب تفضيل الحلق على التقصير و جواز التقصير، حديث: 1304. [3] صحيح مسلم، الحج، باب تفضيل الحلق على التقصير و جواز التقصير، حديث: 1303. [4] الفتح 27:48. [5] سنن أبي داود، المناسك، باب الحلق و التقصير، حديث: 1984، وسنن الدارقطني: 239/2، حديث: 2640. [6] صحيح البخاري، اللباس، باب إعفاء اللحي، حديث: 5893.

▲ جس شخص کے سر کے بال پہلے ہی مونڈے ہوئے ہوں یا اس کے سر پر بال اگے ہی نہ ہوں (گنجا ہو) تو وہ اپنے سر پر استرا ضرور پھیرے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»

''جب میں تمھیں کوئی حکم دوں تو حسب طاقت اس پر عمل کرو۔''①

▲ جمرۂ عقبہ کی رمی اور حجامت کے بعد حاجی کے لیے بیوی سے جماع کرنے کے سوا ہر چیز، یعنی خوشبو اور عام لباس وغیرہ کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

«إِذَا رَمَيْتُمْ وَحَلَقْتُمْ فَقَدْ حَلَّ لَكُمُ الطِّيبُ وَالثِّيَابُ وَكُلُّ شَيْءٍ إِلَّا النِّسَاءُ»

''جب تم نے رمی کر لی اور سر مونڈ لیا تو تمھارے لیے خوشبو اور عام لباس کا استعمال بلکہ ہر شے جائز ہوگی، سوائے عورتوں کے۔''②

ایک اور روایت میں یوں ہے:

«كُنْتُ أُطَيِّبُ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ وَيَوْمَ النَّحْرِ قَبْلَ أَنْ يَّطُوفَ بِالْبَيْتِ بِطِيبٍ فِيهِ مِسْكٌ»

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو ان کے احرام باندھنے سے پہلے اور یوم النحر کو بیت اللہ کا طواف کرنے سے پہلے ایسی خوشبو لگائی تھی جس میں کستوری تھی۔''③

یہ پہلا تحلل ہے جو تین چیزوں میں سے دو کو ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، یعنی جمرۂ عقبہ کی رمی کرنے سے، حجامت بنوانے سے اور طواف افاضہ اور اس کے بعد سعی کرنے سے جس پر سعی واجب ہے۔ جب حاجی مذکورہ تینوں کام کر لے گا تو اسے تحلل کامل حاصل ہو جائے گا، یعنی بیوی سے جماع کرنا بھی جائز ہوگا۔

▲ جمرۂ عقبہ کی رمی، قربانی اور حجامت (ان کاموں) سے فارغ ہو کر طواف افاضہ کے لیے حاجی مکہ مکرمہ روانہ ہو جائے، اگر وہ متمتع ہے تو طواف کے بعد صفا و مروہ کی سعی کرے، اگر کوئی قارن یا مفرد ہے اور اس نے طواف

① صحيح البخاري، الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ، حديث: 7288، وصحيح مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، حديث: 1337. ② [ضعيف] سنن أبي داود، المناسك، باب في رمي الجمار، حديث: 1978، ومسند أحمد: 143/6 واللفظ له. اور شرح معاني الآثار کی روایت کے مطابق محرم جب صرف رمی کر لے تو اس کے لیے بیوی کے سوا باقی تمام کام حلال ہو جاتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے شرح معاني الآثار :2/228-230، ومناسك الحج والعمرة للألباني ص:33,32. ③ صحيح البخاري، الحج، باب الطيب عند الإحرام، وما يلبس إذا أراد أن يحرم......؟ حديث: 1539، وصحيح مسلم، الحج، باب استحباب الطيب قبيل الإحرام...... ، حديث: 1191 واللفظ له.

قدوم میں سعی نہیں کی تو وہ بھی سعی کرے۔ اور اگر ان دونوں (قارن اور مفرد) نے طواف قدوم کے ساتھ ہی سعی کرلی تھی تو اب سعی کی ضرورت نہیں صرف طواف افاضہ ہی پر اکتفا کریں۔

جمرۂ عقبہ کی رمی، قربانی، حجامت اور طواف وسعی یہ چار کام بالترتیب ادا کرنے مسنون ہیں، البتہ اگر ان کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہو جائے تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کسی بھی شے میں تقدیم و تاخیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے یہی فرمایا: [اِفْعَلْ وَ لَا حَرَجَ] ''اسی طرح کرلو کوئی حرج نہیں۔''[1]

البتہ ترتیب قائم رکھنا افضل ہے کیونکہ یہی مسنون ہے۔

بیت اللہ کے ارد گرد طواف کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ طواف کرنے والا حجر اسود سے ابتدا کرے، اس کے بالمقابل کھڑا ہو اور اسے چومے یا اسے ہاتھ سے چھوئے اگر ممکن ہو تو اسے اپنا دایاں ہاتھ لگائے اور ہاتھ کو بوسہ دے۔ اگر رش اور بھیڑ کی وجہ سے ہاتھ لگانا ممکن نہ ہو تو اپنے دائیں ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کرے۔ حجر اسود کے استلام (چومنے) کے وقت کسی کو دھکا یا تکلیف نہ پہنچائے۔ طواف میں بیت اللہ کو بائیں جانب رکھے اور پہلے چکر کی ابتدا کرے۔ دوران طواف میں ذکر و دعا اور تلاوت قرآن میں مشغول رہے۔ جب رکن یمانی کے پاس پہنچے تو اگر ممکن ہو تو اسے دائیں ہاتھ سے چھوئے، البتہ اس کا بوسہ نہ لے۔ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان یہ کلمات پڑھے:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○﴾

''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں عذاب جہنم سے نجات دے۔''[2]

جب حجر اسود کے پاس پہنچ جائے تو اس کا ایک چکر مکمل ہو گیا، پھر حجر اسود کا استلام یا اس کی طرف اشارہ کرکے دوسرا چکر شروع کرے۔ اسی طرح سات چکر مکمل کرے۔

طواف کی درستی کے لیے تیرہ شرائط ہیں جو درج ذیل ہیں:

① اسلام ② عقل ③ نیت ④ شرم گاہ کو ڈھانپنا ⑤ طہارت ⑥ سات چکر مکمل کرنا ⑦ طواف میں بیت اللہ کو

---

① صحيح البخاري، العلم، باب الفتيا وهو واقف على الدابة وغيرها، حديث: 83 وغيره من الكتب الستة. ② صحيح البخاري، التفسير، باب: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○﴾، حديث: 4522، وصحيح مسلم، الذكر، باب كراهة الدعاء بتعجيل العقوبة في الدنيا، حديث: 2688، وسنن أبي داود، المناسك، باب الدعاء في الطواف، حديث: 1892.

بائیں جانب رکھنا ⑧ سارے بیت اللہ کا چکر لگانا ⑨ حطیم میں داخل نہ ہونا ⑩ قدرت ہو تو پیدل طواف کرنا ⑪ سات چکر مسلسل لگانا (فرض نماز یا جنازہ ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں) ⑫ مسجد حرام کے اندر طواف کرنا ⑬ حجر اسود سے ابتدا اور انتہا کرنا۔

◄ بیت اللہ کا طواف مکمل کرنے کے بعد دو رکعتیں پڑھے، مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے ورنہ مسجد حرام میں جہاں بھی جگہ ملے وہاں ادا کرے۔ پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص پڑھے۔ واضح رہے کہ یہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔[1]

◄ پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور سب سے پہلے صفا پر چڑھے اور تین مرتبہ اللّٰہ أکبر کہے، پھر یہ کلمات پڑھے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ»

''نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر اللہ ہی، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لیے بادشاہی ہے اور اسی کے لیے ہر قسم کی تعریف ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔''[2]

پھر صفا سے اتر کر مروہ کی جانب چلے۔ سبز ستونوں کے درمیان دوڑے اور باقی جگہ پر معمول کے مطابق چلے حتی کہ مروہ پر پہنچ جائے۔ اب ایک چکر مکمل ہوا۔ مروہ پر چڑھ کر تکبیر و ذکر اور دعا کے وہی کلمات کہے جو صفا پر کہے تھے، پھر صفا کی طرف روانہ ہو جائے۔ دوڑنے کی جگہ پر دوڑے اور چلنے کی جگہ پر چلے۔ اسی طرح سات چکر مکمل کرے۔ واضح رہے کہ صفا سے ابتدا اور مروہ پر چکروں کی انتہا کرے۔ گویا صفا سے مروہ تک ایک چکر اور مروہ سے صفا تک دوسرا چکر شمار ہوگا۔

◄ طواف اور سعی کے دوران دعا، ذکر یا تلاوت قرآن جاری رکھے۔

اس موقع پر کوئی خاص دعا رسول اللہ ﷺ سے منقول نہیں جو بھی اذکار مسنونہ اور ادعیہ ماثورہ یا آیات قرآنیہ یاد ہوں، وہ پڑھ سکتا ہے۔

---

① طواف کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعتیں ادا کرنا فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰهِمَ مُصَلًّى﴾ (البقرة 125:2)

② الموطأ للإمام مالك: 343/1، حديث: 854.

- صفا و مروہ کی سعی کی درستی کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

نیت کرنا، صفا و مروہ کے درمیان سات چکر لگانا اور اس سے پہلے بیت اللہ کا طواف کرنا۔

ایام تشریق اور الوداعی طواف کے احکام

عید الاضحٰی کے روز طواف افاضہ کرنے کے بعد واپس منی میں پہنچ جائیں۔ منی میں رات گزارنا واجب ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی حاجی کو مکہ میں رات گزارنے کی اجازت نہیں دی تھی، البتہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو اس وجہ سے اجازت دی تھی کہ انھوں نے حجاج کرام کو پانی پلانا تھا۔''[1]

اگر حاجی کو جلدی نہ ہو تو وہ منیٰ میں تین راتیں گزارے۔ ذوالحجہ کی گیارہ اور بارہ تاریخ کی دو راتیں منیٰ میں گزارنا ضروری ہیں۔

- منیٰ میں ہر نماز اپنے اپنے وقت پر قصر کر کے ادا کریں۔
- ایام تشریق میں زوال کے بعد ہر روز تینوں جمرات کی رمی کریں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«رَمٰی رَسُولُ اللهِ ﷺ الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى، وَأَمَّا بَعْدُ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ»

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ذوالحجہ کو چاشت کے وقت رمی کی، باقی دنوں میں زوال آفتاب کے بعد رمی کی۔''[2]

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے: ''ہم رمی کے وقت کا انتظار کرتے، جب زوال آفتاب ہوتا تب ہم جمرات کی رمی کرتے۔''[3] نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«لِتَأْخُذُوا مَنَاسِكَكُمْ» ''(مجھ سے) حج کے احکام سیکھو۔''[4]

ایام تشریق میں رمی کا وقت آفتاب کے ڈھل جانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے رمی جائز نہیں۔ جس

---

① صحيح البخاري، الحج، باب سقاية الحاج، حديث: 1634، وسنن ابن ماجه، المناسك، باب البيتوتة بمكة ليالي منى، حديث: 3066 واللفظ له. ② صحيح البخاري، الحج، باب رمي الجمار، قبل حديث: 1746 معلقًا، وصحيح مسلم، الحج، باب بيان وقت استحباب الرمي، بعد حديث: 1299. ③ صحيح البخاري، الحج، باب رمي الجمار، حديث: 1746. ④ صحيح مسلم، الحج باب استحباب رمي جمرة العقبة يوم النحر راكبا ......، حديث: 1297.

طرح وقت سے پہلے (بلا عذر) نماز ادا کرنا جائز نہیں کیونکہ عبادات توقیفی ہیں، یعنی ان کی ادائیگی کے اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ رسول اللہ ﷺ کے رمی کرنے کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں: ''آپ ﷺ طواف افاضہ کرنے کے بعد اسی دن واپس منیٰ پہنچ گئے تھے، وہاں رات بسر کی، اگلا دن ہوا تو زوال آفتاب کا انتظار کرنے لگے۔ جب آفتاب ڈھل گیا تو اپنے خیمے سے پیدل چلے اور جمرۂ اولیٰ، جو مسجد خیف کے قریب ہے، کی طرف آئے۔ ایک ایک کر کے اسے سات کنکریاں ماریں۔ ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہتے، پھر آگے بڑھے، نشیب میں آئے۔ قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہاتھ اٹھا کر سورۂ بقرہ کے بقدر طویل دعا کی، پھر آپ ﷺ جمرۂ وسطیٰ پر پہنچے اسے بھی جمرۂ اولیٰ کی طرح سات کنکریاں ماریں، پھر بائیں جانب وادی کے قریب نشیب میں اترے۔ قبلہ رو ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی، پھر تیسرے جمرے (جمرۂ کبریٰ) کو سات کنکریاں ماریں۔ رمی کے وقت آپ ﷺ نے بیت اللہ کو بائیں جانب اور منیٰ کو دائیں جانب رکھا۔''[1]

موصوف آگے لکھتے ہیں: ''جب آپ نے تینوں جمرات کی رمی مکمل کر لی تو نہ تیسرے جمرے کے پاس ٹھہرے اور نہ دعا کی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ پہاڑ کی وجہ سے جگہ تنگ تھی یا اس میں یہ حکمت ہو کہ عموماً آپ ﷺ کی دعا کا موقع و محل عبادت کے اندر ہوتا تھا نہ کہ فراغت پر، چنانچہ جب جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماری گئیں تو آپ ﷺ رمی والی عبادت سے فارغ ہو گئے، اس لیے دعا نہ کی۔ اس کی مثال اسی طرح ہے جس طرح آپ ﷺ نماز کے اندر دعا مانگتے تھے، فراغت پر نہیں۔''[2] (یہ دوسری بات ہی درست معلوم ہوتی ہے۔)

- تینوں جمرات کو بالترتیب کنکریاں مارنا ضروری ہے، یعنی پہلے جمرۂ اولیٰ، پھر جمرۂ وسطیٰ اور پھر جمرۂ عقبہ، یعنی بڑے جمرے کی رمی کرے۔ ہر جمرے کو سات سات کنکریاں ماری جائیں۔
- مریض، عمر رسیدہ، حاملہ عورت یا ایسا کمزور شخص جسے ہجوم میں کچلے جانے کا خوف ہو اگر یہ حضرات جمرات کی رمی کے لیے کسی شخص کو نائب بنالیں جوان کی طرف سے کنکریاں مارے تو جائز ہے۔
- جب نائب جمرہ کے پاس جائے تو ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو کر پہلے اپنی، پھر دوسرے کی کنکریاں مارے، پھر دوسرے اور تیسرے جمرے پر اسی طرح کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلے تینوں جمرات کی رمی

[1] صحيح البخاري، الحج، باب إذا رمى الجمرتين يقوم مستقبل القبلة ويُسهِل وباب الدعاء عندالجمرتين، حديث: 1751-1753، وصحيح مسلم، الحج، باب رمي جمرة العقبة من بطن الوادي ......، حديث : 1296، وزاد المعاد: 285/2. [2] زاد المعاد :286/2.

اپنی طرف سے کرے، پھر دوسرے شخص کی طرف سے رمی کرنے کے لیے دوبارہ پہلے جمرے کے پاس جائے کیونکہ اس میں بھیڑ کی وجہ سے نہایت مشکل اور مشقت ہے۔ واللّٰه أعلم.

▲ بارہ ذوالحجہ کو تینوں جمرات کی رمی کر کے اگر کوئی جلد مکہ لوٹنا چاہے تو غروب آفتاب سے پہلے پہلے نکل جائے اور اگر کوئی تاخیر کرنا چاہے تو تیرہ ذوالحجہ کی رات وہاں گزارے اور زوال آفتاب کے بعد تینوں جمروں کو کنکریاں مار کر منی سے مکہ مکرمہ واپس آجائے اور یہ افضل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى﴾

''پھر جس نے دو دنوں میں (منی سے مکے کی طرف واپسی میں) جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو (ایک دن کے لیے) پیچھے رہ جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ پرہیز گاری اختیار کرے۔''[1]

اگر 12 ذوالحجہ کو منی سے نکلنے سے پہلے سورج غروب ہو گیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ تیرہ ذوالحجہ کی رات بھی وہیں گزارے اور اگلے روز زوال کے بعد رمی کر کے واپس لوٹے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ﴿يَوْمَيْنِ﴾ کہا ہے تو یوم دن کو کہتے ہیں۔ اگر رات ہو جائے تو وہ ﴿يَوْمَيْنِ﴾ دو دن میں جلدی کرنے والا تو نہ ہوا۔

▲ اگر کسی عورت کو حالتِ احرام اختیار کرنے سے قبل حیض یا نفاس کا خون آ گیا، پھر اس نے احرام کی حالت اختیار کر لی یا اس نے طہر کی حالت میں احرام باندھا پھر اسے حیض یا نفاس آ گیا تو وہ حالت احرام ہی میں رہے اور وہی کچھ کرے جو دوسرے حجاج کرام کریں گے، یعنی عرفہ میں وقوف، مزدلفہ میں شب بسری، جمرات کی رمی اور منیٰ میں قیام وغیرہ، البتہ وہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی تب تک نہ کرے جب تک حیض و نفاس سے پاک نہ ہو جائے۔

▲ اگر اس نے طہر کی حالت میں طواف کر لیا، پھر اسے حیض آ گیا تو وہ صفا و مروہ کی سعی کرے۔ سعی کے لیے حیض یا نفاس مانع نہیں ہے کیونکہ سعی کے لیے طہارت کی شرط نہیں۔

▲ جب حاجی مکہ مکرمہ میں تمام امور مکمل کر لے حتی کہ اپنے شہر یا وطن کی طرف پلٹنے کی مکمل تیاری کر لے تو اس وقت تک مکہ سے نہ نکلے جب تک بیت اللہ کا (سات چکر لگا کر) طواف نہ کر لے۔ مکہ مکرمہ میں حاجی اپنے آخری لمحات بھی بیت اللہ کے پاس بصورت طواف گزارے، یہ طواف ''طواف وداع'' ہے۔ حائضہ عورت پر طواف وداع نہیں، وہ طواف وداع کیے بغیر ہی مکہ مکرمہ سے روانہ ہو جائے جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] البقرة 2:203.

«أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَّكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ إِلَّا أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ»

''اپنے وطن لوٹنے سے پہلے مکہ مکرمہ میں آخری وقت بیت اللہ کے پاس (بصورت طواف) گزارنا چاہیے، البتہ آپ ﷺ نے حائضہ کو طواف وداع میں رخصت دی ہے۔''[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَخَّصَ لِلْحَائِضِ أَنْ تَصْدُرَ قَبْلَ أَنْ تَطُوفَ، إِذَا كَانَتْ قَدْ طَافَتْ فِي الْإِفَاضَةِ»

''آپ ﷺ نے حائضہ عورت کو مکہ سے نکلنے سے پہلے طواف وداع کرنے میں رخصت دی بشرطیکہ وہ طواف افاضہ کر چکی ہو۔''[2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، انھوں نے کہا:

«حَاضَتْ صَفِيَّةُ بِنْتُ حُيَيٍّ بَعْدَ مَا أَفَاضَتْ، قَالَتْ عَائِشَةُ: فَذَكَرْتُ حَيْضَتَهَا لِرَسُولِ اللهِ ﷺ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أَحَابِسَتُنَا هِيَ؟ قَالَتْ: فَقُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّهَا قَدْ كَانَتْ أَفَاضَتْ وَطَافَتْ بِالْبَيْتِ، ثُمَّ حَاضَتْ بَعْدَ الْإِفَاضَةِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: فَلْتَنْفِرْ»

''سیدہ صفیہ بنت حُیی رضی اللہ عنہا طواف افاضہ کے بعد حائضہ ہو گئیں۔ میں (عائشہ رضی اللہ عنہا) نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تو ہمیں روکے رکھے گی۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس نے جب طواف افاضہ کر لیا تھا تب اس کا حیض شروع ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تو وہ چلے اور مکہ سے نکلے۔''[3]

قربانی کے احکام

قربانی کی مشروعیت پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''خالق کے لیے قربانی اس

① صحیح البخاري، الحج، باب طواف الوداع، حدیث: 1755، وصحیح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، حدیث: 1328. ② مسند أحمد: 370/1. ③ صحیح البخاري، الحج، باب الإدلاج ◄◄

جان کے فدیے کے قائم مقام ہے جو گناہوں کی وجہ سے تباہی کی مستحق ہوگئی تھی۔'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ﴾

''اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کے طریقے مقرر فرمائے ہیں تاکہ وہ ان چوپائے جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انھیں دے رکھے ہیں۔''[1]

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جانور ذبح کرنا اور خون بہانا تمام شریعتوں میں مشروع عمل رہا ہے۔

قربانی کے جانوروں کی دو قسمیں ہیں:

ہدی: جو جانور، جیسے: اونٹ، گائے وغیرہ حرم کی طرف لایا جائے اور وہیں ذبح کیا جائے اسے ہدی کہتے ہیں۔ اس کا نام ہدی اس لیے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کیا جاتا ہے۔

اُضحیہ: اس جانور کو کہتے ہیں جو اللہ کے تقرب کے لیے عید کے روز اور ایام تشریق میں ذبح کیا جائے۔

- سب سے افضل قربانی اونٹ کی قربانی ہے، پھر گائے کی بشرطیکہ اکیلے شخص کی طرف سے ہو کیونکہ یہ جانور قیمت کے لحاظ سے مہنگے ہوتے ہیں، نیز ان میں فقراء و مساکین کا فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اونٹ، گائے کے بعد بکرے، مینڈھے یا دنبے کا درجہ ہے۔

- پھر ہر جنس میں سے جو جانور خوب موٹا تازہ ہو اور زیادہ قیمتی ہو وہ افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ۝﴾

''اور جو شخص اللہ کی (عظمت کی) نشانیوں کی تعظیم کرے تو بلاشبہ یہ دلوں کی پرہیزگاری کی وجہ سے ہے۔''[2]

- دنبہ یا مینڈھا جذع، یعنی چھ ماہ کا ہو جائے تو اس کی قربانی جائز ہے (جمہور کے نزدیک ''جذع'' ایک سال کے دنبے یا مینڈھے کو کہتے ہیں)، البتہ اونٹ، گائے، بکری کا دو دانتا ہونا ضروری ہے۔ واضح رہے اونٹ چھٹے سال میں، گائے تیسرے سال میں اور بکری، بھیڑ، دنبہ دوسرے سال میں داخل ہو جائے تو عموماً دو دانتا ہو جاتا ہے۔

- حج میں بطور ہدی بکرا یا مینڈھا صرف ایک شخص کی طرف سے قربانی کیا جا سکتا ہے جبکہ عید الاضحیٰ میں ایک شخص اور اس کے اہل و عیال کی طرف سے کافی ہوتا ہے، البتہ اونٹ اور گائے کی قربانی میں سات افراد شریک ہو سکتے ہیں، چنانچہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

◄ من المحصب، حديث: 1771، وصحيح مسلم، الحج، باب وجوب طواف الوداع وسقوطه عن الحائض، حديث: (382)- 1211 واللفظ له. [1] الحج 34:22. [2] الحج 32:22.

«أَمَرَنَا أَنْ نَّشْتَرِكَ فِي الْإِبِلِ وَالْبَقَرِ : كُلُّ سَبْعَةٍ مِّنَّا فِي بَدَنَةٍ»

''(رسول اللہ ﷺ نے) ہمیں حکم دیا کہ ہم اونٹ اور گائے کی قربانی میں سات سات افراد شریک ہو جائیں۔''[1]

سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک شخص اپنے اور اپنے اہل وعیال کی طرف سے ایک بکری ذبح کرتا جو سارے گھر والے کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے تھے۔[2]

واضح رہے اونٹ یا گائے میں ساتویں حصے کی نسبت ایک بکری یا بکرے کی قربانی افضل ہے۔

▲ قربانی کے جانور کا صحیح وسلامت اور تندرست ہونا ضروری ہے، یعنی وہ کمزور، کانا، اندھا، بیمار، لنگڑا اور زیادہ بوڑھا نہ ہو۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَرْبَعٌ لَّا تَجُوزُ فِي الْأَضَاحِي : اَلْعَوْرَاءُ بَيِّنٌ عَوَرُهَا وَالْمَرِيضَةُ بَيِّنٌ مَرَضُهَا وَالْعَرْجَاءُ بَيِّنٌ ظَلْعُهَا وَالْكَسِيرُ الَّتِي لَا تُنْقِي»

''چار قسم کے جانور کی قربانی جائز نہیں: جو نمایاں طور پر کانا، مریض، لنگڑا اور ٹانگ ٹوٹا ہوا بغیر گودے والا ہو۔''[3]

▲ جانور کی قربانی کرنے کا وقت نماز عید ادا کرنے کے بعد سے لے کر تیرہ ذوالحجہ کو غروب آفتاب تک ہے اور یہی قول صحیح ہے۔

▲ حج تمتع یا حج قران کی قربانی ہو یا عیدالاضحیٰ کا موقع، اس میں مستحب یہ ہے کہ اس گوشت کے تین حصے کیے جائیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا﴾ ''پس تم آپ بھی کھاؤ اور (بھوکے فقیروں کو بھی) کھلاؤ۔''[4]

البتہ حج کے موقع پر کسی واجب کے ترک یا کسی ممنوع کام کے کرنے پر کفارے کی قربانی کے گوشت سے خود کچھ نہ کھائے۔

▲ جو شخص قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے سے لے کر جانور ذبح کرنے تک اپنے جسم کے

① صحيح مسلم، الحج، باب بيان وجوه الإحرام ......، حديث: 1213، ومسند أحمد : 293,292/3. ② جامع الترمذي، الأضاحي، باب ما جاء إن الشاة الواحدة تجزئ عن أهل البيت، حديث : 1505، وسنن ابن ماجه، الأضاحي، باب من ضحى بشاةٍ عن أهله، حديث : 3147. ③ سنن أبي داود، الضحايا، باب ما يكره من الضحايا، حديث :2802، وسنن النسائي، الضحايا، باب ما نُهِي عنه من الأضاحي، حديث :4374.

④ الحج28:22، آیت سے قربانی کے گوشت کے تین حصے بنانے کا استدلال محل نظر ہے۔ (صارم)

بال اور ناخن نہ کاٹے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ كَانَ لَهُ ذِبْحٌ يَذْبَحُهُ، فَإِذَا أُهِلَّ هِلَالُ ذِي الْحَجَّةِ، فَلَا تَأْخُذَنَّ مِنْ شَعْرِهِ وَلَا مِنْ أَظْفَارِهِ شَيْئًا حَتَّى يُضَحِّيَ»

''جس کے پاس قربانی کا جانور ہو، جسے وہ ذبح کرنا چاہتا ہو، جب ذوالحجہ کا چاند نظر آجائے تو وہ اپنے بال اور ناخن قربانی دینے تک نہ کٹوائے۔''[1]

اگر کسی نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے کچھ بال یا ناخن کاٹ لیے تو وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اس پر کوئی فدیہ نہیں۔

[1] صحيح مسلم، الأضاحي، باب نهي من دخل عليه عشر ذي الحجة...... ، حديث:(42)-1977.

عقیقہ کے مسائل

عقیقہ کرنا حقوق اولاد میں سے والد کے ذمے ایک حق ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے تقرب کی خاطر ایک جانور (بکرا یا چھترا) ذبح کرنا ہوتا ہے۔

عقیقہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما دونوں کا عقیقہ کیا تھا جیسا کہ سنن ابوداود میں ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا كَبْشًا كَبْشًا ـ وفي سنن النسائي ـ كَبْشَيْنِ كَبْشَيْنِ»

''رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کا عقیقہ ایک ایک مینڈھا ذبح کر کے کیا۔''[1] سنن نسائی میں ہے ''آپ نے دو دو مینڈھے ذبح کیے۔''[2]

آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین رحمہم اللہ اپنی اولاد (کی طرف سے) کے عقیقے کرتے آئے ہیں۔

▲ بعض اہل علم عقیقے کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کی دلیل سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ غُلَامٍ مُّرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهِ» ''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے ساتھ گروی ہے۔''[3]

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ وہ بچہ اپنے والدین کے حق میں سفارش کرنے کا اہل نہ ہوگا جب تک اس کا عقیقہ نہیں کیا جاتا۔''[4]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بچے کا عقیقہ اس کے حسن اخلاق اور اعلیٰ عادات کا سبب ہے۔''

▲ صحیح اور درست بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ عقیقہ سنت مؤکدہ ہے۔ عقیقے میں جانور ذبح کرنا اس کی قیمت کے

[1] سنن أبي داود، الضحايا، باب في العقيقة، حديث: 2841. [2] سنن النسائي، العقيقة، باب كم يعق عن الجارية، حديث: 4224. اور یہی راجح ہے، دیگر صحیح احادیث کے بھی موافق ہے۔ دیکھیے إرواء الغليل: 379/4. (ع۔و) [3] سنن ابن ماجه، الذبائح، باب العقيقة، حديث: 3165. [4] زاد المعاد: 326/2.

صدقہ کرنے سے افضل ہے کیونکہ جانور ذبح کرنے میں اللہ تعالیٰ کے تقرب کا حصول ہے، فقراء پر صدقہ ہے اور نومولود بچے کا فدیہ ہے۔

- لڑکے کے عقیقے میں دو بکریاں ذبح کی جائیں جو عمر و شکل میں دونوں ایک جیسی ہوں، لڑکی کے عقیقے میں ایک بکری ذبح کی جائے۔ سیدہ ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا:

«عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ»

''لڑکے کی طرف سے عقیقے میں دو بکریاں ذبح کی جائیں جو دونوں ایک جیسی ہوں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔''[1]

- لڑکے اور لڑکی کے عقیقے کی مقدار میں جو فرق ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ بہت سے احکام شرعیہ میں لڑکی لڑکے سے نصف درجہ اور حیثیت رکھتی ہے، نیز لڑکا والد کے لیے ایک کامل نعمت ہے اور اس سے والد کو خوشی و مسرت زیادہ حاصل ہوتی ہے، اسی لیے اس کا شکر بھی زیادہ سے زیادہ ادا کرنا چاہیے۔
- عقیقے کے لیے افضل اور مسنون وقت بچے کی ولادت کا ساتواں دن ہے، البتہ اگر ساتویں دن سے پہلے یا بعد میں بھی عقیقہ ہوا تو بھی جائز ہے۔
- ساتویں روز ہی بچے کا نام رکھنا افضل ہے، چنانچہ سنن وغیرہ میں روایت ہے:

«يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ وَيُسَمّٰى» ''ساتویں روز بچے کا عقیقہ کیا جائے اور اس کا نام رکھا جائے۔''[2]

اگر بچے کی ولادت کے دن ہی اس کا نام رکھ دیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بلکہ بعض حضرات کے نزدیک ایسا کرنا بہتر ہے۔

- نام اچھا رکھنا چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«إِنَّكُمْ تُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَسْمَاءِكُمْ وَأَسْمَاءِ آبَاءِكُمْ فَأَحْسِنُوا أَسْمَاءَكُمْ»

''تم (قیامت کے روز) اپنے اور اپنے باپ کے نام کے ساتھ پکارے اور بلائے جاؤ گے، لہٰذا اپنے نام اچھے رکھو۔''[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچھا نام پسند کرتے تھے اور جس نام میں غیر اللہ کی عبدیت ہوتی اسے حرام قرار دیتے تھے، مثلاً:

---

① سنن أبي داود، الضحايا، باب في العقيقة، حديث: 2836، وجامع الترمذي، الأضاحي، باب الأذان في أذن المولود، حديث: 1516، وسنن ابن ماجه، الذبائح، باب العقيقة، حديث: 3162 واللفظ له. ② جامع الترمذي، الأضاحي، باب من العقيقة، حديث: 1522. ③ ضعيف سنن أبي داود، الأدب، باب في تغيير الأسماء، حديث: 4948، وسلسلة الأحاديث الضعيفة، حديث: 5460.

عبدالکعبہ، عبدالنبی، عبدالمسیح، عبدعلی اور عبدالحسین وغیرہ۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہر وہ نام رکھنا حرام ہے جس میں غیر اللہ کی طرف عبدیت کی نسبت ہو، مثلاً: عبدعمر، عبدالکعبہ وغیرہ۔ اسی طرح غیر مناسب نام رکھنا بھی مکروہ ہے، مثلاً: عاصی، کلیب، حنظلہ، مرہ (کڑوا) حزن (غم، سخت۔) اسی طرح اپنی اولاد کے وہ نام رکھنے جو برے اشخاص یا بری جگہوں کے ہوں مکروہ ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ أَحَبَّ أَسْمَائِكُمْ إِلَى اللهِ عَبْدُاللهِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ»

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمھارے ناموں میں سے پسندیدہ نام ''عبداللہ'' اور ''عبدالرحمٰن'' ہیں۔''[1]

الغرض ہر مسلمان کے لائق ہے کہ وہ اپنے نومولود کا اچھا سا نام رکھے اور حرام و مکروہ قسم کے نام سے اجتناب کرے کیونکہ یہ والد کے ذمے اولاد کا حق ہے۔[2]

✍ عقیقہ میں وہی جانور کفایت کرتا ہے جو قربانی میں کفایت کرتا ہے، یعنی مناسب عمر ہو (دو دانتا ہونا ضروری نہیں) اچھی خوبیوں سے آراستہ ہو، عیب و مرض سے محفوظ ہو، جسمانی حالت خوب اور کامل ہو اور موٹا تازہ ہو۔ اس کا گوشت خود کھانا، کسی کو ہدیہ دینا اور صدقہ کے طور پر دینا مستحب ہے۔ بہتر یہ ہے کہ قربانی کے جانور کی طرح اس کے گوشت کے تین حصے کیے جائیں۔[3]

✍ عقیقے کے بعض احکام عیدالاضحیٰ کی قربانی سے مختلف ہیں۔ عقیقے کی قربانی میں شراکت جائز نہیں، لہٰذا اونٹ یا گائے عقیقے میں کامل طور پر قربان کی جائے کیونکہ عقیقہ جان کا فدیہ ہے جس میں شراکت درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا۔[4]

✍ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی طرح تربیت کرنے اور انھیں محاسن و اخلاق سے آراستہ کرنے میں

---

① صحيح مسلم، الأدب، باب النهي عن التكني بأبي القاسم ......، حديث: 2132.

② بچوں کے نام رکھنے سے متعلق مکمل راہنمائی کے لیے کتاب ''پیارے نام'' کا مطالعہ فرمائیں۔ نیز ''اسلامی ناموں کی ڈکشنری'' طبع دارالسلام کا مطالعہ فرمائیں۔ (ادارہ)

③ مؤلف حفظہ اللہ نے اس سے متعلق کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ (صارم)

④ عقیقے میں اونٹ گائے کا ذبح کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ حدیث شریف میں صرف شاۃ کا ذکر ہے جس کا اطلاق بکری، بکرے مینڈھے یا دنبے وغیرہ پر ہوتا ہے۔ (صارم)

دلچسپی لیں کیونکہ بچپن میں ایسی تربیت زیادہ کارگر اور مؤثر ہوتی ہے ورنہ بڑی عمر میں اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ بہت سے بچوں کے اخلاق و کردار کے بگاڑ کا سبب بچپن میں اس کی صحیح تربیت نہ کرنا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

وَيَنْشَأُ نَاشِئُ الْفِتْيَانِ مِنَّا عَلٰى مَا كَانَ عَوَّدَهُ أَبُوهُ

نوجوان اسی طریقے پر پروان چڑھتے ہیں جس طرح ان کے والد نے ان کی تربیت کی ہو۔

اولاد کو غلط لہو ولعب سے اور برے دوستوں کی مجالس سے دور رکھنا نہایت ضروری ہے۔ والدین اپنی اولاد کو گھر میں اچھا ماحول مہیا کریں کیونکہ بچے کے لیے گھر اس کا پہلا مدرسہ ہوتا ہے جس میں اس کے والدین اور دیگر اہل خانہ رہتے ہیں۔ بچوں میں شر اور خرابی پیدا کرنے والے اسباب کو گھروں سے دور ہی رکھنا چاہیے (مثلاً: مخرب اخلاق رسالے اور ڈائجسٹ، فلمی گانوں اور فحش لطیفوں والی کیسٹیں، ٹی وی، وی سی آر، ڈش، کیبل وغیرہ سے جن میں فحش، لچر اور لادینی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔)

علاوہ ازیں بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ان کا دل و دماغ عبادات، اطاعت، احترام دین اور قرآن و حدیث کی تعلیم کی طرف مائل ہو جائے کیونکہ یہ چیزیں دنیا و آخرت کی سعادت کا باعث ہیں۔

الغرض ایک والد اور سرپرست پر لازم ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے ان کے اخلاق و معاملات اور عادات کے سنوارنے میں خود اچھا نمونہ بنے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے اعمال کی توفیق دے جو اسے محبوب اور پسند ہوں۔ آمین

باب 6

جہاد کے احکام ومسائل

جہاد کے مسائل

اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے کو مشروع قرار دیا ہے تاکہ اس کا کلمہ بلند ہو، اس کے دین کی مدد ہو، اس کے دشمن مغلوب اور دوست غالب ہوں، نیز جہاد کی مشروعیت میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کا امتحان اور ان کی آزمائش بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝﴾

”(حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا لیکن (اس نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ وہ جلد ان کی رہنمائی کرے گا اور ان کے حال کی اصلاح کرے گا۔ اور وہ انھیں (اس) جنت میں داخل کرے گا جس کی ان کو خوب پہچان کروا چکا ہے۔“[1]

دین اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ جہاد اسلام کی چوٹی اور اس کی کوہان ہے اور وہ دین اسلام میں سب سے افضل اور اعلیٰ عبادت ہے حتی کہ بعض علماء نے تو اسے دین اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی مشروعیت کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ ”تم پر جہاد (وقتال) فرض کر دیا گیا۔“[2]

رسول اللہ ﷺ نے خود جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لیا اور اس کا حکم دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

«مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ»

”جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے نہ جہاد کیا اور نہ اس کے دل میں جہاد کرنے کا خیال آیا تو وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرا ہے۔“[3]

✍ جہاد کے لغوی معنی ”جدوجہد کرنا“ ہے۔ دین اسلام کی اصطلاح میں اس کے معنی ”ایسی کوشش و محنت جس سے اللہ تعالیٰ کا کلمہ و دین بلند ہو“ حتی کہ اس کے دشمنوں، یعنی کفار سے اس وقت تک خوب قتال ہو کہ ان کا فتنہ و زور ختم

[1] محمد 47:4-6. [2] البقرة 2:216. [3] صحيح مسلم، الإمارة، باب ذم من مات ولم يغز ولم يحدث نفسه بالغزو، حديث: 1910.

ہو جائے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جنس جہاد فرض عین ہے۔ وہ دل سے ہو یا زبان سے، مال سے ہو یا ہاتھ سے، لہٰذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ جہاد کی ان صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت کو اختیار کرے اور اسے عمل میں لائے۔''[1]

▲ جہاد کا اطلاق نفس، شیطان، کفار اور فاسقوں کے ساتھ مقابلہ کرنے پر بھی ہوتا ہے، چنانچہ نفس کے خلاف جہاد کا مطلب امور دین کو سیکھنا، پھر ان پر عمل کرنا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دینا ہے۔ شیطان کے خلاف جہاد کا مطلب، شیطان کے پیدا کردہ وسواس اور شبہات کا ازالہ کرنا اور اس کی طرف سے مزین کردہ شہوات اور خواہشات سے خود کو بچانا ہے۔ کفار کے خلاف جہاد یہ ہے کہ ان کے خلاف ہاتھ، زبان اور مال کو استعمال میں لایا جائے اور دل سے نفرت کی جائے، البتہ فاسقوں کے خلاف جہاد ہاتھ سے ہوگا، یا زبان سے یا پھر دل میں ان کے فسق کے خلاف نفرت ہو، الغرض جس قدر طاقت ہو اسی قدر ان کے خلاف کوشش کی جائے۔

▲ جہاد فرض کفایہ ہے۔ اگر جہاد کرنے والے اس قدر لوگ کھڑے ہو جائیں جو اس کا حق ادا کر دیں تو دوسرے لوگوں پر فرض نہ رہے گا بلکہ ان کے حق میں سنت کا درجہ ہوگا۔

▲ جہاد فی سبیل اللہ سب سے افضل تطوع ہے، اس کی بہت بڑی فضیلت ہے، کتاب و سنت میں جہاد کے حکم اور اس کی ترغیب کے بارے میں بہت سی نصوص وارد ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ اللہ کے ذمے سچا وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ لہٰذا تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ سے کیا اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''[2]

▲ اس مقام پر ہم ان چند حالات کا ذکر کریں گے جن میں جہاد کرنا فرض عین ہے:

① جب انسان لڑائی کو حاضر ہو جائے تو اس صورت میں دشمن اسلام سے لڑنا فرض عین ہے، لہٰذا اس موقع پر قتال

① زاد المعاد: 3/72. ② التوبة 9:111.

فی سبیل اللہ سے پھرنا جائز نہیں۔

② جب دشمن کی فوج اس کے شہر کا محاصرہ کر لے۔

ان دونوں صورتوں میں یہ دفاعی جہاد ہوگا، اقدامی نہیں۔ اگر مسلمان اس وقت جہاد سے کنارہ کش ہو جائیں گے تو کافر مسلمانوں پر غالب آ جائیں گے اور ان کی عزتوں اور مقدس مقامات پر قابض ہو جائیں گے۔

③ جب مسلمانوں کو قتال اور دفاع میں اس کی ضرورت ہو۔

④ جب مسلمانوں کا امام یا خلیفہ اعلان جہاد کر کے ان سے نکلنے کا مطالبہ کرے تو اس وقت جہاد فرض عین ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوا» ”جب تم سے نکلنے کا مطالبہ کیا جائے تو (جہاد کے لیے) نکل پڑو۔“[1]

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا﴾ ”اے ایمان والو! جب تم کسی مخالف فوج سے بھڑ جاؤ تو ثابت قدم رہو۔“[2]

نیز ارشاد باری ہے:

﴿مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ﴾

”اے ایمان والو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں نکلو تو تم زمین سے لگے جاتے ہو۔“[3]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جہاد ہاتھ کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں دعوت الی اللہ اور حجت قائم کرنے کے ساتھ دفاعی پالیسیاں ترتیب دینے اور دفاعی صنعتوں کے قیام کے ذریعے سے بھی جہاد ہوتا ہے، لہٰذا ہر ممکن حد تک ان امور میں حصہ لینا واجب ہے۔ اور جو لوگ میدان جہاد میں جانے سے معذور ہوں وہ میدان جہاد میں جانے والے مجاہدین کے گھروں اور ان کے اہل و عیال کی نگہداشت کریں۔“[4]

◣ مسلمانوں کے خلیفہ و امام کا فرض ہے کہ جب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کوئی لشکر روانہ کرے تو پورے لشکر کا از سر نو جائزہ لے اور اچھی طرح اس کا معائنہ کرے جو مرد یا جانور لڑائی کے قابل نہ ہوں انھیں روک لے یا جو شخص جہاد کے عمل میں کسی رکاوٹ کا باعث بن سکتا ہو اسے بھی روک دے۔ اسی طرح جو لوگ غلط افواہیں پھیلا کر جہاد کرنے والوں کی ہمت و جذبہ کمزور کرتے ہیں انھیں بھی لشکر میں شامل نہ کیا جائے۔ دشمن کے لیے جاسوسی کرنے

① صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب فضل الجهاد و السير، حديث: 2783. ② الأنفال 8:45. ③ التوبة 9:38.
④ الفتاوى الكبرى لابن تيمية، الاختيارات العلمية: 5/538.

والوں اور مجاہدین میں فتنہ کھڑا کرنے والوں کو لشکر میں شامل نہ ہونے دے۔ خلیفۃ المسلمین کو چاہیے کہ وہ اسلامی لشکر کا ایک ایسا امیر مقرر کرے جو ان کے جملہ امور شرعی طریقے کے مطابق چلائے اور امور جنگ میں ماہر ہو۔

● لشکر میں شریک مجاہدین اپنے امیر کی ہر معروف میں اطاعت کریں، اس کے ساتھ خیر خواہی کریں اور اس کے ساتھ صبر و استقامت سے وابستہ رہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾

”اے ایمان والو! تم فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اختیار والے ہیں۔“[1]

واضح رہے جہاد ایک بلند نصب العین اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے مشروع کیا گیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

① جہاد کو اس لیے مشروع قرار دیا گیا تاکہ اللہ کے بندوں کو طاغوتوں اور بتوں کی عبادت سے نجات دلا کر اس اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی عبادت میں لگایا جائے جس نے انھیں پیدا کیا اور وہی انھیں رزق دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾

”اور تم ان (کفار) سے اس حد تک لڑو کہ فتنہ (شرک) نہ رہے اور دین سارا اللہ ہی کا ہو جائے۔“[2]

② جہاد کا ایک مقصد ظلم کا خاتمہ اور اہل حقوق تک ان کے حقوق کا پہنچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾

”جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے۔ وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے۔“[3]

③ جہاد کی ایک غرض کفار کو مطیع اور پست کرنا، ان سے ظلم کا انتقام لینا اور ان کی طاقت وقوت کو کمزور کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾

① النسآء 4:59. ② الأنفال 8:39. ③ الحج 22:39، 40.

''ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں عذاب میں ڈالے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور تمھیں ان پر فتح دے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا۔ اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

④ کفار کو اولاً دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے اگر وہ قبول نہ کریں تو ان کے خلاف جنگ اور قتال ہوگا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ قتال سے پہلے کفار کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ بادشاہوں سے خط کتابت اسی مقصد کے لیے تھی۔[2] آپ ﷺ جب کسی اسلامی لشکر کو روانہ کرتے تو انھیں نصیحت کرتے کہ ''کفار سے لڑائی شروع کرنے سے پہلے انھیں اسلام کی طرف دعوت دینا، اگر وہ قبول کرلیں تو ٹھیک ورنہ ان سے جنگ کرنا۔''[3] اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام میں جنگ کرنے کا مقصد کفر وشرک کا خاتمہ اور اللہ تعالیٰ کے دین میں لوگوں کو داخل کرنا ہے۔ اگر یہ مقصد لڑائی کے بغیر ہی حاصل ہو جائے تو لڑائی کی ضرورت ہی نہیں۔

جہاد کے مفصل مسائل واحکام حدیث وفقہ کی بڑی بڑی کتابوں میں موجود ہیں۔

- جب کسی شخص کے والدین دونوں یا ان میں سے ایک مسلمان اور آزاد ہو تو نفل جہاد میں ان کی اجازت کے بغیر شریک نہ ہو جیسا کہ حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا:

«أَحَيٌّ وَّالِدَاكَ؟ قَالَ: نَعَمْ! قَالَ: فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ»

''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے کہا: ہاں! تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا: ''پھر تو والدین کی خدمت کی صورت میں جہاد کر۔''[4]

اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین سے حسن سلوک فرض عین ہے جبکہ جہاد فرض کفایہ ہے اور ظاہر ہے کہ فرض عین فرض کفایہ سے مقدم ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے امام کو چاہیے کہ وہ لشکر روانہ کرتے وقت اس کا جائزہ لے اور جو فوجی یا جانور (گھوڑے وغیرہ) لڑائی کے قابل نہ ہوں، ان کو علیحدہ کردے، جیسے کمزور فوجی یا گھوڑے وغیرہ جو پیچھے رہ جاتے ہوں یا افواہیں پھیلانے والے لوگ، یہ چیزیں فوج کو لڑنے سے بے رغبت کرتی ہیں اور ان کے حوصلے پست کرتی ہیں۔

① التوبة 9:14،15. ② صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب دعاء النبيﷺ إلى الإسلام والنبوة ......، حديث: 2941. ③ صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب دعاء النبيﷺ إلى الإسلام و النبوة ......، حديث: 2942. ④ صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب الجهاد بإذن الأبوين، حديث: 3004.

اسی طرح اس قسم کے لوگ فوجیوں میں خوف و ہراس پھیلاتے ہیں اور ادھر ادھر کی خبریں اڑاتے ہیں جس سے فوج میں بددلی پھیلتی ہے۔

- امیر المومنین کو چاہیے کہ وہ اسلامی لشکر کے مختلف افسر مقرر کرے اور مال غنیمت کا کچھ حصہ جہاد میں امتیازی خدمات انجام دینے والوں کو انعام کے طور پر دے اور باقی مال اور سامان لشکر میں شامل تمام مجاہدین میں تقسیم کر دے۔

- اسلامی لشکر نیکی کے کاموں میں اپنے امیر کی اطاعت کرے اس کی خیر خواہی کرے اور اس کے ساتھ استقامت کا مظاہرہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾

''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہیں۔''[1]

- اسلامی لشکر کی ذمے داری ہے کہ وہ کسی ایسے بچے، عورت، راہب، انتہائی بوڑھے، دائمی مریض اور اندھے شخص کو قتل نہ کریں جو جنگ کے معاملات میں رائے اور مشورہ نہیں دے سکتے، البتہ انھیں قیدی بنا کر غلام اور لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ عورتوں اور بچوں کو جب قیدی بناتے تو انھیں لونڈیاں اور غلام بنا لیتے تھے۔

- مال غنیمت وہ مال ہے جو جنگ میں غلبے کے نتیجے میں حربی کافر سے حاصل ہوتا ہے یا ان سے بطور فدیہ وصول کیا جاتا ہے۔ اس مال پر اس شخص کا حق ہے جو اسلامی لشکر میں قتال کی نیت سے شامل ہوا اور میدان جنگ میں گیا۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس نے لڑائی لڑی یا نہ لڑی کیونکہ میدان جنگ میں اس کی موجودگی مجاہدین کی مدد کے لیے ہے اور وہ جنگ کے لیے تیار بھی ہے، اس لیے اسے لڑنے والوں میں شامل سمجھا جائے گا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ''مال غنیمت کا حق دار ہر وہ شخص ہے جو میدان جنگ میں حاضر ہوا۔''

- مال غنیمت کی تقسیم کا طریقہ کار یہ ہے کہ امیر لشکر اس مال میں سے پانچواں حصہ الگ کرے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ، اقربائے رسول، یتیموں، فقراء، مساکین اور مسافروں کا ہوگا، باقی چار حصے لڑنے والے مجاہدین میں تقسیم ہوں گے۔ پیدل مجاہدین کا ایک حصہ اور گھڑ سوار مجاہدین کے تین حصے ہوں گے۔ ان میں سے ایک حصہ مجاہد کا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے۔ ہر مجاہد کو برابر برابر حصہ ملے گا۔

[1] النسآء 4:59.

''رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن اسی طرح مال غنیمت تقسیم کیا تھا۔''①

▲ امیر لشکر کی اجازت سے اس کا نائب بھی مال غنیمت تقسیم کر سکتا ہے۔

▲ کسی بھی شخص کے لیے مال غنیمت کی کوئی چیز چھپانا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾

''یہ ناممکن ہے کہ کوئی نبی خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو جو اس نے خیانت کی ہوگی اس کے ساتھ قیامت کے دن حاضر ہوگا۔''②

اگر کسی نے کوئی چیز چھپا لی اور بعد میں اس کا علم امیر لشکر کو ہو گیا تو وہ اس شخص کو اپنی صوابدید کے مطابق عبرت ناک سزا دے۔

▲ اگر غنیمت زمین کی شکل میں ہو تو امیر المومنین کو اختیار ہے کہ وہ مجاہدین میں تقسیم کرے یا تمام مسلمانوں کی مصلحت اور فائدے کے لیے انھیں وقف کر دے اور جس کی دسترس اور استعمال میں دے اس سے مستقل اور مقرر ٹیکس وصول کرے۔

▲ جب کفار اپنا مال مسلمانوں کے خوف اور ڈر سے (بغیر لڑے) چھوڑ کر بھاگ جائیں یا لاوارث شخص کا ترکہ ہو یا مال غنیمت کا پانچواں حصہ (جو اللہ اور رسول کا حصہ ہے) وہ مال فے کے حکم میں ہے۔ اسے مسلمانوں کے مصالح و فوائد اور رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کیا جائے گا۔

▲ امیر المومنین کو اختیار ہے کہ وہ کسی ضرورت اور مصلحت کے پیش نظر کفار سے ایک مقرر مدت تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لے بشرطیکہ اس میں مسلمانوں کا فائدہ اور بہتری ہو لیکن یہ تب ہے جب مسلمان کفار کے مقابلے میں کمزور ہوں۔ اگر مسلمان شوکت وقوت کے حامل ہوں، جہاد کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو ان سے صلح کرنا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر کفار سے معاہدۂ صلح کر لیا تھا، اسی طرح مدینہ منورہ میں ایک وقت تک یہود سے صلح کر لی تھی۔③

▲ اگر امیر المومنین کو کفار کی جانب سے معاہدۂ صلح توڑنے کا خطرہ محسوس ہو تو وہ کفار سے جنگ کرنے سے پہلے معاہدے کے خاتمے کا اعلان کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝﴾

① صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة خيبر، حديث: 4228، وصحيح مسلم، الجهاد، باب كيفية قسمة الغنيمة بين الحاضرين، حديث: 1762. ② آل عمران 3:161. ③ یہ مسئلہ محل نظر ہے۔

''اور اگر تجھے کسی قوم کی خیانت کا ڈر ہو تو برابری کی حالت میں ان کا عہد نامہ توڑ دے، اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔''[1]

امیر المومنین کے لیے جائز ہے کہ اہل کتاب اور مجوس وغیرہ کو ذمی بنانے کے لیے ان سے عہد و پیمان لے، یعنی وہ اسلامی ملک میں (اپنے دین پر) اس شرط کے ساتھ رہیں گے کہ وہ جزیہ ادا کریں گے اور اسلام کے احکام کا خیال رکھیں گے، انھیں پامال نہیں کریں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾

''ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دین حق کو قبول نہیں کرتے، وہ جو اہل کتاب میں سے ہیں، (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔''[2]

واضح رہے جزیہ وہ مال ہے جو کفار سے انھیں قتل نہ کرنے اور مسلمانوں کے ملک میں رہنے کی اجازت کے عوض ہر سال تذلیلاً وصول کیا جاتا ہے۔

بچے، عورت، پاگل، دائمی مریض، اندھے، انتہائی بوڑھے، عاجز اور فقیر و مسکین سے جزیہ وصول نہ کیا جائے۔

معاہدے کے بعد جب ذمی جزیہ ادا کریں تو اسے قبول کرنا ضروری ہے اور ان سے لڑائی کرنا حرام ہے۔ اگر انھیں کوئی تکلیف و ایذا دے تو ان کا دفاع کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾

''یہاں تک کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔''[3]

یعنی اگر کفار ذمی جزیہ ادا کر دیں تو ان سے جنگ و قتال نہ کیا جائے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ فَإِنْ هُمْ أَجَابُوكَ ، فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ»

''کفار ذمیوں سے جزیہ طلب کرو، اگر وہ ادا کر دیں تو ان سے قبول کر لو اور ان سے قتال نہ کرو۔''[4]

کوئی مسلمان کسی کافر کو اپنے ہاں پناہ دے سکتا ہے بشرطیکہ اس میں مسلمانوں کا نقصان نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ﴾

① الأنفال 8:58. ② التوبة 9:29. ③ التوبة 9:29. ④ صحيح مسلم، الجهاد، باب تأمير الإمام الأمراء على البعوث...... حديث: 1731، ومسند أحمد: 5/358.

''اگر مشرکوں میں سے کوئی آپ سے پناہ طلب کرے تو آپ اسے پناہ دے دیں یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے، پھر اسے اپنی جائے امن تک پہنچا دیں۔''[1]

مسلمانوں کا امیر بھی تمام مشرکوں کو یا بعض کو امان دے سکتا ہے کیونکہ اس کے اختیارات وسیع ہیں جو (اس کی اجازت کے بغیر رعایا میں سے) کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ علاقائی اور صوبائی امیر کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ اپنے علاقے میں رہنے والے کفار کو سیاسی امان دے۔

اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد اور توفیق سے پہلی جلد مکمل ہوئی۔ اب اس کے فضل و کرم سے دوسری جلد شروع ہوگی جس کا آغاز ''بیع کے مسائل'' سے ہوگا۔ إن شاء اللّٰه تعالی.

[1] التوبة 6:9.